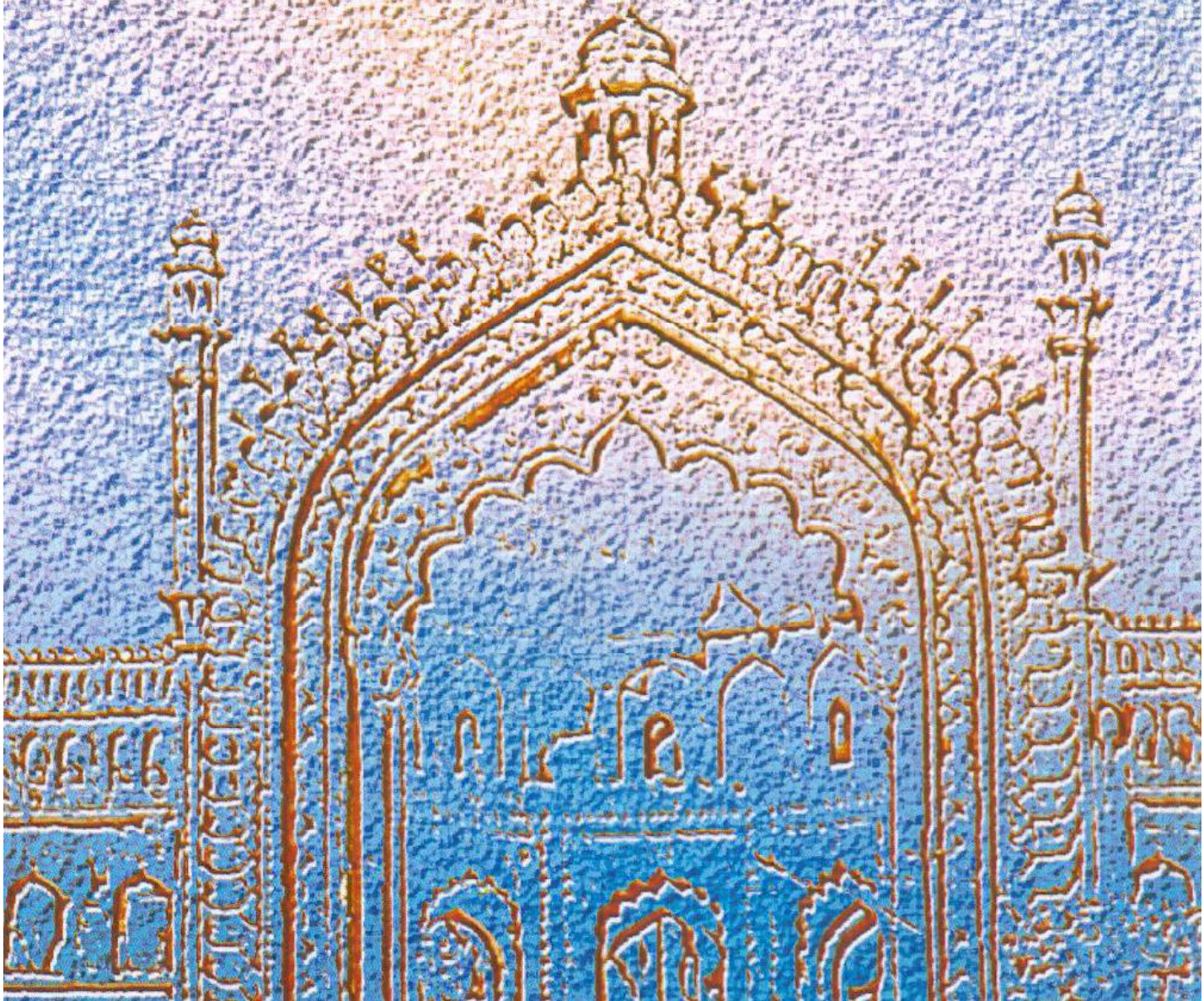
اودھ کے فارسی گو شعراء

(۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء تا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)

ڈاکٹر زہرہ فاروقی



اودھ کے فارسی گو شعراء

(۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء تا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)

اودھ کے

فارسی گو شعراء

(۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء تا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)

ڈاکٹر زہرہ فاروقی

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش،
لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: اودھ کے فارسی گو شعراء

مصنفہ: ڈاکٹر زہرہ فاروقی

طبع اول: ۲۰۰۳ء

تعداد اشاعت: ۴۰۰

قیمت: ۲۰۰ روپیہ

مطبع: فائن آفسیٹ ورکس 4152 اُردو بازار، دہلی ۶

ناشر: ڈاکٹر زہرہ خاتون
ڈی۔۱۷۸۔ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

ملنے کے پتے: (۱) ڈی۔۱۷۸۔ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔۲۵
(۲) مکتبہ اشاعت القرآن، جامع مسجد، دہلی

باسمہٖ تعالیٰ

بادا کہ ہر ورق ورقِ گلستان شود
بادا کہ ایں حدیقۂ فن جاودان شود
بادا کہ در سوادِ مزین زمہر و ماہ
زنجیرۂ نگارِ سخن کہکشان شود

رضوان اللہ

انتساب

استادِ محترم مہدی خواجہ پیری نے میرے علمی مشاغل کی راہ متعین کی اور رہنمائی فرمائی انہی کی تحریک میرے تحقیقی مقالے کی اس کتاب کی صورت میں جلوہ گری کی موجب ہوئی جس کا آنجناب کے اسمِ گرامی سے انتساب ایک ادنیٰ نذرانہ ہے۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱۔حرف آغاز:		۱۷
۲۔مقدمہ:		۲۰
۳۔باب اول:	اودھ کا سیاسی و تاریخی پس منظر	۲۵
۴۔باب دوم:	نوابین و شاہان اودھ (مختصر سوانحی خاکے)	۴۲
۵۔باب سوم:	نوابین اودھ کی تہذیبی و سماجی زندگی	۸۱
۶۔باب چہارم:	نوابین اودھ کی علمی و ادبی سرپرستی	۹۹
۷۔باب پنجم:	دور نوابین اودھ کی چند اہم تصنیفات	۱۲۶
۸۔باب ششم:	اودھ کے فارسی گو شعراء	۱۴۲
	(الف) صاحب دیوان شعراء	۱۴۴
	۱۔حکیم شفائی خاں ارشد	۱۴۵

۲۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی	۱۴۷
۳۔ شاہ فصیح افصح	۱۵۱
۴۔ انشاء اللہ خاں انشاء	۱۵۳
۵۔ موھن لعل انیس	۱۵۹
۶۔ جسونت سنگھ پروانہ	۱۶۲
۷۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر	۱۶۵
۸۔ سید محمد اشرف حسرت	۱۶۸
۹۔ بندرابن داس خوشگو	۱۷۰
۱۰۔ سرب سکھ دیوانہ	۱۷۳
۱۱۔ مرزا بھچو ذرہ	۱۷۷
۱۲۔ برہان علی خاں رہین	۱۸۰
۱۳۔ راجہ رتن سنگھ زخمی	۱۸۲
۱۴۔ میر عنایت بیگ ساکن	۱۸۵
۱۵۔ محمد صدیق سخنور	۱۸۷
۱۶۔ مرزا محمد رفیع سودا	۱۸۹
۱۷۔ کنور دولت سنگھ شکری	۱۹۳
۱۸۔ شیخ نظام الدین احمد صانع بلگرامی	۱۹۵
۱۹۔ طالب علی خاں عیشی	۱۹۹
۲۰۔ کرتا کرشن فیض	۲۰۳

۲۱۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی	۲۰۴
۲۲۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی	۲۰۷
۲۳۔ مرزا فاخر مکین	۲۱۱
۲۴۔ میر قمر الدین منت	۲۱۴
۲۵۔ موجی رام موجی لکھنوی	۲۱۷
۲۶۔ میر تقی میر	۲۱۹
۲۷۔ رائے پنجاب رائے والی	۲۲۳
۲۸۔ بھگوان داس ہندی	۲۲۵
(ب) مشہور و معروف شعراء	۲۲۸
۱۔ قاضی محمد صادق اختر	۲۳۰
۲۔ واجد علی شاہ اختر	۲۳۲
۳۔ گوربخش ادیب	۲۳۴
۴۔ منشی گردھاری لال اسد	۲۳۷
۵۔ مظفر علی خاں اسیر	۲۳۸
۶۔ راجہ الفت رای الفت	۲۴۰
۷۔ شیخ شرف الدین ملول الہام	۲۴۱
۸۔ منشی لال چند انس	۲۴۳
۹۔ شیر افگن باسطی	۲۴۵
۱۰۔ سعادت خاں برھان الملک برہان	۲۴۶

۱۱۔ خواجہ عبدالعزیز بسملؔ	۲۴۸
۱۲۔ شیخ بقاءاللہ بقاءؔ	۲۴۹
۱۳۔ منشی جوگل کشور بہارؔ	۲۵۱
۱۴۔ منشی مکھن لال بہجتؔ	۲۵۲
۱۵۔ پنڈت سومناتھ مبعثیؔ بیخودؔ	۲۵۳
۱۶۔ رای سناتھ سنگھ بیدارؔ	۲۵۵
۱۷۔ میدی لعل بیمارؔ	۲۵۶
۱۸۔ نصیرالدین حیدر پادشہؔ	۲۵۷
۱۹۔ عبدالعلی تحسینؔ	۲۵۸
۲۰۔ مرزا محمد تقی ترقیؔ	۲۵۹
۲۱۔ ٹیکارام تسلیؔ	۲۶۱
۲۲۔ سلام اللہ خاں تسلیمؔ	۲۶۲
۲۳۔ راجہ جے گوپال سنگھ بہادر ثاقبؔ	۲۶۳
۲۴۔ پرشادی لال جواہرؔ	۲۶۵
۲۵۔ جواہر سنگھ جوہرؔ	۲۶۶
۲۶۔ حاجبؔ	۲۶۷
۲۷۔ لالہ چنی لال حریفؔ	۲۶۹
۲۸۔ جعفر علی حسرتؔ	۲۷۰
۲۹۔ خواجہ محمد حسن، حسنؔ	۲۷۲

۳۰۔ میر غلام حسن، حسنؔ	۲۷۴
۳۱۔ مرزا باقر حقیرؔ	۲۷۶
۳۲۔ مولوی محمد عوض حکمتؔ	۲۷۷
۳۳۔ میر حیدر علی حیرانؔ	۲۷۸
۳۴۔ منشی خیالی رام خیالیؔ	۲۸۰
۳۵۔ مکھن لال رائیؔ	۲۸۱
۳۶۔ رای کھیم نرائن رندؔ	۲۸۲
۳۷۔ میر جعفر روحیؔ	۲۸۳
۳۸۔ روشن لال روشنؔ	۲۸۴
۳۹۔ کریم داد خاں رونقؔ	۲۸۵
۴۰۔ لالہ شتاب رای زارؔ	۲۸۶
۴۱۔ میر اولاد علی زایرؔ	۲۸۷
۴۲۔ شیخ فضل حق ساحرؔ	۲۸۹
۴۳۔ لالہ سکھراج سبقتؔ	۲۹۲
۴۴۔ شیخ رضی الدین سروریؔ	۲۹۴
۴۵۔ رای بال گوبند شادؔ	۲۹۷
۴۶۔ دیبی پرشاد شادؔ	۲۹۹
۴۷۔ میر سید محمد شاعرؔ بلگرامی	۳۰۱
۴۸۔ پیہم ناتھ شیداؔ	۳۰۳

۴۹۔ میر سید عبدالعلی طاؔلع	۳۰۴
۵۰۔ مرزا رمضان بیگ طپاؔں	۳۰۵
۵۱۔ عارف علی شاہ عارؔف	۳۰۷
۵۲۔ شیخ محمد عاشق، عاشؔق	۳۰۸
۵۳۔ منشی رائے طوطا رام عاصؔی	۳۰۹
۵۴۔ شاہ عالم خاں، عالؔم	۳۱۰
۵۵۔ شیخ محمد فاخؔر	۳۱۲
۵۶۔ شیخ فیض محمد فایؔض	۳۱۳
۵۷۔ مرزا محمد حسن قتیؔل	۳۱۴
۵۸۔ کشن چند قریؔب	۳۱۶
۵۹۔ میر نثار علی قریؔن	۳۱۷
۶۰۔ حکیم حیات اللہ قلاؔش	۳۱۹
۶۱۔ سید مدد علی مائؔل	۳۲۱
۶۲۔ شیخ دوندی مائؔل	۳۲۳
۶۳۔ نواب محبت خاں محبؔت	۳۲۵
۶۴۔ ستیل داس مختؔار	۳۲۷
۶۵۔ لالہ رام بخش مطیؔع	۳۲۸
۶۶۔ کاظم بیگ خاں ممکؔن	۳۳۰
۶۷۔ کنور درگا پرشاد مہؔر	۳۳۱

۶۸۔ شیخ امام بخش ناسخ ۳۳۴
۶۹۔ شیخ غلام نبی بلگرامی ۳۳۷
۷۰۔ شیخ بہادر علی واثق ۳۳۹
۷۱۔ نول رائے وفا ۳۴۱
۷۲۔ مرزا ابوعلی ہاتف ۳۴۳

۹۔ منابع و مآخذ ۳۴۶

کتابیات ۳۴۷
رسائل ۳۶۳
مائیکرو فلم ۳۶۶

حرف آغاز

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہندوستان اور ایران کے روابط بہت ہی قدیم زمانہ سے رہے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا اور پھر عربوں کی حکومت سندھ میں قائم ہوئی۔ عربوں نے تقریباً تین صدیوں تک سندھ پر اپنی حکومت قائم رکھی اور اسی زمانے میں سندھیوں اور عربوں کے مابین لسانی اور معاشرتی اختلاط ہوا اور دونوں نے ایک دوسرے پر اپنے اپنے تہذیبی اثرات مرتب کیے، گیارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان کے اس علاقہ میں آزاد اسلامی ریاستیں قائم رہیں۔ پھر گیارہویں صدی عیسوی میں صفاریوں نے جو کہ ایرانی تھے سندھ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اب ہندوستان کے لوگوں کا سابقہ عربوں کے علاوہ ایرانیوں سے بھی پڑا اور ایرانی تہذیب و تمدن کا اختلاط ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ہوا اور ہندوستانیوں کو اب فارسی بولنے والی قوم کے ساتھ میل جول بڑھانے اور ربط ضبط رکھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اور اس طرح پہلی بار فارسی زبان باقاعدہ ہندوستان کی سرزمین پر وارد ہوئی اور دھیرے دھیرے اپنی تمام تر خوبیوں اور حسن کاریوں کے ساتھ ہند کی سرزمین پر تیزی کے ساتھ پھلنے پھولنے لگی۔ پھر بعد کے آنے والے زمانے میں تو ہندوستان کے مسلم سلاطین نے اپنی علم پروری اور ادب نوازی کے ذریعہ فارسی زبان و ادب کو بڑی ترقی دی۔

غزنوی عہد ہو یا لودھی حکمرانوں کا زمانہ، سلاطین دکن کی حکومت ہو یا مغلوں کا دربار، فارسی زبان نے دھیرے دھیرے امراء رؤساء اور حکمرانوں کی سرپرستی میں ہندوستان میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ دور اکبری میں تو خصوصی طور پر فارسی تعلیم کو زیادہ ہی وسعت دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی خوشی خوشی نہ صرف فارسی زبان سیکھی بلکہ فارسی زبان میں اچھی استطاعت

حاصل کرنا ان کے لئے باعث عزّت وشرف بن گیا۔ پھر تو تمام علوم وفنون تیزی کے ساتھ ترقی پاتے گئے اور فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا ایک طویل سلسلہ ہندوستان میں شروع ہوگیا ۔ تاریخ ہو یا ادب، انشاء ہو یا فلسفہ، علم الحساب ہو یا ہیئت ونجوم ہو یا قصص وحکایات غرض کہ ہر ہر موضوع پر فارسی میں کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ یہاں تک کہ اسلامیات ، ہندو مذہب، عیسائی مذہب اور دیگر مذاہب کی کتب کے ترجمے بھی فارسی زبان میں باقاعدہ ہوگئے ۔

مغلوں کے انحطاط کے آثار رونما ہوتے ہی دہلی کے اطراف کے علاقہ میں آزاد حکومتیں قائم ہونے لگیں ۔ انھیں میں شمالی ہندوستان میں سب سے اہم اور عظیم الشان حکومت شاہانِ اودھ کی قائم ہوئی ۔ جہاں پر بہت سے علماء، شعراء پہلے سے ہی موجود تھے دہلی کی تباہی کے نتیجہ میں ادباء اور شعراء کی ایک بڑی تعداد ذہنی سکون اور معاشی اطمینان حاصل کرنے کے لئے اودھ کے مرکزی شہر لکھنؤ آ گئی۔ چونکہ اودھ کے حکمرانوں کے اجداد ایرانی النسل تھے اور ان کے اکثر سلسلے اور رشتہ داریاں ایران کے خاندانوں میں تھیں اس لئے ایرانی رسم ورواج اور عجمی تہذیب وتمدن سے ان حکمرانوں کو خصوصی لگاؤ تھا اور اودھ کے ان حکمرانوں نے اس کو فروغ دینے اور اس کی سرپرستی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی تہذیب وتمدن کے اثرات کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کو بھی اودھ میں بھرپور پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور اردو شعروادب کے ساتھ ساتھ فارسی شعروشاعری اور فارسی نثر نگاری کو بھی کافی ترقی ہوئی ۔ اور اودھ کے علمی اور ادبی ماحول میں کچھ ایسے رجحانات فروغ پائے کہ اردو تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی تصنیفات کا ہونا ذی علم ہونے کا معیار قرار پایا، اس طرح فارسی ادبیات کو اور بھی ترقی ہوئی اور نہ صرف ہر پڑھا لکھا آدمی فارسی دانی کی طرف رجوع ہوا بلکہ صاحبِ ثروت اور ذی حیثیت امراء اور رؤساء نے اپنے مصاحبین میں ایسے لوگوں کو جگہ دی جو فارسی کے ادیب وشاعر تھے اس سے سماج میں انھیں اور زیادہ عزت ووقار حاصل ہوا۔ اس طرح اودھ میں فارسی زبان وادب کو پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا بہت ہی سازگار ماحول مل گیا۔ اور فارسی زبان اردو کے شانہ بہ شانہ اودھ کے مقامی افکار ورجحانات کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔

آج کے جدید دور میں جبکہ علاقائی سطح پر ادب وتاریخ کا مطالعہ کیا جارہا ہے تو یہ ضروری ہے کہ خطۂ اودھ کے فارسی ادباء اور شعراء کی خدمات کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے۔ اردو کے حوالے سے تو ماضی میں کئی مستند کتابیں لکھی گئی ہیں جیسے ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' ''اردو ادب کا سیاسی وسماجی پس منظر'' وغیرہ مگر فارسی ادبیات کے حوالہ سے ابھی بھی علاقہ اودھ کا مطالعہ تشنہ ہے۔ شاید وقت کی اسی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے عزیزہ ڈاکٹر زہرہ خاتون نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ ''اودھ کے فارسی گوشعراء'' مکمل کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے فارسی ادب میں پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی اور اب وہ اپنی اس تحقیق کو کتابی صورت میں ناظرین کے سامنے پیش کررہی ہیں۔ مصنفہ نے معتبر اور اہم مراجع کا استعمال کرتے ہوئے اپنے اس موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے اور اودھ کے فارسی گوشعراء کی ایک طویل فہرست فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اُس دور کی فارسی شاعری کے فکری رجحانات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح انھوں نے اودھ کی تاریخ وادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے بہت اہم اور قابل قدر مواد فراہم کردیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی اس کوشش کی اہل علم حضرات میں پزیرائی ہوگی۔

۲۱ فروری ۲۰۰۳ء

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام
پروفیسر شعبہ عربی
لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

مقدمہ

خطۂ اودھ کی حیات بخش آب وہوا میں ایک ایسی نرمگی حل تھی جس کے ایک لمس نے تہذیب کے ہر گوشے کو مجلّا ومشفا کر دیا، محاسن مخفی کو منصۂ شہود پر لا کر ایک عالم سے داد طلب کی اور حیات انسانی کے ہر پہلو کو دولت حسن سے مالا مال کر دیا۔ زبان و بیان، لذائذ کام و دہن، لباس و پوشاک، آداب مجالس و محافل سب کو ایک لطیف رنگ آمیزی سے ایسا مزین کیا جسے چہار دانگ عالم سے شرف قبولیت حاصل ہوا۔ ان مناظر قشنگ کے کچھ بوٹے عرب وعجم سے بوئے گل کے ہمرکاب آئے اور اس دھرتی کی مٹی پانی سے آمیز ہو کر ایک عالم کو دعوت نظارہ دیتے گئے اس عالم کیف سے مسحور و مسخر ہونے والے گہر ہائے آبدار کی تلاش میں اپنے فنون کی گہرائیوں میں غرق ہو گئے لیکن جب وہ اسی دولت لازوال کو لے کر باہر آئے تو منہ مانگے دام دینے والے قدردان ''شاہ'' بھی تھے اور ''جوہری'' بھی۔

تہذیب انسانی کی تاریخ کے تناظر میں اور قدیم ترین ہندوستانی تہذیب کے سیاق وسباق میں بھی دیکھا جائے تو یہ عرصۂ روح افزا نہایت مختصر تھا۔ حسرت یہ ہے کہ حیات انسانی کو جلا بخشنے والے اس عہد کو کچھ اور طولانی نصیب ہوتی لیکن خوشی یہ ہے کہ اس مختصر عرصے کے نقوش جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکے ہیں اور اس تہذیب کے کارناموں نے اس کے لئے حیات دوام کا پروانہ حاصل کر لیا ہے۔

اس تہذیب نے جو قندیلیں روشن کیں ان کے پروانے اب بھی اسی وارفتگی اور بے تابی سے اپنا سرمایۂ حیات نچھاور کرتے جا رہے ہیں۔ انہی قندیلوں کی روشنی میں شعر وسخن کی پرورش اور ارباب فن کی بزم آرائیاں ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ ان کے تذکرے دل وجان کے لئے ایسی راحت کے سامان ہیں کہ ان سے کبھی سیری نہیں ہو سکتی، ان گلستانوں کی خوشبو سے کبھی تسکین روح کی تکمیل نہیں ہو سکتی، چنانچہ بہاروں کی تازہ کاری نئے بوستانوں کو گل افشانی کی ترغیب وتربیت دیتی رہے گی، نئے گل کھلتے

رہیں گے جن سے نئے دبستانوں کی آرائش و زیبائش ہوتی رہے گی۔ یہ تصنیف ''اودھ کے فارسی گو شعراء'' انہی بہاروں کی گلپاشیوں کا ثمرہ ہے یا انہی پارینہ قندیلوں کی روشنی سے عبارت ہے یا اسی سلسلہ حسن و جمال کے نئے دیئے روشن کرنے کی ایک کوشش ناتمام ہے۔

تہذیب وتمدن کے عظیم گہوارے یعنی خطۂ اودھ کا ذکر تاریخ و تذکرے کی کتابوں میں اس کثرت سے ملتا ہے کہ یہاں کے شعراء، ادباء، علماء وصوفیہ میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں، علماء وصوفیہ کے احوال و آثار پر قابل قدر کام بھی ہوئے ہیں۔ تذکرہ نگاروں اور مصنفین نے اودھ کی تہذیب کو جو بعد میں لکھنوی تہذیب کے نام سے مشہور ہوئی، ہمیشہ شاعرانہ حاشیہ آرائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے یہاں فارسی، عربی اور اردو شعروادب نے کبھی اتنا بلند مقام حاصل کیا کہ دہلی کا چراغ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔ اس تہذیب کی ابتداء کب اور کس طرح ہوئی اس کی نشو ونما میں کن عناصر کا حصہ رہا مزید برآں دارالسلطنت دہلی سے علم وادب کی مسند سیاست اودھ کی طرف کب، کیوں اور کیسے منتقل ہوئی ان سوالات کے جواب میں ایک ایسا گوشہ بھی تھا جو ہنوز تحقیق طلب تھا، یہ تصنیف دراصل اسی گوشے کی تشریح وتوضیح ہے۔

اگرچہ ارباب تاریخ وسیر نے اس عہد کی علمی خدمات کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ تحقیق کے بعد یہ بات واشگاف ہوئی کہ اس زمانے میں تاریخی کتابیں اور تذکرے بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ جن میں فارسی گو شعراء کے تذکرے بھی شامل تھے لیکن سلطنت اودھ (۱۱۳۴ھ تا ۱۲۷۳ھ) کے فارسی شعراء پر کوئی ایسی جامع تصنیف سامنے نہیں آئی جس سے ان کے تفصیلی حالات نیز ان کے مراتب شاعری کا علم ہو سکے۔ ان کے آثار و باقیات جو یا تو ضائع ہو گئے یا مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت بنے ان کا پتہ لگانا اور تحقیق کرنا یقیناً ناگزیر تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ شعراء کہاں سے نسبت رکھتے تھے، انہوں نے کیا لکھا، کیا چھوڑا اور آج ان کے آثار و باقیات کہاں کہاں دستیاب ہیں انہی سوالات کے پیش نظر ''اودھ کے فارسی گو شعراء'' کا موضوع میری تحقیق کا باعث ہوا۔

نوابین اودھ کے دور سے میری مراد وہ زمانہ ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں

سعادت خان برہان الملک کی صوبیداری سے شروع ہوکر انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں واجد علی شاہ کے انتزاع سلطنت پر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران کل گیارہ صوبیداروں نے خطۂ اودھ پر فرمانروائی کی۔ ابتدائی چھ صوبیدار نواب کے لقب سے جبکہ آخری پانچ بادشاہ کے لقب سے متصف ہوئے۔ تقریباً ایک سو پینتیس (۱۳۵) سال کی مدت پر محیط نوابین اودھ کا یہ زمانہ کئی اعتبار سے اہم اور تاریخ ساز رہا ہے۔ یہ کتاب دراصل نوابین اودھ کے اسی دور میں فارسی شعراء کے تذکرے پر مشتمل ہے جس میں ان کے احوال وآثار ، ان کے نمونۂ کلام نیز نقد وتبصرہ کے علاوہ اودھ کی مختصر تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔

کتاب ہذا چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اودھ کی وجہ تسمیہ اور اس عہد کا اجمالی تعارف ہے باب دوم وسوم میں نواب برہان الملک سے آخری نواب واجد علی شاہ تک کے سیاسی وثقافتی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ باب چہارم نوابین اودھ کے ادبی رجحانات اور ان کی علمی و ادبی سرپرستیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ پانچویں باب میں عہد نوابین کی چند اہم تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے اور چھٹا باب اس عہد کے معروف ومشہور شعراء پر مشتمل ہے جن کی تعداد سو کے قریب پہونچتی ہے۔

یوں تو عہد مذکور میں شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے لیکن اس کتاب میں جن شعراء کے احوال شامل کئے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی طور عہد نوابین میں سرزمین اودھ سے وابستہ تھے ان میں ایک بڑی تعداد ان مہاجر شعراء کی بھی شامل ہے جو دربار دہلی سے وابستہ تھے ، وہیں پیدا ہوئے ، تعلیم وتربیت پائی اور کامیابیوں سے ہمکنار بھی ہوئے لیکن عمر کے آخری دور میں دہلی کی زبوں حالی اور بربادی نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ بالآخر وہ ہجرت کرکے اودھ میں سکونت پزیر ہوئے ایسے شعراء میں میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

موجودہ کتاب کی صورت میں پی ایچ ڈی کے لئے یہ تحقیقی مقالہ استاد محترم ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی ، ریڈر شعبۂ فارسی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ، نے بطور عنوان تجویز کیا تھا اور اس مہم کو سر کرنے میں میری رہنمائی پر تمامتر توجہ اور کاوش صرف کی لیکن اس موضوع کے انتخاب اور اس پر عمل آوری کی تحریک کے پس پشت ایک بڑا حوصلہ بخش اور مضبوط نفسیاتی محرک بھی موجود تھا میرے عمّ محترم پروفیسر

فیضان اللہ فاروقی، شعبۂ عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، نے عربی زبان وادب اور علوم اسلامی کے فروغ میں انیسویں صدی کے لکھنؤ کی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر فرمایا تھا جو کتابی شکل میں بزبان انگریزی شائع ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے استاد محترم کے تجویز کردہ عنوان پر کام کرنے کے لئے نہ صرف بلا تأمل و بلا تکلف عمل پیرا ہونے کے لئے آمادگی پیدا ہوئی بلکہ عم محترم کی روشن کی ہوئی شمع کی روشنی میں اس راہ کے نشیب و فراز سے قدرے آگاہی بھی ہوئی۔ ان کی اس بالواسطہ اور بلاواسطہ رہنمائی کے لئے میں سرتاپا مشکور ہوں۔ جہاں تک استاد محترم کی مشفقانہ زحمتوں کے لئے احساس ممنونیت کا تعلق ہے وہ بالکل فطری اور اظہر من الشمس ہے۔ اس کا اظہار و بیان محض ایک رسمی کاروائی ہے تاہم طبیعت اس سے عہدہ برآ ہونے پر مصر ہے۔

میں اس اعتبار سے خود کو نہایت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ تحقیق کے ہفت خواں سے سلامتی کے ساتھ گزرنے اور اس راہ کے ہر نشیب و فراز پر میری دستگیری کرنے والے ایسے بزرگ موجود تھے جن کے اسمائے گرامی آسمان علم وادب پر مہر و ماہ کی طرح روشن ہیں۔ پروفیسر ولی الحق انصاری، سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، نے اس مقالے کی تکمیل کے دوران لکھنؤ کے سفر کے موقع پر رہنمائی فرمائی، ان کی اس کرم گستری کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ پروفیسر شعیب اعظمی، سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دوران تحریر وقتاً فوقتاً اپنے بے بہا مشوروں سے نوازتے رہے۔ ان کی نوازشات کے لئے ہدیۂ تشکرات پیش کرتی ہوں۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی، سابق صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، میرے تحقیقی مقالے کو شرف قبولیت عطا کرنے والے بورڈ میں بطور شاہد خصوصی تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر اور اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازتے رہے، ان کی ان عنایات کے لئے ممنون ہوں۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے اول تا آخر رہنمائی کی جو روش اختیار فرمائی اس پر اب تک ثابت قدم ہیں۔ اس روش کرم گستری کے لئے ان کی سپاس گزار ہوں۔

تحقیق و تجسّس علمی کی پُر خار راہوں سے گزرتے ہوئے کبھی ایسے وقفے بھی آجاتے ہیں جہاں روح ایک بے پایاں حیرانی کا شکار ہوتی ہے کہ اگلی منزل کون سی ہو اور اس کی راہ کدھر ہے۔ ایسے مقامات

پر رہبری کا رخضر سے کم نہیں ایسے ہی عرصۂ حیرانی میں ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری، شعبۂ ثقافت، سفارتخانۂ ایران نے منارۂ نور کی طرح اشارت فرمائی اور فہم کشا بصیرت کی ایسی راہ پر گامزن کر دیا جہاں ہر طرف نور ہی نور تھا اور وہ راستہ کتابوں کی ایک ایسی دنیا میں کھلا جہاں مجھ جیسا کم مایہ حیران و سرگرداں ہے اسی دنیا کے ایک گلیارے سے گذرتے ہوئے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ تک رسائی حاصل ہوئی جہاں بطور گیسٹ لکچرر زبان و ادبیات فارسی، ایک نئے سلسلے کا آغاز میرے لئے ایک جہان نادیدہ سے آشنائی کے آغاز کے مترادف ہے۔ ان فیوض و برکات کے لئے محرکات و اسباب ظاہری آقای مہدی خواجہ پیری نے فراہم کئے اس بے پایاں کرم فرمائی کے لئے الفاظ و بیان ناکافی ہیں تاہم متشکرانہ بسوی آن بزرگ محترم می بینم اور آخر میں اپنے بزرگوں بالخصوص والدہ محترمہ اور والد محترم جناب رضوان اللہ فاروقی کی ممنون کرم ہوں جن کی ہمہ وقت توجہ، شفقت اور سرپرستی اگر مجھے حاصل نہ ہوتی تو شاید یہ تحقیقی مقالہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ پاتا۔

یہ سب تو ہوا لیکن کسی کتاب کو لکھ دینا ایک بات ہے اور مسوّدے کو کتابی شکل میں منظر عام تک لانا اور بات ہے اس کے لئے بالکل مختلف عوامل و اسباب کی ضرورت ہوتی ہے جو جناب ابو مسعود اظہر غوری ندوی صاحب نے فراہم کئے اس کے بغیر ساری کوششیں محض ناتمام ہوتیں۔ ان کوششوں کی صورت گری کے لئے میں ان کی بیحد شکر گزار ہوں۔

تحقیق دراصل حقیقت کی تلاش و جستجو کا نام ہے اور میں نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہتر سے بہتر ثابت ہو لہذا مواد کی فراہمی اور منابع و مصادر تک جس قدر رسائی ممکن ہو سکی اس سے دریغ نہیں کیا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی تحقیقی مقالے کے سلسلے میں صد فیصد صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ میری گزارش ہے کہ قارئین کرام اس پیشکش میں کمیوں اور کوتاہیوں سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

زہرہ فاروقی

ڈی۔۱۷۸۔ابوالفضل انکلیو

جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

باب اول

اودھ کا سیاسی اور تاریخی پس منظر

مشرقی ہندوستان کے قدیم ترین گہوارۂ علم وادب یعنی خطۂ اودھ کا فارسی سرمایہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ خطہ نوابین اودھ کے عہد میں خاص طور سے تہذیب وتمدن اور علم وفضل کا مرکز رہا۔ یہاں بڑے نامور علماء، فضلاء، مشائخ اور صوفیہ گزرے ہیں جن کی ضیاپاشیوں سے نہ صرف مشرقی خطہ بلکہ سارا ہندوستان جگمگا اٹھا۔ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

''اس کے تسلیم کرنے میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطۂ زمیں پر یہ پچھلا دربار قائم ہوا، اس کی وقعت اور اہمیت ہندوستان کے تمام صوبوں سے بڑھی ہوئی ہے''(۱)

اس اہمیت کے پیش نظر اس خطہ کے تاریخی پس منظر کا ایک جائزہ حسب ذیل ہے۔

اودھ یوں تو اساطیری بنیادوں پر ابتدا ہی سے قدیم ہندوستان میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے، جسے تاریخ کے اوراق آج بھی اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ باقر شمس لکھنوی نے ''تاریخ لکھنؤ'' میں اودھ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اودھ کے معنی وعدے کے ہیں رام چندر جی نے بن باس کی مدت پوری کرنے کے بعد یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ کا شہر تھا۔ ایک مدت کے بعد اجودھیا دارالسلطنت اور اودھ پورے صوبہ کا نام ہوگیا''(۲)

سید سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' میں رقمطراز ہیں:

بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ ہے جس کو اودھ کہتے ہیں۔ یہ اصل میں اس شہر کا نام تھا جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۴۱

(۲) تاریخ لکھنؤ: ص ۱۸

سے مشہور ہے مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کہا اور ایک بڑے صوبہ کا نام رکھا" (۱)

"دائرہ معارف اسلامیہ میں" اودھ سے متعلق یہ وضاحت ملتی ہے :

"بھارت کا ایک علاقہ جو پہلے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی ایک انتظامی وحدت شمار ہوتا تھا اور اب اتر پردیش (دار الحکومت لکھنؤ) کا ایک حصّہ ہے ... زمانۂ قدیم سے ہی اودھ اور اس کے مضافات شمالی ہندوستان کے وسیع اور زرخیز میدان کا حصہ رہے ہیں اور یہ ہندو تہذیب کا بڑا مرکز رہا ہے اودھ اور اس کے ارد گرد کے علاقے کے متعلق جو نیم تاریخی نیم افسانوی روایتیں مشہور ہیں وہ سب یہاں کے قدیم شہر اجودھیا (فیض آباد) ہی سے متعلق ہیں جو دریائے گھاگھرا پر واقع ہے بلکہ اجودھیا ہی کے نام سے اس علاقہ کا نام اودھ پڑ گیا" (۲)

اسکی وجہ تسمیہ "باقر شمس" نے کچھ اس طرح بیان کی ہے:

"جودھ کے معنی جنگ کے ہیں دار السلطنت ہونے کی وجہ سے یہ شہر بہادر چھتریوں کی طاقت کا مرکز تھا۔ اس وجہ سے اجودھیا کہتے تھے یعنی نا قابل تسخیر شہر" (۳)

جبکہ نجم الغنی خاں "تاریخ اودھ" میں لکھتے ہیں:

"مادۂ لفظ اجودھیا کا سنسکرت میں لفظ اجودھ ہے اور اجودھ کے معنی "نا مغلوب" کے ہیں ... پس اجودھیا کے معنی خالق کا نا مغلوب شہر" (۴)

صوبۂ اودھ دریائے گنگا کے سرسبز و شاداب میدان کا ایک وسطی حصہ ہے۔ اتر پردیش کا یہ پوربی حصّہ نیپال کی سرحد کی ترائی سے لے کر گنگا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی وسعت اور حدود اربعہ وقت اور حالات کے ساتھ کبھی بڑھتے اور کبھی گھٹتے رہے۔ یوں اس کا رقبہ مغرب میں شاہ آباد سے ضلع ہردوئی تک، مشرق میں عظیم آباد، شمال میں دریائے راپتی اور نیپال کی ترائی تک اور جنوب میں دریائے گنگا تک محیط تھا۔ شمال اور شمال مشرق میں نیپال مشرق میں گورکھپور، اعظم گڑھ اور جونپور تک پھیلا ہوا تھا جبکہ جنوب میں الہ آباد اور جنوب مغرب میں دوآبہ اور شمال و مغرب میں شاہجہاں پور تک سرحدیں تھیں۔

---

(۱) حیات شبلی: (مقدمہ) ص ۱۹

(۲) دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۳) ص ۵۱۶

(۳) تاریخ لکھنؤ: ص ۱۸

(۴) تاریخ اودھ (حصہ اول) ص ص ۳۳-۳۴

دہلی میں اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد خطۂ اودھ یوں تو کسی خاص کارنامے کے لئے شہرت نہیں رکھتا، لیکن پانچویں صدی ہجری (مطابق گیارہویں صدی عیسوی) میں سید سالار مسعود غازی (۱) کے لکھنؤ پر اقتدار کے ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون اور ثقافت کے دروازے مشرق کی جانب کھل گئے۔ مسلمان فاتحین خطۂ اودھ پر قابض ہوئے اور انھوں نے اس صوبے کو سلطنت دہلی میں شامل کرلیا۔

ساتویں صدی ہجری (مطابق تیرہویں صدی عیسوی) میں دہلی کے التتمش بادشاہ کی طرف سے ناصرالدین محمود (پسر التتمش) حاکم اودھ بنایا گیا۔ (۲) سلطان رضیہ کے عہد میں اودھ کا امیر ملک نصیرالدین تائیسی تھا اس سلسلہ میں تاریخ مبارک شاہی سے چند شہادتیں سپرد قلم ہیں:

"... و با سلطان رضیہ مخالف بنیاد نہادند و ملک نصیرالدین تائیسی امیر اودھ بمدد سلطان رضیہ در شہر می آمد..." (۳)

سلطان رضیہ کے بعد اس کا بھائی ناصرالدین محمود تخت نشین ہوا اس نے ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں صوبہ اودھ پر فوج کشی کی جس کا ذکر "تاریخ مبارک شاہی" نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"واز بداؤ (بدایوں) سمت خطۂ اودھ عزیمت فرمود" (۴)

غیاث الدین بلبن کے عہد میں ملک شہاب الدین "امیر اودھ" کا عہدہ سنبھالے رہے۔ اور معزالدین بہرام شاہ کے زمانے میں قاضی جلال الدین کاشانی اودھ میں (۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۳ء) قاضی الممالک کے عہدے پر بہت دنوں تک فائز رہے۔ اس صدی کے آخر میں خان جہاں اودھ کے صوبہ دار ہوئے۔ طوطیٔ ہند امیر خسرو اس وقت اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ

---

(۱) سید سالار مسعود غازی

انھوں نے ۴۵۹ھ (۱۰۶۶ عیسوی) میں اودھ میں پہلے سے بسی قوموں (بھر اور پاسی) سے مقابلہ کیا۔ اور اقتدار حاصل کیا جو مسلمان خاندان پہلے پہل یہاں آکے آباد ہوئے تھے وہ اس حملہ کے بعد سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آئے تھے۔ (گزشتہ لکھنؤ، ص ۲۱)

(۲) تاریخ مبارک شاہی: ص ۲۲

(۳) ایضاً، ص ۲۵

(۴) تاریخ مبارک شاہی: ص ۲۵

دو برس تک یہاں رہے۔ مثنوی ''قرآن السعدین'' میں اودھ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

خان جہاں حاتم مفلس نواز　　گشت با قطاع اودھ سرفراز

در اودھ از بخشش اوتا دو سال　　ہیچ غم و نالہ نہ بود از مثال(۱)

آٹھویں صدی ھجری (چودھویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں یہ صوبہ محمد تغلق کی وسیع و عریض مملکت کا حصّہ تھا لیکن اس صدی کے آخر میں جونپور کی مشرقی سلطنت (۲) میں مدغم ہو گیا۔

خاندان لودھی کے عہد حکومت (۸۵۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۹۳۲ھ مطابق ۱۵۲۶ء) میں یہ علاقہ ایک دفعہ پھر سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔

مغل عہد میں شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) نے جب اپنی مملکت کو صوبوں میں تقسیم کیا تو اودھ ایک مستقل صوبہ اور لکھنؤ اس کا دار الخلافہ قرار پایا۔ شیخ عبدالرحیم بجنوری یہاں کے صوبہ دار ہوئے۔ گذشتہ لکھنؤ کی عبارت ہے:

> ''۱۰۱۹ھ (۱۵۹۰ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبہ اودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر، بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ ان دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاش معاش دہلی پہنچے ... آخر منصبداران شاہی میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی'' (۳)

---

(۱) قرآن السعدین: ص ۲۲

(۲) جونپور کی شرقی سلطنت کی بنیاد ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں ملک الشرق سرور خواجہ جہاں نے ڈالی۔ خواجہ جہاں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں خواجہ سراؤں کا سردار تھا۔ ناصر الدین محمود شاہ بن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں وزیر مقرر ہوا۔ بادشاہ نے اسے ملک الشرق کا خطاب دیا اور قنوج سے لے کر بہار تک کا سارا علاقہ اس کے سپرد کر دیا۔ اودھ اور جونپور بھی اس میں شامل تھے۔ اس نے اپنے تدبّر اور انتظامی صلاحیت کی بناء پر سارے علاقہ پر قبضہ حاصل کیا اور جونپور کو دار الحکومت قرار دیا اسکی حکومت شرقی سلطنت کے نام سے موسوم ہوئی جو کم و بیش ۸۷ سال قائم رہی شرقی خاندان کے چھ بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے سلطنت جونپور پر ۸۸۳ھ (مطابق ۱۴۷۸ء) تک حکومت کی اس کے بعد لودھی خاندان کے ہاتھوں اس شاندار سلطنت کا خاتمہ ہو گیا (فقہائے ہند جلد ۲ و آثار مشرق)

(۳) گذشتہ لکھنؤ: ص ۵۶

لکھنؤ شہر میں ترقی کی شروعات اسی عہد سے ہوگئی تھی۔ اکبر نے خود بھی اسکی طرف توجہ کی اس زمانے کی یادگاروں میں لکھنؤ کا باچپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، بنجاری ٹولہ ہیں۔ شیخ عبدالرحیم نے شیخن دروازہ اور قلعہ مچھی بھون تعمیر کروایا۔(۱) جس میں چھبیس محرابیں تھیں اور ہر محراب پر دو دو مچھلیاں بنائی گئیں تھیں۔

اس عہد کی ترقی کو دیکھ کر ایک فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا، دربار شاہی سے لکھنؤ میں قیام کرنے کے لئے سند حاصل کرلی تھی۔ اس کے بنوائے ہوئے مکانات آگے چل کر فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئے۔

آئندہ ڈیڑھ سو برسوں تک مغلوں کے ماتحت اودھ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ بلکہ اس دوران ملکی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز دکن ہی رہا آخر عہد اکبری میں جواہر خاں اودھ کے صوبہ دار ہوئے (۲) ان کے عہد میں محمود نگر، شاہ گنج اور اکبری دروازہ تعمیر ہوئے۔ جہانگیر بادشاہ نے اپنے دورِ حکومت (۱۰۱۴۔۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۰۵۔۱۶۲۷ء) میں یہاں ایک بہت بڑی منڈی بنوائی جو ''محلّہ مرزا منڈی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

شاہجہاں کے عہد (۱۰۳۷۔۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۲۷ تا ۱۶۶۶ء) میں لکھنؤ کے صوبہ دار سلطان قلی خاں تھے، (۳) ان کے دو بیٹے مرزا فاضل و منصور کے نام پر فاضل نگر اور منصور نگر آباد ہوئے۔

شاہجہاں کی جانشینی کے سلسلے میں جو جنگیں اورنگ زیب کو پیش آئیں ان میں اودھ کا کوئی خاص حصّہ نہ تھا۔ البتہ اورنگ زیب نے جب اجودھیا کا سفر کیا تو وہ لکھنؤ بھی گیا اور اس نے لچھمن ٹیلہ کے غار

---

(۱) جس معمار نے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ لکھنا نام کا ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی کے نام پر شہر کا نام لکھنؤ ہوگیا اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور بگڑ کے لکھنؤ بن گیا۔ (گزشتہ لکھنؤ، ص ۵۶)

(۲) جواہر خاں دہلی میں رہے مگر ان کے نائب محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اس سے ملحق داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کئے اور ان کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔ (گزشتہ لکھنؤ، ص ۵۸)

(۳) گذشتہ لکھنؤ، ص ۵۹

پر ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ اس وقت یہاں کے حاکم فدائی خاں تھے۔ لیکن اصل قوت شیخ زادوں کے ہاتھوں میں تھی۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء) کے بعد متعدد حکمراں دہلی کے تخت پر آئے اور گئے۔ مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھرتا ہوا نظر آیا۔ کیونکہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء سے ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء تک کے عرصہ میں سات بادشاہ (۱) تخت دہلی پر جلوہ افروز ہو چکے تھے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سادات بارہہ (۲) کا ہر طرف زور تھا۔ اور حکومت کے انتظام و انصرام میں وہ کافی دخیل تھے۔ جسے چاہتے تخت پر بیٹھاتے اور جسے چاہتے ذلیل و رسوا کر کے تخت سے اتار دیتے۔

---

(۱) یہ سات بادشاہ مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اوّل ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء تا ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء

۲۔ معز الدین جہاندار شاہ ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء تا ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء

۳۔ فرخ سیر ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء

۴۔ رفیع الدرجات ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں صرف چھ ماہ حکمرانی کی۔

۵۔ رفیع الدولہ ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں صرف تین ماہ حکمراں رہے۔ اور وفات پائی۔

۶۔ نیکوسیر نے صرف چند روز حکومت کی۔

۷۔ ابوالفتح نصیر الدین روشن اختر محمد شاہ عرف رنگیلا ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں تخت نشین ہوئے۔

(۲) سادات بارہہ ابوالفرح کی اولاد سے تھے جو بغداد کے قریب شہر واسط کے رہنے والے تھے ان کا شجرہ نسب ستر ہویں پشت میں زید شہید کے واسطے سے حضرت علی سے ملتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں سید ابو الفرح اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ واسط کی سکونت ترک کر کے ہندوستان آئے اور صوبہ دہلی کی سرہند سرکار میں پٹیالی کے قریب اس خاندان کے لوگ آباد ہو گئے مغل تاریخ کے دو سید برادران حسن علی اور حسین علی اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع مظفر نگر کے قصبہ بارہہ کے باشندے تھے انھوں نے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی بیس سالہ دور میں ''بادشاہ گر'' کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ خاں تھا جس نے اورنگ زیب عالمگیر کے بخشی ممالک روح اللہ کے زیر نگرانی ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔ محمد شاہ نے ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں حسن علی خان کو قتل کروایا اور حسین علی خاں ۱۷۲۲ء / ۱۱۳۵ھ کے قریب محمد شاہ کے قید خانے میں مر گیا۔ (فقہائے ہند، جلد ۵، ص ۲۲)

محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷۱۹ء) کے زمانے میں صوبۂ الہ آباد کا ناظم چھبیلہ رام ناگر تھا۔ ناگر کی وفات کے بعد اس کے بھائی دیا بہادر کے بیٹے گردھر بہادر نے صوبۂ الہ آباد کی حکومت سنبھالی۔ جسے بعد میں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا، اور الہ آباد کو صوبہ اودھ میں شامل کرلیا گیا۔ اس بارے میں غلام حسین طباطبائی اپنی کتاب ''سیر المتأخرین'' میں اس طرح رقم طراز ہیں:

'' ... الحاصل وکیل گردھر باشتہار تعین افواج بر موکل خود استدعائے عفو تقصیر و اظہار اطاعت نمودہ امیدواری او دربحال داشتن صوبہ الہ آباد باعطا فرمودن صوبہ اودہ بالبعضے خطاب و مناصب و اقرار برآمدن از قلعہ الہ آباد بعد فراغ از مراسم تعزیت چھبیلہ رام ماہر ساختہ مہلت خواست مسؤلات او پذیرائی یافتہ فرمان صوبہ داری اودھ با دیگر عنایات و خطاب بہادری بنام گردھر صادر گردید'' (۱)

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اودھ اور خاص کر لکھنؤ کے قرب و جوار میں شیوخ اپنی طاقتوں کے بل پر کچھ زیادہ ہی غالب تھے۔ ان لوگوں نے ''مچھی بھون'' کے قلعہ پر اپنا قبضہ جمار کھا تھا دہلی سے جو بھی حاکم یا صوبہ دار آتا اس کی ہمت نہ تھی کہ ''مچھی بھون'' کے قریب بھی جاسکے۔ شیوخ نے یہاں دو مشہور عمارتیں ''مبارک محلا'' اور ''پنج محلا'' تعمیر کروائیں۔ ان کے جنوب میں ایک بڑا محراب نما پھاٹک تھا جو ''شیخن دروازہ'' کہلاتا تھا۔ چنانچہ جو لوگ ان عمارات میں جانا چاہتے تھے ''شیخن دروازہ'' سے ہوکر گزرتے تھے۔ اور اس ''دروازہ'' کے درمیان میں شیخ زادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی۔ ہر آنے جانے والے پر اس تلوار کو جھک کر سلام کرنا لازم تھا۔

غرض کہ شیخ زادوں کی زیادتیوں اور سختیوں سے تمام رعایا پریشان تھی۔ اس عہد میں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی طرف سے نواب سعادت خاں (۲) برہان الملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے ''شباب لکھنؤ'' کی عبارت کے مطابق:

---

(۱) سیر المتأخرین: جلد (۲) ص ۴۲۳

(۲) نام سید محمد امین خطاب نواب برھان الملک بہادر جنگ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد میر محمد نصیر نیشاپوری ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں ترک وطن کر کے ہندوستان آگئے تھے۔ نواب سعادت خاں نے اودھ کے نوابی خاندان کی بنیاد ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱ء میں ڈالی اور ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں وفات پائی۔

''برہان الملک کو صوبہ داری ملی اور اودھ کے سرکش و سرہنگ زمینداروں کی قلع قمع کرنے اور شیخ زارگان لکھنؤ کے مطیع و منقاد بنانے کی مہم سپرد کی گئی''(۱)

نواب برہان الملک کے عہد حکومت (۱۱۳۶ تا ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۲۱ تا ۱۷۳۹ء) میں صوبہ اودھ کے حدود کچھ اس طرح تھے کہ مشرق میں غازی پور، بنارس اور گورکھپور کے اضلاع سے لے کر مغرب میں بدایوں، بریلی، رامپور اور پیلی بھیت کے اضلاع شامل تھے جبکہ شمال میں اس خطہ کی سرحدیں نیپال سے ملحق تھیں اور جنوب میں دریائے جمنا اس سلطنت اور راجپوت و مراٹھا سلطنتوں کے درمیان حد فاصل تھا۔ اس وقت صوبہ اودھ کا کل رقبہ تقریباً ۲۳۲۳۳ میل کے قریب تھا۔(۲)

صوبۂ اودھ کا پہلا تمدنی مرکز فیض آباد تھا، جسکی بنیاد نواب برہان الملک نے اجودھیا کے قریب ڈالی تھی۔ پہلے پہل یہ جگہ ''بنگلہ'' کے نام سے مشہور ہوئی کیونکہ یہ نواب کی رہائش گاہ تھی۔ اودھ کے دوسرے فرماں روا نواب صفدر جنگ کے زمانے میں (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) میں اس آبادی کا نام فیض آباد پڑا۔

لکھنؤ اور فیض آباد کے علاوہ اودھ کے دوسرے تمام قصبات و قریات علم و ادب کے مراکز کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا الگ الگ مقام رکھتے ہیں۔ جائس، نصیر آباد، قنوج، جرول کنتورہ، نیوتنی، صفی پور، نیز الہ آباد کے مضافات میں غازی پور، بنارس، سلطان پور، رائے بریلی، پرتاپ گڑھ اور جونپور وغیرہ یہ سبھی مقامات ایسے ہیں، جن پر قلم اٹھانے کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہوگا۔ یہاں ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اودھ کے ان مشہور مقامات کا ایک ہلکا سا تعارف ہو جائے تاکہ آگے چل کر ان مقامات سے متعلق اہم شخصیات کو سمجھنے اور ان کے بارے میں جاننے میں مدد مل سکے۔

صوبۂ اودھ میں جو حکومت صحیح معنوں میں پوری طرح برسر اقتدار آئی تھی اس کا سلسلہ نواب سعادت خاں برہان الملک سے شروع ہو کر واجد علی شاہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دورِ اقتدار تقریباً ڈیڑھ سو برس (۱۱۳۴ تا ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۷۲۱ تا ۱۸۵۶ء) تک قائم رہا۔ اس درمیان گیارہ حکمراں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان میں شروع کے چھ حکمراں نواب وزیر کے خطاب سے اور آخری پانچ حکمراں بادشاہ کے

---

(۱) شباب لکھنؤ: ص ۶

(۲) شباب لکھنؤ: ص ۹

خطاب سے سرفراز ہوئے۔

ابتدائی تین حکمراں یعنی نواب برہان الملک، نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، لیکن اودھ کے چوتھے حکمراں نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو اپنا مسکن اور دارالسلطنت بنایا۔

نواب برہان الملک کا خاندانی تعلق نیشاپور (خراسان) کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔(۱) یہ ایک بہادر سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ہی منتظم اور مدبر بھی تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے شیخ زادگان پر غلبہ حاصل کر کے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ فوج درست کی اور دور دراز علاقوں پر گرفت مضبوط رکھنے کے لئے اجودھیا سے چار میل کے فاصلے پر دریائے گھاگرا کے کنارے بلند مقام پر رہائش گاہ اختیار کی۔ اس جگہ کو ایک قلعہ کی صورت دے دی گئی تھی، جس کے احاطہ میں متعدد پیدل، سوار، توپ خانے اور دوسرے دفاتر بھی موجود تھے۔

نواب نے اودھ کے سلطنتی نظام کو کسی قدر مستحکم بنانے کے بعد ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں انتقال کیا۔ نواب برہان الملک کے قائم مقام ان کے داماد اور بھانجے ابوالمنصور صفدر جنگ ہوئے۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں صوبہ الہ آباد بھی نواب صفدر جنگ کے سپرد ہوا جس میں جونپور کے علاقے بھی شامل تھے۔ غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ملاحظہ ہو:

''ودر اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ ہجری تسع وخمسین ومائۃ والف صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد''(۲)

نواب صفدر جنگ نے پانچ سال کے قیام کے دوران فیض آباد کو کافی ترقی دی۔ اس کے بعد انھیں بادشاہ دہلی محمد شاہ نے طلب کر لیا۔ جہاں ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ رہا۔ اس جنگ

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۲

(۲) مآثر الکرام: ص ۲۲۱

میں ابدالی کی شکست ہوئی (۱) اور نواب صفدر جنگ منصب وزارت پر مامور ہوئے ۔ اس درمیان نواب موصوف نے اودھ میں مہاراجہ نول رائے وفا کو اپنا نائب مقرر کر کے دہلی میں چند سال وزارت کے فرائض انجام دیئے۔

اس دوران نواب کا مقابلہ روہیلکھنڈ کے نواب احمد خاں بنگش سے بھی ہوا لیکن ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں صلح ہوگئی اور نواب واپس آگئے ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں نواب کا اودھ میں انتقال ہوگیا لاش کو دہلی لے جا کر دفنایا گیا اور ایک عالیشان مقبرہ بنوایا گیا۔

صفدر جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ (۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔ سیاسی اعتبار سے ان کا عہد بڑا پر آشوب تھا دو بڑی طاقتوں سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی جس میں احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ (۲) اور خود نواب ایک طرف تھے اور دوسری جانب مرہٹہ فوج تھی۔ اس جنگ میں مرہٹہ فوج کی طاقت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔

۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں دوسری خونریز جنگ بمقام بکسر ہوئی۔ (۳) اس جنگ میں نواب شجاع الدولہ، مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی (جلال الدین محمد) کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف شریک ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں کی فتح ہوئی اور وہ اودھ کے تمام علاقے پر قابض ہو گئے۔

۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء کے "صلح نامۂ الہ آباد" (۴) کی رو سے کانپور، فتح پور اور الہ آباد کے علاوہ اودھ کا باقی تمام حصہ کمپنی نے نواب کو واپس کر دیا۔ اس اقرار نامے کے ساتھ کہ نواب پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کو

---

(۱) احمد شاہ ابدالی افغانستان میں ہرات کا رہنے والا تھا اس نے ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء سے ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء تک نو بار ہندوستان پر حملے کیے۔ ۱۱۷۴-۷۵ھ/۱۷۶۰-۶۱ء میں اس نے جو حملہ کیا اس کا سبب خود ہند کے لوگوں کی دعوت تھی کیونکہ یہاں کے لوگ مرہٹہ قوم سے تنگ آچکے تھے۔ ابدالی کی وفات ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں ہوئی (اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ: ص ۹)

(۲) نجیب الدولہ روہیلکھنڈ کا افغان سردار تھا۔

(۳) تاریخ ہند: ص ۳۷۰

(۴) ایضاً، ص ۳۷۳

بطور تاوان جنگ ادا کریں گے۔ کمپنی نے نواب کو فوجی تحفظ دینے کا وعدہ بھی کیا جس کا خرچ نواب کے ذمہ تھا۔ کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع کمپنی نے شہنشاہ دہلی کے سپرد کئے۔ شہنشاہ دہلی نے کمپنی سے قطع تعلق کر کے یہ اضلاع مرہٹوں کے حوالے کر دیئے۔ کمپنی نے ان پر دوبارہ قبضہ کر کے یہ اضلاع نواب کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔

نواب شجاع الدولہ کے انتقال (۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء) کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔ ان کی تخت نشینی اودھ کی تاریخ میں ایک نئے دور کی ابتدا ہے۔ پہلے ملک گیری، فوجی استحکام اور بیرونی حکمت عملی مشاغل تھے لیکن بکسر کی جنگ میں شکست کے بعد ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء کے صلح نامے کے تحت ملک گیری اور بیرونی حکمت عملی کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اس صلح نامے کا پہلا شکار اودھ ہی ہوا۔ عہد نامے کی شرائط کے مطابق کمپنی سے مشورہ کیے بغیر دوسری ریاستوں سے باہمی روابط پیدا کرنا یا کسی بھی قسم کی گفت و شنید ممکن نہ تھی۔ فوج کا بڑھانا بھی صلح نامہ کی شرائط کے خلاف تھا۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے:

> ''آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) مسند نشین ہوا تو وارن ہیسٹنگز کی کونسل کی مخالفت اکثریت نے اس کا خراج دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیے ماہوار تک بڑھا دیا اور نئے نواب کو مجبور کیا کہ وہ بنارس جونپور اور غازی پور کے اضلاع کے شاہی حقوق مکمل طور پر کمپنی کے حق میں منتقل کر دے۔ ۱۷۸۱ء میں معاہدہ چنار کے موقع پر وارن ہیسٹنگز نے نواب کے نظام حکومت میں اصلاح کرنے اور انگریزی فوج کی تعداد صرف ایک بریگیڈ اور ایک پلٹن تک محدود کر دینے کی کوشش کی''۔(۱)

نواب آصف الدولہ نے تخت نشینی کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا اور دار الحکومت بنانے کے لئے فیض آباد پر لکھنؤ کو ترجیح دی۔ یہاں بھی انگریزوں کی دخل اندازی کا سلسلہ جاری رہا۔ عبد الحلیم شرر کا بیان ہے:

> ''بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربار اودھ میں دخل اندازی کے بہت سے حقوق حاصل کر لئے تھے۔ جن کی بنا پر یہاں فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ

---

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۳) ص ۵۱۸

غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اس کی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں''۔(۱)

لہذا اس عہد میں دوسرے علوم وفنون نے تو بہت ترقی کی لیکن سیاسی حالات حسب سابق بدستور رہے۔ معمولی خانہ جنگیوں کے علاوہ اس سلطنت نے کسی اہم جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد چند ماہ کے لئے ان کے منہ بولے بیٹے وزیر علی خاں بھی تخت نشین ہوئے۔ یہ کافی دلیر اور بہادر تھے انگریزوں نے چند ماہ کے اندر ان کی قوت عملی اور سیاسی شعور کا اندازہ کرلیا۔ چنانچہ انھیں جلد ہی معزول کر کے بنارس بھیج دیا گیا جہاں ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں بہ حالت قید وفات ہوئی۔ (۲)

نواب سعادت علی خاں آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی اور شجاع الدولہ کے بیٹے تھے ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں انگریزوں نے انہیں تخت نشین کروایا اور اس کے بدلے میں نصف اودھ پر قبضہ کرلیا۔ جس میں روہیلکھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، ایٹہ، اٹاوہ، بریلی، مراد آباد، بجنور، بدایوں، شاہ جہاں پور کے اضلاع، کانپور، فتح پور، بستی، گورکھپور، غازی پور، اور اعظم گڑھ وغیرہ اضلاع شامل تھے۔

۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں ''عہد نامہ بنارس'' (۳) پر نواب کو دستخط کرنے پڑے جس کی رو سے نواب کی بچی کھچی سلطنت مشرق میں جونپور اور سلطان پور سے لے کر مغرب میں لکھیم پور، کھیری اور شاہ آباد تک رہ گئی جس کی شمالی سرحدیں تو بدستور نیپال سے ملحق رہیں لیکن جنوبی حدیں دریائے جمنا سے سمٹ کر دریائے گنگا تک رہ گئیں۔

اس معاہدے میں دوسری اور دیگر شرائط بھی تھیں جس سے نواب کی فوجی طاقت اور بیرونی حکمت عملی بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ مثلاً نواب کی فوجوں کی تعداد برائے نام کردی۔ اور کمپنی نے اپنی بھاری فوج اودھ پر مسلط کردی جس کے تمام مصارف پورے کرنے کی ذمہ داری نواب پر ڈالی گئی۔ کسی بھی عہدہ کی

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۶۹

(۲) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۶

(۳) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۶۹

تقرری یا برطرفی کا معاملہ بھی کمپنی کی اجازت کے بغیر عمل میں نہ آتا۔ غرض کہ نواب کو کمپنی نے اپنا محکوم بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود نواب سعادت علی خاں نے اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھے۔ اور اپنے تدبر و ہوشیاری سے اودھ کی گرتی حالت کو سہارا دیتے رہے۔

۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء میں نواب موصوف کا انتقال ہوا (۱) اور ان کے بیٹے غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء میں کمپنی نے انھیں بادشاہ کے لقب سے سرفراز کیا۔ (۲) اور مختلف ذرائع سے کروڑوں روپیہ وصول کرتے رہے۔ اودھ کے حکمراں اسی میں خوش تھے کہ انھیں بادشاہ کا لقب حاصل ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے یہ حق صرف شہنشاہ دہلی کو حاصل تھا۔

کمپنی نے مغلیہ سلطنت کے وقار کو بالکل ہی ختم کرنے کے لئے اس قسم کی سیاسی چال چلی تھی تا کہ دہلی کے بادشاہ کے مدمقابل کسی صوبہ کے حکمراں کو بادشاہ بنا کر شہنشاہ دہلی کی ظاہری حیثیت بھی ختم کر ڈالیں۔ اودھ کے نواب اپنی سادہ لوحی کی بنا پر انگریز سرکار کی یہ چال سمجھ ہی نہ سکے کہ بادشاہت کا مقصد کمپنی کی شہنشاہیت کا مظاہرہ تھا نہ کہ شاہ اودھ کی حیثیت کو بڑھانا۔

مغلیہ سلطنت کی متزلزل حالت کی بنا پر سارا ہندوستان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا جہاں خودسر و خودمختار حکمراں فرمانروائی کر رہے تھے۔ رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کر دی تھی۔ اب شہنشاہ دہلی کے قبضہ میں صرف دہلی اور گردونواح کا علاقہ رہ گیا تھا۔

بادشاہ غازی الدین حیدر کے بعد ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ اس عہد تک کمپنی کا اثر و رسوخ اودھ میں کافی بڑھ چکا تھا۔ بادشاہ کو اندرونی، بیرونی کسی طرح کے سیاسی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ سارے معاملات کمپنی نے خود سنبھال لئے تھے۔ یوں بھی نواب آصف الدولہ کے عہد سے بیرونی حملوں پر بڑی حد تک کمپنی قابو پا چکی تھی۔ اس کے بعد سعادت علی خاں کے ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء کے صلح نامے کی رو سے اندرونی خطرات بھی ختم ہو چکے تھے لہذا اب اودھ کے بادشاہوں کے پاس عیش و عشرت کے ساتھ وقت گزارنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۸

(۲) تاریخ اودھ، جلد ۳: ص ۶۱

نہیں تھا۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ لاولد فوت ہوئے۔ چنانچہ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں نواب سعادت علی خاں کے تیسرے بیٹے محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ (۱)

ان کے عہد میں کمپنی سے ایک نیا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے کمپنی نے جو فوج اودھ کی نگہداشت کے لئے رکھی تھی اس کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ بادشاہ نے بادلِ ناخواستہ یہ معاہدہ قبول کیا۔ محمد علی شاہ اپنی عمر کے ساتھ کافی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہوئے انھوں نے کسی قدر یہاں کی بدنظمیاں دور کیں۔ ان کا انتظام عمدہ تھا جس سے کمپنی بھی خوش اور مطمئن تھی۔ مگر یہ پانچ سال سے زیادہ حکومت نہ کر سکے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں انتقال فرمایا۔ (۲)

ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے امجد علی شاہ مسند نشین ہوئے اور پانچ سال تک اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔ ان کے عہد میں کوئی خاص سیاسی واقعہ پیش نہیں آیا۔ حالات حسب سابق بدستور تھے۔

امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے واجد علی شاہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔ (۳) گذشتہ لکھنؤ کی عبارت ملاحظہ ہو:

> ''ان کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اس مرثیۂ باستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتزاع سلطنت انھیں کے عہد میں ہوا اس لئے تمام اہل الرائے کے ہدف سہام اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے اور قریب قریب تسلیم کرلیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے ان دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں اور بُری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا ... دہلی میں مغل شہنشاہی کا اور بنگالہ میں نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا؟ ... مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا حالانکہ انکی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی''۔ (۴)

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۹

(۲) ایضاً

(۳) سوانحات سلاطین اودھ، ص ۹

(۴) گزشتہ لکھنؤ، ص ۹۸

اس عہد تک کمپنی کا اقتدار دھیرے دھیرے پورے ہندوستان پر قائم ہو چکا تھا۔ اودھ کی بد انتظامی اور زبوں حالی روز بروز بڑھتی جارہی تھی جسکی خبریں ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کو برابر دی جارہی تھیں اور اس بدنظمی کا ذمہ دار سراسر شاہ اودھ کو قرار دیا جارہا تھا۔ اس درمیان لارڈ ھارڈنگ (۱)(Lord Harding) گورنر جنرل لکھنؤ آئے اور بادشاہ سے گفتگو کی، اور انھیں خبردار بھی کیا کہ اگر حکومت میں اسی طرح بدانتظامی کا دور دورہ رہا تو حکومت ان کے ہاتھوں سے لے لی جائے گی۔

۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں کرنل سلیمین (Col.Sleeman) نے تین ماہ کی مدت میں پورے صوبے کا دورہ کیا اور ایک رپورٹ تیار کی۔ (۲) اس دورہ کا اصل مقصد بادشاہ کے خلاف ایسے واقعات کا جمع کرنا تھا جن سے سلطنت کی ضبطی اور بادشاہ کی معزولی کے لئے ٹھوس ثبوت فراہم ہوسکیں۔ آخر کار یہ بات طے ہوگئی کہ اودھ کو انگریزی حکومت میں شامل کرلیا جائے دائرہ معارف لکھتا ہے:

''۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی (Dalhousie) نے اودھ کے صوبہ کا الحاق انگریزی علاقہ سے کرلیا'' (۳)

صفدر حسین اس دورے کی حیثیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

''حسب ارشادات گورنر جنرل یکم دسمبر ۱۸۴۹ء کو کرنل سلیمین (رزیڈنٹ) ملک اودھ کے خصوصی دورے پر روانہ ہوا تا کہ اودھ کی ضبطی کے لئے کچھ تاویلیں فراہم کرسکے۔ رزیڈنٹ کا یہ دورہ اس کے اختیارات کی حدود سے سراسر متجاوز تھا''۔ (۴)

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ معزول کئے گئے اور ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔ وہ بھی لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ لندن جاکر ملکۂ انگلستان کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کریں۔ لیکن طبیعت کی خرابی نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ چنانچہ انھوں نے عمر کا بقیہ حصہ کلکتہ میں ہی گزارا۔

---

(۱) لارڈ ھارڈنگ (اول) ہندوستان کے گیارہویں گورنر جنرل تھے ان کا دور ۱۲۶۰-۱۲۶۵ھ (۱۸۴۴-۱۸۴۸ء) ہے (تاریخ ہند: ص ۵۲۰)

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۹۱

(۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳: ص ۵۱۷

(۴) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۹۱

دوسری طرف ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں غدر(۱) کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔اس بغاوت کی شروعات میرٹھ سے ہوئی۔اور رفتہ رفتہ پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس درمیان واجد علی شاہ کو فورٹ ولیم کلکتہ میں قید رکھا گیا جہاں سے انھیں ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں رہائی ملی۔(۲)

اس دوران اودھ کے راجاؤں اور زمینداروں نے مل کر بادشاہ کے نابالغ بیٹے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بیٹھا دیا اور اس بات کی حتی الوسع کوشش کی کہ انگریزوں سے مقابلہ کریں اور معزول بادشاہ کو اس کی سلطنت واپس دلوائیں۔انھوں نے ایک مجلس نیابت بھی قائم کی جو برجیس قدر کے نام سے امور سلطنت انجام دے رہی تھی۔یہ سلسلہ تقریباً ۹ ماہ تک چلتا رہا اس کے بعد کمپنی کی فوجوں نے لکھنؤ پر اپنا قبضہ کرلیا۔برجیس قدر اور انکی والدہ حضرت محل کو لکھنؤ سے نیپال بھیج دیا گیا۔(۳)

۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں غدر فرو ہونے کے بعد انگریزی حکومت کا اودھ پر پوری طرح تسلط ہوگیا۔ لارڈ کیننگ (Lord Canning) (۴) نے اپنی رائے اور فرہنگ سے اودھ کا انتظام درست کیا۔

یوں تو حکومت اودھ کا خاتمہ بہت پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھوں ہوجاتا لیکن اقتدار ہاتھ میں لینے کے باوجود انگریزوں نے مصلحتاً اس حصہ پر دست اندازی نہیں کی اول تو انھیں اہل یورپ کی انگشت نمائی کا ڈر تھا دوسرے سکھوں کا بھی خوف غالب تھا۔کیونکہ اودھ کا علاقہ اس وقت ایک بفر اسٹیٹ (Buffer State) کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں جب سکھوں کا ملک پنجاب انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے ہندوستان کے سب سے بڑے زرخیز علاقے پر اپنا تصرف حاصل کرلیا۔

۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ نے کلکتہ کے مٹیا برج میں انتقال فرمایا۔ اس طرح اودھ کے

---

(۱) تاریخ لکھنؤ:ص ۱۶۲

(۲) سلطان عالم واجد علی شاہ:ص ۹۸

(۳) گذشتہ لکھنؤ:ص ۱۲۱

(۴) لارڈ کیننگ (Lord Canning) ہندوستان کا تیرہواں اور آخری گورنر جنرل تھا اسکا دور ۱۲۷۳-۱۲۷۹ھ (۱۸۵۶-۱۸۶۲ء) ہے۔

۱۳۹ سالہ دور حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اودھ کے الحاق کے بعد اس کا انتظام ایک چینی کمشنر کے سپرد ہوا۔(۱)

دوسرے طرف بیگم حضرت محل ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء میں نیپال کی سرزمین میں پیوند خاک ہوئیں۔(۲) واجد علی شاہ کے انتقال کی خبر پا کر برجیس قدر کلکتہ واپس آ گئے۔ آنے کے کچھ عرصہ بعد ان کا بھی کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔

۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں آگرہ اور اودھ دونوں صوبوں کو ایک ہی نظام کے ماتحت کر دیا گیا۔ ان صوبوں کے حاکم کو لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبجات و چیف کمشنر اودھ کہتے تھے۔(۳) ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں صوبہ جات متحدہ کے قیام پر چیف کمشنر کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں اس صوبے کو گورنر کے صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ تقسیم برصغیر کے بعد سے یہ صوبہ اتر پردیش کا حصہ ہے۔(۴)

الحاق کے بعد اس علاقے کے پہلے بندوبست کے موقع پر یہاں کے بڑے بڑے تعلقداروں کا پوری طرح خیال نہ رکھا گیا۔ ان میں سے کئی ایک کو ان کی جاگیروں سے بھی بے دخل کر دیا گیا لیکن جنگ آزادی کے بعد لارڈ کیننگ (۵) (Lord Canning) نے دوبارہ تعلقہ داری بندوبست کا طریقہ اختیار کیا۔ اسناد عطا کر کے یہاں کے تعلقداروں کے حقوق کی توثیق کر دی۔

یہاں کی مسلم آبادیاں بیشتر شہروں کی جانب ہیں، اگرچہ آبادی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہے۔

---

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ، ص ۹۸

(۲) گزشتہ لکھنؤ: ص ۱۲۱

(۳) دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳، ص ۵۱۹

(۴) اتر پردیش کا نام اسے ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۰ء میں دیا گیا۔ دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۵: ص ۵۱۹

(۵) لارڈ کیننگ ہندوستان کا پہلا وائسرائے (۱۲۷۴۔۱۲۷۹ھ / ۱۸۵۷۔۱۸۶۲ء) ہے۔

باب دوم

نوابین اور شاہان اودھ

(مختصر سوانحی خاکے)

نقشہ سلاطین اودھ از سنہ جلوس تا سنہ وفات اور مقام سلطنت و کیفیت

نمبر شمار	نام فرمانروا	سنہ جلوس	سنہ وفات	مقام حکومت	مدت حکومت و کیفیت
۱۔	سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک بہادر جنگ	۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء	۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء	فیض آباد	سترہ سال حکومت کی
۲۔	مرزا مقیم ابوالمنصور صفدر جنگ	۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء	۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء	فیض آباد	پندرہ سال حکومت کی
۳۔	جلال الدین حیدر شجاع الدولہ وزیر الممالک ھزبر جنگ	۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء	۱۱۸۸ھ ۱۷۷۵ء	فیض آباد	اکیس سال حکومت کی
۴۔	مرزا یحییٰ آصف الدولہ وزیر الممالک رستم جنگ	۱۱۸۸ھ ۱۷۷۵ء	۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء	لکھنؤ	بائیس سال حکومت کی

۵۔	مرزا وزیر علی خاں بہادر	۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء	۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء	لکھنؤ	چار ماہ فرمانروائی کر کے بنارس روانہ ہوئے
۶۔	سعادت علی خاں یمین السلطنت	۱۲۱۲ھ ۱۷۹۸ء	۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء	لکھنؤ	سولہ سال حکمراں رہے
۷۔	غازی الدین حیدر شاہ زمن	۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء	۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء	لکھنؤ	تیرہ سال حکمرانی کی
۸۔	نصیر الدین حیدر سلیمان جاہ	۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء	۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء	لکھنؤ	دس سال فرمانروا رہے
۹۔	مرزا فریدون بخش منا جان	۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء	۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵	لکھنؤ	چند گھنٹے حکومت کرنے کے بعد چنار گڑھ روانہ ہوئے
۱۰۔	محمد علی شاہ ابوالفتح معین الدین	۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء	۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء	لکھنؤ	پانچ سال حکومت کی
۱۱۔	امجد علی شاہ ابوالظفر مصلح الدین ثریا جاہ	۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء	۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء	لکھنؤ	پانچ سال حکومت کی
۱۲۔	واجد علی شاہ اختر سلطان عالم	۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء	۱۳۰۵ھ ۱۸۸۷ء	لکھنؤ	نو سال حکومت کی اور کلکتہ روانہ ہوئے
۱۳۔	مرزا برجیس قدر (۱)	۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء	نامعلوم	بہرائچ	نیپال روانہ ہوئے آٹھ ماہ حکومت کی کلکتہ میں انتقال کیا۔

---

(۱) مرزا برجیس قدر گیارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور آٹھ ماہ گیارہ دن حکومت کی۔

سلاطین اودھ کی فہرست میں تیرہ فرمانرواؤں کے نام شامل ہیں لیکن ان میں سے صرف گیارہ فرمانروا ایسے تھے جنھیں صحیح معنوں میں اپنے عہد حکومت مین کچھ کر دکھانے کا موقع حاصل ہوا۔ منا جان اور مرزا برجیس قدر کو بیشتر مؤرخین نے سلاطین اودھ کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منا جان کی حکومت محض چند گھنٹوں کی تھی۔ اور مرزا برجیس قدر کو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اراکین سلطنت نے تخت پر بٹھایا تھا۔ جسے انگریز کمپنی نے تسلیم نہیں کیا۔

گیارہ فرمانرواؤں میں سے شروع کے چھ فرمانروا نواب وزیر کے خطاب وعہدہ سے موسوم تھے اور آخری پانچ حکمراں بادشاہ کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

نواب سعادت خاں برہان الملک

اہل ایران اپنی ذہانت، شائستگی، نفاست اور علم وفضل کے لئے مشہور رہے ہیں۔ عہد مغلیہ میں ایران سے ہندوستان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اس وقت ہندوستان کی درباری زبان بھی فارسی تھی چنانچہ ایرانیوں کا اثر ورسوخ ہندوستانی درباروں میں کافی بڑھ گیا تھا، انھیں وزیر السلطنت اور بخشی الملک کے دفاتر میں بہ آسانی جگہیں مل جاتی تھیں۔ سید محمد امین نیشاپوری بھی انہی ایرانی نوواردوں میں سے ایک تھے۔ جنکا خاندانی تعلق ایران کے ''شاہان صفویہ'' سے تھا۔(۱)

سید محمد امین عرف نواب سعادت خاں برہان الملک ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے اودھ کے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ ان کے والد مرزا نصیر، حضرت امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ شاہ عالم (اول) بہادر کے آغاز سلطنت ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں اپنے بڑے صاحبزادے میر محمد باقر کے ہمراہ ہندوستان آئے اور بنگال کے ضلع عظیم آباد (۲) میں ناظم بنگال نواب شجاع الدولہ کی رفاقت میں رہنے لگے۔

نواب سعادت خاں کی ولادت نیشاپور (خراسان) میں ہوئی۔ ان کا سال تولد کسی تذکرے سے معلوم نہ ہوسکا انکی کچھ خاندانی رنجشیں تھیں جن کی وجہ سے یہ رنجیدہ ہوکر وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ نیشاپور سے سیدھے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں کے شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کیا۔

والد کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی میر محمد باقر کے ساتھ دہلی آئے اور کچھ دنوں بعد دہلی سے گجرات روانہ ہوئے۔ گجرات کے صوبہ دار نواب سربلند خاں (متوفی ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء)

---

(۱) صفوی حکومت کی بنیاد شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۹۰۶-۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء میں رکھی تھی۔ شاہان صفویہ کے اندر علم دوستی اور اہل علم وارباب کمال کی قدر ومنزلت کا بھی جذبہ موجود تھا (شعرالعجم (جلد ۵) ص ۵۷

(۲) ۱۱۳۸-۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں صوبہ بہار کو بنگال میں شامل کرلیا گیا اور یہاں کے صوبے دار نواب شجاع الدولہ شجاع الدین محمد خان نے مرشد آباد آکر مسند امارت پر جلوس کیا۔ (تاریخ مگدھ: ص ۲۹۹)

کے یہاں ''میر منزلی'' کا عہدہ حاصل کیا۔(۱)

کچھ عرصہ بعد دہلی آنا ہوا یہاں فرخ سیر (۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء) کے عہد میں ان کے دیوان راجہ رتن چند اور وزیر عبداللہ خان قطب الملک سے تعلقات استوار کئے۔ عبداللہ خان کے توسط سے نواب سعادت کو ایسا عروج حاصل ہوا کہ پہلے شہزادوں کی جاگیر کا عہدہ ملا۔ اس کے بعد ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری سے سرفراز ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا درجہ مزید بلند ہوا، اور اکبرآباد کی صوبہ داری پر مامور ہوئے۔ غلام حسین طباطبائی لکھتے ہیں:

> ''میر محمد امین معروف بہ سعادت خاں خراسانی کہ در عہد فرخ سیر اول منصب ھزاری یافتہ بعدہ بہ فوجداری ہندون بیانہ کہ از محالات عمدہ اکبرآباد است مامور گشتہ وسپاہ نگاہ داشتہ بہ استمداد از سید عبداللہ خاں تادیب سرکشان آن جا نمودہ باضافۂ پانصدی سرفراز واز جملۂ مشاہیر دربار وصاحب نام واعتبار گشتہ درین سفر ھمراہ لشکر بادشاھی بود۔ محمد امین خاں اورا ہمدم وھمراز خود ساخت'' (۲)

فرخ سیر کا عہد (۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۱۹ء) نواب سعادت خاں کے لئے کافی سازگار ثابت ہوا ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸-۱۷۱۹ء) میں اکبرآباد کے حاکم کی حیثیت سے انھوں نے وہاں کے سرکشوں اور مفسدوں کا کام تمام کیا، جس کے نتیجہ میں ان کے منصب میں پانصدی کا اضافہ ہوا۔ فرخ سیر کے انتقال کے بعد محمد شاہ کے آغاز حکومت (۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۱۹ء) میں منصب ہفت ہزاری پر مامور ہوئے۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ محمد شاہ اپنے دو امرائے سلطنت یعنی سید حسین خاں امیر الامراء اور سید عبداللہ خان (سادات بارہہ) کے نامعقول طرز عمل سے انتہائی پریشان تھے۔ نواب سعادت خاں نے حسین علی خان کو ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں بیانہ کے مقام پر قتل کروادیا اور عبداللہ خاں کو قید کرلیا۔ نواب موصوف کے ان غیر معمولی کارناموں کو دیکھ کر محمد شاہ بہت خوش ہوئے اور سادات کے قاتلوں کو انعامات تقسیم کئے۔ جن میں نواب سعادت کو پانچ ہزار سواروں کا منصب ملا ساتھ ہی سعادت خاں ''برہان الملک بہادر جنگ''

---

(۱) یہ عہدہ سرکاری خیموں سے متعلق اہتمام وانتظام کا تھا۔

(۲) سیر المتاخرین (جلد ۱) ص ۱۱۰

کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ وزیر السلطنت محمد امین کے انتقال کے بعد محمد شاہ بادشاہ نے نواب سعادت خاں کو آگرہ کی صوبیداری عطا کی۔ دو سال کے اندر انھیں اودھ کا صوبہ بھی دیدیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد نواب کے پاس صرف صوبۂ اودھ ہی باقی رہا۔

صوبۂ اودھ میں اس وقت بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ پورے صوبہ میں نیم آزاد جاگیرداری کا طریقہ رائج تھا۔ زمینداروں نے دور افتادہ دیہاتوں میں اپنی اپنی گڑھیاں (۱) بنا رکھی تھیں جہاں وہ اپنی حفاظت کے لئے حسب حیثیت اسلحہ اور بہت سے پیادے سپاہی جمع کر رکھے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔

دوسرے یہاں کے شیوخ تھے جو ہر لمحہ بغاوتیں کرنے پر آمادہ رہتے تھے اور کسی بھی ناظم یا حکمراں کی حکومت کو یہاں مستحکم ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ قیصر التواریخ کا مورخ لکھتا ہے:

''یہاں ایک مدت سے خاندان شیخ عبدالرحیم قابض و متصرف تھا'' (۲)

شیخ عبدالرحیم بجنوری (۳) کی نسل یہاں اکبر کے عہد سے آباد تھی۔ اس وقت شہر لکھنؤ اور اس کے مضافات میں بیسواڑہ، بلرام پور، تلوئی، پرتاپ گڑھ، گونڈہ اور رسول پور وغیرہ انہی شیخ زادوں کی ملکیت تھے۔ ان کے حدود میں ان کی مرضی کے خلاف داخلہ خطرے سے خالی نہ تھا۔

نواب سعادت خاں صوبہ دار کی حیثیت سے جب اودھ کی جانب روانہ ہوئے تو سب سے پہلے لکھنؤ کا رخ کیا۔ فرخ آباد کے بنگش نواب محمد خاں نے انھیں اودھ کے حالات اور شیخ زارگان لکھنؤ کے طور طریقوں سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھا۔ نواب سعادت لکھنؤ کے بجائے براہ راست کاکوری پہنچے وہاں سے منظم طور پر فوج لے کر لکھنؤ کے شیخن دروازہ پہنچے اور وہ تلوار جو شیخن دروازہ کے درمیان

---

(۱) فوجی چھاؤنیاں

(۲) قیصر التواریخ: ص ۴۰

(۳) شیخ عبدالرحیم بجنور کا رہنے والا تھا اکبر کے زمانے میں شاہ جہاں آباد دہلی میں ملازم ہوا ترقی کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچا اور وہاں اپنا اطمینان بخش بندوبست کیا۔ پانچ محل اپنی بیویوں کے واسطے بنوائے جو 'پنچ محلہ' کے نام سے مشہور ہوئے۔ گومتی کے کنارے مچھی بھون کا قلعہ تعمیر کروایا۔ مشہور ہے کہ اس قلعہ کے مکان میں چھبیس دروازے تھے ہر دروازے پر دو دو مچھلیاں بنوائی تھیں اس لئے اس قلعہ کا نام مچھی بھون پڑ گیا۔

لٹکتی تھی کاٹ کر پھینک دی۔ باقر شمس کا بیان ہے:

''لکھنؤ ایک سرکش صوبہ تھا، شیخوں کی شورہ پشتی مشہور تھی شیخن دروازہ میں ایک تلوار لٹکا رکھی تھی، دہلی سے جو صوبہ دار آتا اس کو سر جھکا کے جانا پڑتا اس طرح وہ اس سے سلامی لیتے تھے''(۱)

نواب سعادت نے بڑے تدبّر اور حکمت عملی کے ساتھ ''مچھی بھون'' کے قلعہ پر اپنا تصرف قائم کرلیا اس فتح کی شہرت دور دور پہنچی اور امراء، جاگیردار و زمیندار ایک ایک کر کے سر تسلیم خم کرنے لگے۔ نواب نے بھی انکے مقبوضہ علاقے و جاگیریں اس وعدے کے ساتھ انکے سپرد کردیں کہ مالگزاری کی معینہ رقم باقاعدگی کے ساتھ وقت مقررہ پر ادا کرتے رہیں گے۔ ان میں سے جن زمینداروں نے سرتابی کی کوشش کی انھیں نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح آہستہ آہستہ تمام علاقے کا انتظام درست ہوتا گیا۔ یہاں کی آمدنی پہلے ۷۰ لاکھ کے قریب تھی جو نواب کے حسن انتظام کی بدولت دو کروڑ سالانہ تک پہنچ گئی تھی۔ غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''زمینداران صوبۂ اودھ در شیوۂ سرکشی علم روزگار اند و شاید از ابتدائے ایجاد عالم ہیچ حاکم را اطاعت قرار واقع نہ کردہ باشند برھان الملک ہمہ را بضرب شمشیر مطیع و باجگزار ساخت و نقش عملی کہ در ہیچ عصر نشان نمی دھند دراں صوبہ نشانہ و اکثر بلاد عمدۂ صوبہ الہ آباد مثل جونپور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑا جہاں آباد وغیرہ بزور بازو گرفت و از حضور بادشاھی سند حاصل کرد''(۲)

ریاست کا دار الخلافہ بنانے کے لئے نواب نے اجودھیا سے چار میل کے فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک بلند مقام پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ انتظامی امور میں مصروفیت کی بنا پر عالیشان عمارتیں بنانے کی انھیں کبھی فرصت ہی نہ ملی۔ چنانچہ ایک زمانے تک انھوں نے خیموں اور چھپّر کے مکانات میں گزر بسر کی۔ البتہ چھپّر کے چاروں طرف ایک کچی دیوار کھڑی کر کے اسے قلعہ کی صورت ضرور دیدی تھی۔ اندرونی احاطہ میں اتنی وسعت ضرور رکھی تھی کہ متعدد سوار، پیدل، توپ خانہ، اصطبل اور

---

(۱) تاریخ لکھنؤ: ص ۳۴

(۲) خزانۂ عامرہ: ص ۷۴

دوسرے دفاتر بہ آسانی سما سکیں۔ آگے چل کر یہ جگہ ''بنگلہ'' (۱) کے نام سے مشہور ہوئی۔

نواب سعادت خاں نے اپنے صوبہ میں ایک آزاد سلطنت کی بنیاد ڈالی اس راستے میں حائل ہونے والے تمام مخالف عناصر کو ہٹا کر ہر طرح سے امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اور سترہ سال کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ مرنے کے بعد ''خلد آشیاں'' کا خطاب پایا۔ (۲)

نواب سعادت نیشاپور کے مشہور رئیس میر محمد یوسف کی بیٹی سے منسوب تھے۔ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف پانچ بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم کا عقد نواب نے اپنے بھانجے مرزا مقیم سے کیا، اس کے علاوہ اودھ کی نائب صوبہ داری اور ''ابوالمنصور'' کا خطاب بھی دلوایا۔ آگے چل کر یہی مرزا مقیم نواب کے جانشین قرار پائے۔

۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اودھ سے شاہی فوج کی امداد طلب کی۔ اس سلسلہ میں نواب سعادت خاں دہلی آئے۔ اور یہیں وفات پائی۔ سیر المتاخرین کی عبارت ہے:

''برہان الملک بعد چندی از مرض سرطان ودیعت حیات سپرد'' (۳)

---

(۱) نواب صفدر جنگ کے عہد میں ''بنگلہ'' فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔

(۲) تاریخ نادر العصر: ص ۵۴

(۳) سیر المتاخرین (جلد ۱) ص ۱۶۱

نواب ابوالمنصور صفدر جنگ

نواب مرزا مقیم ابوالمنصور صفدر جنگ کی پیدائش نیشاپور (خراسان) میں ہوئی۔ ان کے والد جعفر بیگ تھے اور والدہ آمنہ بیگم، جو نواب سعادت خاں برہان الملک کی سگی بڑی بہن تھیں۔ چھ ماہ کی عمر میں مرزا مقیم ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تو انکی خالہ نے انکی پرورش شروع کی۔ اس طرح انکی عمر کا ابتدائی حصہ بڑی پریشانیوں میں گزرا۔ بڑے ہونے پر انکے ماموں نواب سعادت خاں نے ہندوستان بلا لیا اور اپنی بیٹی صدر جہاں سے منسوب کیا ساتھ ہی نائب السلطنت کا عہدہ بھی بخشا۔ (۱)

نواب صفدر جنگ نے پندرہ سال ایران کی اعلیٰ درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد تقریباً اتنا ہی عرصہ نواب کے زیر سایہ نیابت کا کام انجام دیتے رہے، درباری امور کی تمام تربیت نواب سعادت خاں سے حاصل کی ان کارناموں کی بدولت وہ اودھ کے طرز انتظام اور مقامی حالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔

نواب سعادت خاں کی وفات کے بعد انکی جانشینی کے سلسلہ میں دو دعویدار کھڑے ہوئے۔ پہلے شیر جنگ تھے جو نواب موصوف کے بھتیجے تھے۔ (۲) اور دوسرے ابوالمنصور صفدر جنگ جو نواب کے بھانجے اور داماد دونوں تھے۔ اس کے علاوہ نواب کے زمانے میں نائب بھی رہ چکے تھے۔ لہذا فتح انھیں ہی نصیب ہوئی۔ تاریخ مسند نشینی نجم الغنی خاں نے یوں بیان کی ہے (۳)

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۲۱

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۴۵

(۳) تاریخ اودھ (جلد ۱) ص ۹۵

سعادت خاں چوشد مخلود جنت　　فشرد اختر(۱) نگر ہول بحسرت

ابو المنصور خاں وقتیکہ مامور　　بجائش شد مع الخیر و سعادت

فروغ تازہ تر اختر نگر یافت　　زنور نظم و نسق ماہ طلعت

زتاریخ جلوسش ھاتف غیب　　رقم کردہ "زھے زیبائے خلعت"

۱ ۱ ۵ ۲

تخت نشینی کے بعد ابتدائی پانچ چھ سال بڑے انہماک و مصروفیت کے گزرے۔ نواب صفدر جنگ کے حسن انتظام اور عدل وانصاف کی وجہ سے ملک میں ترقی و خوشحالی چھا گئی۔ فوج میں ترتیب و تنظیم اور بہترین اسلحہ کی مدد سے فوجی قوت بھی مستحکم کی۔ وہ جگہ جو نواب سعادت کے عہد میں بنگلہ کے نام سے مشہور تھی اسکی از سر نو تعمیر کروائی آس پاس خوشنما باغ اور تفریح گاہیں بنوائیں اور بنگلہ کو "فیض آباد" کا نام دیا۔ (۲) شہر لکھنؤ سے تین میل کی دوری پر جلال آباد میں قلعہ تعمیر کروایا۔ شیخ زادوں کو الگ سے زمینیں دی گئیں۔ مچھی بھون کو نئے سرے سے درست کیا اور اس کے سامنے گومتی پر پل بنوایا۔

ابھی نواب صفدر جنگ ان کاموں میں مصروف ہی تھے کہ ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء میں محمد شاہ بادشاہ نے دہلی بلا کر انھیں "میر آتش" کا عہدہ بخشا ساتھ ہی کشمیر کی صوبہ داری بھی عنایت فرمائی جہاں نواب نے شیر جنگ (۳) کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیا۔ دہلی میں نواب صفدر جنگ تقریباً پانچ سال وزیر سلطنت رہے۔ اس درمیان اودھ میں ان کے جانشین (نائب) راجہ نوال رائے تھے۔

فرخ آباد کے بنگش پٹھانوں سے مقابلے کے دوران ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء میں نوال رائے کا انتقال ہو گیا۔ نواب صفدر جنگ کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو وہ سورج مل جاٹ (۴) کو ساتھ لے کر دہلی سے روانہ ہوئے لیکن ناکام رہے اس درمیان احمد خاں بنگش نے اپنے بیٹے محمود خاں کو اودھ پر قبضہ کرنے کے

---

(۱) بعض قدیم تاریخوں میں اودھ کا نام اختر نگر بھی ملتا ہے شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں ۱۷ پرگنے تھے ۱۷ نگر سے اختر نگر بن گیا۔

(۲) گذشتہ لکھنؤ: ص ۴۳

(۳) نثار محمد خاں بہادر شیر جنگ پسر سیادت خاں برادر سعادت خاں برہان الملک

(۴) سردار بھرت پور

لئے روانہ کیا لیکن وہ بلگرام پہنچ کر ناکام رہا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں بھی نواب کے ایک سردار نے فوج اور شہریوں کی مدد سے پٹھانوں کو شکست دی۔ خود نواب نے مرہٹوں اور جاٹوں کو اکٹھا کیا اور بنگش پٹھانوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ آخر کار بنگش اور روہیلے سردار فتح گڑھ کے مقام پر شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد نواب نے بھی اپنے عہدۂ وزارت سے علیحدگی اختیار کی اور اودھ واپس آ گئے ''سیر المتاخرین'' سے اس عہد کے حالات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے :

''وزیر الممالک صفدر جنگ کہ از مدتھا اجتماع واقتدار افاغنہ دران دیار کہ جوار صوبہ او بود نمی پسندید او اخر عہد محمد شاہ چنانچہ گذشت داعیۂ استیصال ایشان نمودہ پادشاہ را بر سر روھیلۂ مذکور برد اما از نفاق قمر الدین خان وزیر کار او خاطر خواہ صفدر جنگ بانجام نرسید در ینولا کہ خود وزیر وظہیر سلطنت وعلی محمد خان رہ پسر محمد خان بنگش را دلالت بانتزاع ملک روھیلۂ مذکور از دست اولاد واتباع او نمود بملاحظۂ آنکہ ہر طرف شکست افتد فائدہ درستی خواہد داد قائم خان چشم طمع بملک ومال اختلاف علی محمد خاں دوختہ آنہار ادر قلعۂ بداؤں محصور ساخت ••• ''(۱)

اودھ واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں مہدی گھاٹ کے مقام پر نواب کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لئے ان کی لاش فیض آباد کے گلاب باڑی میں بطور امانت دفن کی گئی۔ اس کے بعد دہلی لائی گئی۔ ان کا مقبرہ (۲) درگاہ شاہ مرداں سے متصل ایک شاندار عمارت میں ہے۔ سیر المتاخرین کے الفاظ میں:

''صفدر جنگ بصوبۂ خود رسیدہ بر مہدی گھاٹ اقامت نمود ومکانی برائے خود آراستہ باصلاح حال سپاہ واسباب پرداخت درتہیۂ افزائش استعداد مواد اقتدار خود مشغول بود کہ ناگھان دانۂ بر پای او بزور نمودہ آہستہ آہستہ اشتداد یافت وفجر بمادہ سرطانی گردید ہر چند اطباء جراحان باصلاح آن کوشیدند سودی نہ بخشیدہ درسال مذکور وہفتد ہم ذی الحجہ رھگوائے عالم بقا گردید ونعش اورا پہلوئے حضرت شاہ مردان کہ در دہلی است نقل نمودہ مدفون ساختند''(۳)

---

(۱) سیر المتاخرین (جلد سوم) ص ۸۷۴

(۲) مقبرہ کی تعمیر میں تین لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ مقبرے میں یہ تاریخ کندہ ہے:۔

چو آن صفدر عرصہ مردی — زوار فنا گشت رحلت گزیں

چنین سال تاریخ او شد رقم — کہ بادا مقیم بہشت بریں

(۳) سیر المتاخرین (جلد ۳) ص ۸۹۴

نواب شجاع الدولہ بہادر وزیر الممالک ھز بر جنگ

نواب کا اصلی نام جلال الدین محمد مرزا تھا۔ یہ نواب صفدر جنگ کے بیٹے اور نواب برہان الملک کے نواسے تھے ۔ ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت درج ذیل شعر سے برآمد ہوتی ہے:

بدولت خانۂ نواب منصور برآمد آفتاب از مطلع نور (۱)

ابتدائی عمر جو شہزادگی کا زمانہ تھا بڑی شان سے بسر ہوئی ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء میں موتمن الدولہ اسحاق خاں کی بیٹی امتہ الزہرا بیگم خطاب جناب عالیہ بہو بیگم سے بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد تقریباً ۲۳ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

سیاسی اعتبار سے نواب شجاع الدولہ کا عہد انقلابات اور فتنوں سے بھرپور ہے۔ شروع میں چھوٹی موٹی بغاتوں کا سامنا رہا مثلاً بنارس کے راجہ بلونت سنگھ کی بغاوت کو دبایا۔ ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۹ء میں مرہٹوں (۲) کے سردار گووند پنتھ کو چاند پور میں شکست دی۔ اس وقت مرہٹوں کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ شمالی ہندوستان کی روہیلہ (۳) حکومت کو ختم کرنے کے لئے مرہٹے یورش کر رہے تھے۔ ان مرہٹوں کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ایران کے احمد شاہ ابدالی آگے بڑھے۔ نواب شجاع الدولہ نے بھی احمد شاہ کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کا مقابلہ پانی پت کے میدان میں ہوا (۴) اس لڑائی میں مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انکی فوجی طاقت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد ۲): ص ۲ مندرجہ بالا قطعہ رائے سنگھ بیدار نے کہا تھا۔

(۲) مرہٹہ مہاراشٹر میں بسنے والے لوگوں کی قوم ہے۔ یہ مرہٹے جنوبی ہندوستان میں مسلمان ریاستوں میں فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ (دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۲۰) ص ۴۸۶)

(۳) روہیلہ، روہیلکھنڈ میں رہنے والے افغان سرداروں کی قوم ہے۔ یہ خطہ اودھ کے شمال و مغرب میں واقع ہے سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد افغانوں نے وہاں اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ (تاریخ ہند: ص ۳۸۴)

(۴) سیر المتاخرین: (جلد ۳) ص ۹۱۶

اس فتح کے صلہ میں احمد شاہ ابدالی نے نواب کو دہلی سلطنت کا وزیر مقرر کر دیا۔ احسن التواریخ کے الفاظ میں:

''سولھویں تاریخ شہر ذی قعدہ ۱۱۷۴ھ کو باریاب ملازمت شاہ عالم بادشاہ دہلی ہو کر نامزد بوزیر ہوئے''(۱)

دہلی میں اس وقت عالمگیر ثانی (۲) کی حکومت تھی جس کو اس کے ظالم وزیر غازی الدین نے قتل کروا دیا تھا، کئی دنوں تک ہنگامہ برپا رہا آخر کار ولی عہد گوہر شاہ عالم ثانی (۳) کو تخت پر بیٹھایا گیا اور وزارت کا عہدہ نواب شجاع الدولہ نے سنبھالا۔

۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء میں بکسر کی خونریز جنگ ہوئی (۴) جس میں نواب شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کے ساتھ مل کر انگریز فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کو فتح یابی حاصل ہوئی اور نواب شکست کھا کر بریلی و فرخ آباد کی طرف چلے گئے۔ مرہٹوں کی امداد حاصل کی اور ایک بار پھر انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے۔ لیکن اس بار بھی شکست فاش ہوئی مجبور ہو کر نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی۔

ربیع الاول ۱۱۷۹ھ (اگست ۱۷۶۵ء) میں صلح نامہ مرتب ہوا (۵) جس میں نواب اور انگریزوں کے درمیان دائمی امن اور مضبوط اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ اس صلح نامہ میں طے کی گئی شرائط کے مطابق کمپنی نے اودھ کا تمام علاقہ جس پر کہ وہ قبضہ کر چکی تھی نواب شجاع الدولہ کو واپس کر دیا لیکن الہ آباد اور کوڑہ کے اضلاع نواب سے لے کر شاہ عالم ثانی کو دیدیئے اس کے علاوہ کمپنی نے نواب سے پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ کے طور پر وصول کیا۔ اور چنار گڑھ کے قلعہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

اس صلح نامے سے اودھ کے سیاسی معاملات تو طے ہو گئے لیکن کمپنی کے مطالبات دن بدن بڑھتے گئے اس درمیان نواب نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ فیض آباد میں مستقل سکونت اختیار کی، فوجی انتظامات درست کیے۔ نئی فوج بھرتی کی جسے مغربی طرز پر تربیت دی گئی، انگریزی طرز کی چھاؤنیاں بنوائیں۔

---

(۱) احسن التواریخ: ص ۴۹

(۲) ابو العادل عزیز الدین محمد عالمگیر ثانی (۱۱۶۷-۱۱۷۲ھ مطابق ۱۷۵۴-۱۷۵۹ء)

(۳) مرزا عبداللہ عالی گوہر شاہ عالم ثانی (۱۱۷۲-۱۲۲۱ھ مطابق ۱۷۵۹-۱۸۰۶ء)

(۴) تاریخ اودھ (جلد ۲): ص ۲۳

(۵) سیر المتاخرین (جلد ۳): ص ۸۹۴ تا ۹۴۰

ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ نواب اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات انگریزوں سے دوبارہ حاصل کر سکیں۔

نواب کی اس بڑھتی ہوئی فوجی طاقت نے کمپنی کو جلد مشتبہ کر دیا۔ چنانچہ رجب ۱۱۸۲ھ (نومبر ۱۷۶۸ء) میں بنارس کے مقام پر ایک نیا معاہدہ ہوا اور نواب پر اس بات کی پابندی لگائی گئی کہ وہ ۳۵۰۰۰ (پینتیس ہزار) سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتے، اس طرح چند سالوں کے لئے اودھ کی فوجی ترقی رک گئی۔ لیکن بعد میں نواب نے گورنر جنرل سے مل کر یہ معاہدہ منسوخ کروالیا۔(۱)

پانی پت کی لڑائی کے بعد روہیلوں نے اپنے تمام مقبوضہ علاقے مرہٹوں سے چھین لئے تھے۔ مرہٹوں نے منظم ہو کر دوبارہ روہیلکھنڈ پر چڑھائی کی اور اپنا قبضہ جما لیا۔ روہیلوں نے نواب سے امداد مانگی جسے نواب نے ۴۰ لاکھ روپیے کے عوض منظور کر لیا۔ اور مرہٹوں سے روہیلکھنڈ خالی کرا لیا۔ بعد میں مرہٹوں کو نواب کی اسکیم کی خبر ہوئی تو وہ انتقاماً ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں دوآبے میں داخل ہو گئے۔ رام گھاٹ کے مقام پر مرہٹوں کا نواب سے مقابلہ ہوا چونکہ نواب کے ساتھ انگریزی فوجیں بھی تھیں لہذا مرہٹوں کو شکست ہوئی۔(۲)

دوسری طرف روہیلوں نے نواب کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی ۴۰ لاکھ کی رقم ادا کی۔ نواب نے روہیلوں کے خلاف کمپنی سے امداد طلب کی۔ رجب ۱۱۸۷ھ (ستمبر ۱۷۷۳ء) میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے نواب نے کمپنی سے ۵۰ لاکھ روپیہ میں کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع کا قبضہ حاصل کر لیا۔(۳) اس کے بعد نواب انگریز فوجوں کے ہمراہ مرہٹوں سے مقابلے کے لئے نکل پڑے۔

قنوج سے آگے بڑھتے ہوئے شوال ۱۱۸۷ھ (دسمبر ۱۷۷۳ء) میں اٹاوہ میں داخل ہوئے۔ اس دوران اٹاوہ، مین پوری اور ایٹہ کے علاوہ کول (علی گڑھ) اور آگرہ کے بعض علاقے نواب کے قبضہ میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ میران پور، کڑہ کے قریب روھیلوں سے مقابلہ ہوا(۴) روہیلکھنڈ نواب کے قبضہ میں آ گیا۔ سید فیض اللہ خان والئی رام پور سے پندرہ لاکھ روپیہ

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد۲) ص ۶۳

(۲) تاریخ اودھ (جلد۲) ص ۷۶

(۳) ایضاً

(۴) اس جنگ میں مشہور روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں شہید ہوئے (حیات حافظ رحمت خاں)

لے کر خراج کے وعدے کے ساتھ رام پور کے قرب و جوار کا علاقہ انھیں دے دیا۔ اور باقی علاقہ کو ایک نئے صوبہ کی شکل دے کر نواب نے اپنے بیٹے سعادت علی خاں کو اس کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ ان سب کاموں سے فراغت پانے کے چند ماہ بعد ہی ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ (جنوری ۱۷۷۵ء) میں بیالیس برس کی عمر پا کر نواب شجاع الدولہ نے وفات پائی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی:

کرداز عالم فانی رحلہ　　سرور غالب صاحب صولہ

گشت تاریخ چوآن یکتامرد　　رفت نواب شجاع الدولہ(۱)

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ نواب شجاع الدولہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے اور حکومت کرنے کی اعلیٰ قابلیت ان میں موجود تھی۔ چند ذاتی کمزوریاں اگر چہ نواب میں موجود تھیں مگر ان کمزوریوں سے نواب کی قابلیت اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک مؤرخ نے اس سلسلے میں وضاحت فرمائی ہے:

''شجاع الدولہ کے مرنے سے اودھ کی ترقی اور وسعت کا ایک دور تمام ہو گیا کیونکہ ابھی تک حکمرانان اودھ کی ہمت توسیع مملکت ترقی جاہ و منصب اور اضافۂ اقتدار و سطوت پر تمام تر مصروف رہی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے وقت میں انگریزوں کی پشت پناہی اور حفاظت کا سہارا پا کے جو اطمینان و دلجمعی نصیب ہوئی اس نے آئندہ حکمرانوں کو اپنے مقبوضات پر بخیر و عافیت قابض و متصرف رہنے اور عیش و کامرانی کے ساتھ بفراغت بسر کرنے ہی پر مائل رکھا''۔(۲)

نواب کو گلاب باڑی فیض آباد میں دفنایا گیا(۳) انکی جگہ ان کے بڑے بیٹے نواب آصف الدولہ ستائیس برس کی عمر ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔

---

(۱) خزانۂ عامرہ: ص ۹۷

(۲) شباب لکھنؤ، ص ۱۵

(۳) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۳

نواب آصف الدولہ وزیر الممالک رستم جنگ

ان کا نام مرزا یحییٰ خاں عرف مرزا امانی تھا۔ ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ (۱) سید شرف الدین خاں ان کے اتالیق تھے۔ ابتدائے شباب میں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے وزیر اعظم قمر الدین خاں کی پوتی (انتظام الدولہ خان خاناں کی بیٹی) شمس النساء بیگم سے شادی ہوئی۔ (۲)

نواب شجاع الدولہ نے اپنی زندگی میں ہی نواب آصف الدولہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ لیکن انکی وفات کے بعد کمپنی نے انکی بات کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ نئی شرائط کے ساتھ نواب آصف الدولہ کو تخت نشین کیا، جسکی رو سے نواب کے اختیارات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے اور کمپنی کی مداخلت بڑھتی گئی۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں "جان برسٹو" اودھ کے رزیڈینٹ بنا کر بھیجے گئے۔ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ (مئی ۱۷۷۵ء) میں نیا معاہدہ ہوا (۳) اسکی شرائط کے مطابق کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع جو نواب شجاع الدولہ کے ہاتھ فروخت ہوئے تھے، وہ اس طرح آصف الدولہ کے پاس رہیں گے جس طرح پورا ملک اودھ ہے لیکن سرکار بنارس، سرکار چنار گڑھ کے اضلاع جونپور، وجے پور اور غازی پور پرگنہ سکندر پور وغیرہ یہ علاقے نواب کمپنی کو دیں گے۔ دوسرے یہ کہ کسی یورپین کو بجز انگریزوں کے نواب اپنی ملازمت میں نہیں رکھیں گے۔ شاہ عالم ثانی سے نواب بطور خود کسی قسم کا معاملہ نہ رکھیں۔ اس کے علاوہ نواب شجاع الدولہ کے ذمہ جو کچھ کمپنی کا واجب تھا اس کی ادائیگی نواب آصف کے ذمہ آئی۔ کمپنی نے یہ بھی وعدہ کیا کہ نواب کے مقبوضہ جات (۴) کی کمپنی محافظ ہوگی۔ اور بیرونی دشمنوں سے بھی محافظت کرے گی۔ اس کے

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۵

(۲) ایضاً، ص ۵

(۳) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۵۸

(۴) کوڑہ، الہ آباد، روہیلکھنڈ اور دوآب کا وسطی حصہ شامل تھا۔

ساتھ ہی کچھ فوج کا اضافہ اور اس کا سالانہ خرچ بھی بڑھادیا۔ اودھ میں پہلے ایک رزیڈینٹ رہا کرتا تھا لیکن اب ایک اور ایجنٹ کا اضافہ ہوگیا جس کی تنخواہ دولاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ نواب کے ذمہ آئی۔ غرض کہ کمپنی کے مطالبات روز بروز بڑھتے جارہے تھے۔ نوبت یہاں تک آپہونچی کہ خرچ کی رقم ایک کروڑ سالانہ ہوگئی۔

نواب آصف الدولہ کے لئے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ انھوں نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ انکی بیشتر جائداد جو زر و جواہر اور نقد کی صورت میں تھی وہ فیض آباد میں ماں اور دادی کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ اور یہ سب کچھ حاصل کرنا نواب کی دسترس سے باہر تھا۔ کمپنی کے مطالبات کی ادائیگی کے لئے نواب نے ماں اور دادی سے روپیہ وصول کرنے کی کئی بار کوششیں کیں اور کئی طرح سے ان پر دباؤ ڈالے(۱) ایسی صورتحال میں حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ آخرکار نواب نے کمپنی سے رحم کی درخواست کی۔

۱۱۹۵ھ /۱۷۸۱ء میں چنارگڑھ کے مقام پر نواب اور وارن ہیسٹنگز کی ملاقات ہوئی (۲) اور طے پایا کہ انگریزی فوج کی بھاری تعداد اودھ سے ہٹالی جائے۔ اس کے علاوہ نواب کو یہ استحقاق دیا گیا کہ وہ بوقت ضرورت جاگیرداروں کی جاگیریں چاہیں تو ضبط کرسکتے ہیں اور بیگمات اودھ (نواب آصف الدولہ کی والدہ اور دادی) سے ایک بڑی رقم وصول کی جائے حالانکہ پچپن چھپن لاکھ روپیے مختلف اوقات میں نواب پہلے ہی وصول کرچکے تھے۔ اس کے باوجود نواب کے ظلم و زبردستی پر ۶۷ لاکھ روپیہ بیگمات اودھ سے وصول کئے گئے (جو نقد کے علاوہ زر و جواہر اور ہاتھی، بیل گاڑیوں وغیرہ کی شکل میں تھے (۳)

بہرحال سیاسی طور پر اودھ کے لئے یہ دور کچھ اچھا ثابت نہیں ہوا۔ ایک طرف کمپنی کی مانگیں تھیں

---

(۱) نواب آصف الدولہ اپنی ماں او ردادی سے مطالبے کرکے لمبی لمبی رقمیں لے جاتے تھے۔ بعد میں جب بیگمات اودھ نے دینے سے انکار کیا تو نواب نے رزیڈینٹ کی مدد حاصل کرکے ایک بھاری رقم وصول کی۔ (شباب لکھنؤ: ص ۱۸)

(۲) شباب لکھنؤ: ص ۱۷

(۳) شباب لکھنؤ: ص ۱۸

جو کسی طرح پورا ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں دوسری طرف آمدنی کی کمی تھی اس پر ستم یہ کہ نواب آصف الدولہ اس قدر فیاض دل کے مالک تھے کہ پیسہ پانی کی طرح بہاتے انکی سخاوت کے چرچے سارے ملک میں تھے۔

نواب کو فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا چنانچہ کروڑوں روپے صرف عمارات کی تعمیر پر صرف کر دیئے گئے۔ لکھنؤ کا آصفی امام باڑہ، رومی دروازہ اور دوسری تاریخی عمارتیں آج بھی نواب کے اعلیٰ ذوق اور حسن تعمیر کی گواہ ہیں۔

تعمیرات کے علاوہ شہر کو وسعت دی۔ آبادی میں اضافہ ہوا۔ اور بہت سے نئے محلے آباد ہوئے (۱) مرزا علی لطف لکھنؤ سے متعلق رقم طراز ہیں۔

> ''بعد چندے اس آب و رنگ گلشن وزارت نے بنگلے سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ کے تن بے جان میں گویا جان آئی اور چشم بے نور نے بصیرت پائی پھر تو آبادی پر شہر کے، عرصۂ زمیں کا تنگ تھا اور مصوری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی تنگ تھا''۔ (۲)

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ نے وفات پائی اور اپنے بنائے ہوئے امام باڑے میں دفن کئے گئے۔

اس درمیان اودھ کے سیاسی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ جس کے کسی حد تک نواب بھی ذمہ دار تھے لیکن گرد و پیش کا جائزہ لیا جائے تو ایسے اسباب بھی نظر آتے ہیں جن میں انگریزوں کی رضا جوئی کرنا نہ صرف نواب کی ضرورت تھی بلکہ مجبوری بھی تھی۔ اسی ہزار (۸۰۰۰۰) فوج کا اودھ میں موجود رہنا اور کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار ان سب باتوں نے نواب کو بے بس کر دیا تھا۔

---

(۱) مثلاً امانی گنج، فتح گنج، نواب گنج، وزیر گنج، ترمنی گنج، ہوانی گنج، نواز گنج، تحسین گنج، علی گنج، محبوب گنج، عنبر گنج، خیالی گنج، نخاس، خانساماں احاطہ، ٹکیت رائے کا بازار، حسین الدین خاں کی چھاؤنی، توپ دروازہ اور جھاؤلال کا پل وغیرہ اہم ہیں۔

(۲) گلشن ہند: ص ۱۰

نواب وزیر علی خاں بہادر

وزیر علی خاں نواب آصف الدولہ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ انکی تاریخ پیدائش تذکروں میں درج نہیں ہے۔ سلاطین اودھ سے متعلق جتنی بھی تواریخ ہیں ان میں ان کا ذکر ضمنی طور پر ملتا ہے۔ وزیر علی خاں کو نواب آصف الدولہ نے اپنی زندگی میں ہی ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ نواب کی وفات کے بعد رزیڈنٹ نے نائب سلطنت تفضل حسین خاں سے صلاح ومشورہ کر کے وزیر علی خاں کو تخت نشین کروادیا۔ وزیر علی خاں ایک بہادر اور جرأت مند انسان تھے۔ نواب کی زندگی میں وہ انکی مجبوریوں اور سیاسی بندشوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہذا اقتدار ہاتھ میں آتے ہی وزیر علی خاں نے امرائے سلطنت کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا جو درحقیقت کمپنی کے عہدیداروں سے ملے ہوئے تھے۔ کمپنی کو بھی نواب سے کوئی اچھی توقع نہیں تھی دوسری طرف نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں بھی مسند وزارت حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ چنانچہ کمپنی کے اعلی افسران نے چند درباری امراء اور شاہی خاندان کے افراد سے مل کر ایک عرض داشت تیار کروائی (۱) جس میں نواب وزیر علی خاں کو نواب آصف الدولہ کا شرعی وارث ماننے سے صاف انکار کیا گیا تھا۔ اس عرض داشت پر تمام امراء کے دستخط کروانے کے بعد وزیر علی خاں کو تخت سے اتار کر نظر بند کرادیا اور بنارس بھیج دیا۔

نواب وزیر علی خاں کی باقی زندگی انگریزوں کی قید میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں گزری۔ کچھ عرصہ بعد انھیں بنارس سے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ شعبان ۱۲۳۲ھ / جون ۱۸۱۷ء میں وزیر علی خاں کا کلکتہ قلعہ میں انتقال ہوا، اور وہ کلکتہ کے کانسی باغ میں دفن کیے گئے۔ (۲)

نواب وزیر علی خاں نے صرف چار ماہ سلطنت اودھ پر حکمرانی کی۔ محلہ وزیر گنج انھیں کے نام

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

(۲) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

پر آباد ہوا۔ یہیں انکی قیام گاہ بھی تھی انکی معزولی کے بعد لکھنؤ میں ایک بڑا بھاری گروہ ایسے لوگوں کا بھی بن گیا تھا جو نواب کے طرفدار اور ہم خیال تھے(۱) نواب کی برطرفی کے بعد کمپنی نے نواب شجاع االدولہ کے بیٹے اور نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی (۲) سعادت علی خاں کو شعبان ۱۲۱۲ھ / جنوری ۱۷۹۸ء میں تخت نشین کیا۔

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۸۷

(۲) نواب سعادت علی خاں ''خرد محل'' کے بطن سے تھے۔

نواب سعادت علی خاں یمین السلطنت

نواب سعادت علی خاں کی پیدائش ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۳ء میں فیض آباد میں ہوئی (۱) انکی تعلیم و تربیت علامہ تفضل حسین خاں اور سدید الدین شاہجہاں پوری کے زیر سایہ ہوئی۔ کم عمری میں ہی نواب شجاع الدولہ نے انہیں خیر آباد سرکار کا فوجدار مقرر کر دیا تھا۔ اس درمیان اپنا نمائندہ بنا کر شاہ عالم کے دربار میں بھی بھیجا اس کے بعد الہ آباد روانہ کر دیا۔

۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ کے ساتھ روہیلکھنڈ کی جنگ میں شریک ہوئے۔ فتح کے بعد انھیں بریلی کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔ تقریباً چار سال کا عرصہ نجف خاں کی رفاقت میں گزارا جس سے انھیں میدان جنگ کے تجربے حاصل ہوئے۔ ہنڈن اور بیانہ کا انتظام سنبھالنے کی وجہ سے امور جہاں بانی سے بھی خاص واقفیت حاصل ہوگئی تھی۔ غرض کہ بچپن سے لے کر جوانی تک کا تمام زمانہ انھوں نے امور سلطنت کے سیکھنے سکھانے میں گزارا۔

جس وقت وزیر علی خاں تخت نشین ہوئے سعادت علی خاں اتفاق سے لکھنؤ میں موجود نہیں تھے۔ وہ وزیر علی کی تخت نشینی سے خاصے پریشان ہوئے اور انکی وزارت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ خود کو وزارت کا صحیح حقدار سمجھتے تھے چنانچہ تفضل حسین خاں اور رزیڈنٹ سے رابطہ قائم کر کے ۷۵ لاکھ روپے کی رقم کمپنی کو خراج کی صورت میں دی اور اودھ کی جانشینی حاصل کی۔ (۲)

اتنا سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود کمپنی مطمئن نہ تھی بلکہ اودھ کے نصف علاقے پر اپنا تصرف چاہتی تھی۔ کمپنی کے مفاد کے پیش نظر گورنر جنرل نے حسن رضا خاں کو نائب سلطنت اور راجہ ٹکیٹ رائے کو دیوان ریاست مقرر کر دیا۔ یہ دونوں ہستیاں کمپنی کی خیر خواہ تھیں اور نواب ان باتوں سے بخوبی واقف تھے۔

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد ۴): ص ۱

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۶۹

آخر کار نواب نے حسن رضا خاں کو نکال دیا اور راجہ ٹکیت رائے کی وفات ہوگئی (۱)

چند ماہ بعد لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر اودھ آئے انھوں نے اقتدار بڑھانے کے لئے نواب کی فوج میں تخفیف کر کے انگریزی فوج کی تعداد بڑھادی جس کا سالانہ خرچ ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سے بھی زیادہ تھا نواب نے اپنی مالی مجبوریاں پیش کیں جس کے نتیجہ میں رزیڈنٹ اور گورنر جنرل نے دوسری تجویز رکھی اور نصف اودھ کا مطالبہ کر دیا۔

جمادی الآخر ۱۲۱۶ھ (نومبر ۱۸۰۱ء) میں بنارس میں عہد نامہ تیار ہوا۔ (۲) اس نئے عہد نامے کی رو سے کمپنی نے اودھ کا نصف علاقہ حاصل کر لیا۔ جس میں روہیلکھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، ایٹہ، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، بستی اور گورکھپور وغیرہ کے اضلاع شامل تھے۔

نواب کو ان اضلاع کے نکل جانے کا بے حد افسوس رہا لیکن دوسری طرف انھیں یہ اطمینان بھی ہوا کہ اب ان کے اور کمپنی کے درمیان کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہ ہوگا اور وہ اپنے آدھے علاقے کے پوری طرح مالک ہوں گے۔ ابھی اس عہد نامہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ رزیڈنٹ میجر بیلی نے اودھ کے انتظامی امور میں دوبارہ مداخلت شروع کر دی۔

مختصر یہ کہ نواب سعادت علی خاں اپنے تمام عرصہ حکومت میں سیاسی الجھنوں سے دوچار رہے۔ کمپنی اپنے مفادات کی خاطر ہر روز ایک نیا جال بنتی اور نواب اس میں ایسا الجھتے کہ حکومتی امور کی جانب توجہ کرنیکی مہلت ہی نہ ملتی۔ اس سلسلہ میں محمد تقی کا بیان قابل توجہ ہے:

> ''اتفاق وقت اودھ میں اس وقت سعادت علی خاں کا ایسا مدبر اور ہوشیار حکمراں تھا ورنہ غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر کا زمانہ ہوتا تو شاید ۱۸۵۶ء سے بہت قبل اودھ کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی تاریخ میں تین گورنر

---

(۱) مہاراجہ دھراج خطاب تھا۔ ابتداً میں ایک معمولی دیہاتی تھے۔ ترقی کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں دیوان (وزیر) مقرر ہوئے ٹکیت گنج آج بھی لکھنؤ میں مہدی گنج کی طرف ان ہی کے نام سے آباد ہے۔ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں یہاں ایک شاندار امام باڑہ اور خوبصورت سی مسجد تعمیر کروائی تھی۔
ٹکیت رائے کا انتقال ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۶۹

جنرلوں کے عہد بہت سخت گزرے ہیں لارڈ ولزلی، لارڈ ہسٹنگز اور لارڈ ڈلہوزی''(۱)

تمام سیاسی پریشانیوں کے باوجود نواب نے ملکی انتظامات نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اخراجات کو ممکن حد تک سمیٹا۔ شاہی خزانے کی حیثیت مالی اعتبار سے بڑھائی۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا مضبوط نظام قائم کیا۔ اخبار کا محکمہ قائم کیا جس کے ذریعہ ہر شہر و قصبہ کی خبریں براہ راست نواب تک پہنچنے لگیں۔ جاسوس اور مخبر مقرر کئے تا کہ سلطنت کی تمام خبریں ملتی رہیں۔ اس کے علاوہ فوج کم کردی۔ جرمانہ کی رقم بڑھادی غیر آباد زمینوں کو آباد کروایا اور شہر کو درست کروایا۔ نئی عمارتوں کی تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری کیا، ان کی بنیادیں مغربی طرز پر رکھی گئیں (۲) اور نئے شہر کا نام دیا گیا (۳)

انکی تعمیرات سے متعلق تاریخ اودھ کا بیان ملاحظہ ہو:

''عمارات مفصلۂ ذیل بھی سعادت علی خاں نے بنوائیں تھیں تا کہ شہر غربی جانب سے ویسا ہی آراستہ ہو جیسا کہ آصف الدولہ نے شرقی جانب کو درست کیا تھا۔ کوٹھی حیات بخش ،کوٹھی دار الشفاء، کوٹھی بیگم، کنکر والی کوٹھی، کوٹھی نور بخش، چینی بازار۔۔۔''(۴)

اس طرح اودھ کے ملکی و مالی دونوں حالات بہتر ہو گئے تھے لیکن عمر نے نواب کو زیادہ مہلت نہ دی۔ ان کی زندگی کا خاتمہ ایک سیاسی سازش کے تحت ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء میں ہوا۔ ان کے خاندان کے کسی فرد نے ان کے کھانے میں زہر ملا کر انھیں ہلاک کر دیا۔ تاریخ وفات مندرجہ ذیل مصرعہ سے نکلتی ہے۔

''آہ شد گنج سعادت بر زمین''(۵)

---

(۱) واجد علی شاہ: ص ۳۱

(۲) یہ عمارتیں ٹیڑھی کوٹی، موتی محل، قصر السلطان، دل آرام دلکشا، حیات بخش، منور بخش اور خورشید منزل وغیرہ تھیں۔

(۳) نئے اور پرانے شہر کی تفریق اب نہیں رہی لیکن اس زمانے میں نمایاں فرق تھا۔

(۴) تاریخ اودھ (جلد ۴): ص ۸۸

(۵) شباب لکھنؤ: ص ۲۷

وفات کے بعد انھیں ''جنت آرامگاہ'' کا لقب دیا گیا۔ انھیں غازی الدین حیدر کے مکان خاص بازار میں دفن کیا گیا۔(۱)

نواب سعادت علی خاں نے وفات سے قبل اپنے بیٹے رفعت الدولہ غازی الدین حیدر کو ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔(۲) اس منصب کے تمام انتظامات ان کے سپرد کر دیئے تھے اور انھیں مرشد زادے(۳) کا خطاب عطا فرمایا۔

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

(۲) تاریخ اودھ (جلد ۴)، ص ۶۵

(۳) ایضاً

بادشاہ غازی الدین حیدر شاہ زمن

نواب غازی الدین حیدر ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں اودھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ بسولی میں پیدا ہوئے (۱) بیس برس کی عمر میں ان کی شادی بادشاہ بیگم سے ہوئی (۲) جو دہلی کے ایک درباری مبشر خاں منجم تقویم ساز کی بیٹی تھیں نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد جانشینی کے لئے دو دعویدار کھڑے ہوئے ۔ ایک تو خود غازی الدین حیدر تھے دوسرے ان کے چھوٹے بھائی شمس الدولہ تھے (۳) لیکن رزیڈنٹ نے اوّل الذکر کی حمایت کی اور غازی الدین تخت نشین ہوئے ۔

اس حکمراں کے متعلق مؤرخین کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے ۔ سیاسی حالات جو نواب سعادت کے عہد میں کچھ بہتر ہو گئے تھے اس عہد میں دوبارہ تنزلی کی طرف جا رہے تھے ۔ عبدالحلیم شرر کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''غازی الدین حیدر میں نہ تو باپ کی سی بیدار مغزی تھی اور نہ ہی دولت کی قدر، نہ ہی اگلے فرمانرواؤں کی سی فوجی سرگرمیاں ہاں آصف الدولہ کے عہد میں آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اس میں بھی یہ فرق ضرور آیا کہ آصف الدولہ کا اصراف ملک کی نفع رسائی کے لئے ہوتا تھا اور اب خالی نفس پروری تھی'' (۴)

نواب سعادت علی خاں نے وفات سے پیشتر شاہی خزانے میں کروڑوں کی رقم جمع کر لی تھی (۵) جسے نواب غازی الدین حیدر نے بڑی فراخدلی سے خرچ کیا۔ کمپنی نے بھی کروڑوں روپیہ قرض کی صورت میں وصول کیا اور ایک پیسہ بھی واپس نہیں کیا۔ کیونکہ کمپنی اس دوران گھاٹے میں چل رہی تھی ۔

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۷

(۲) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۷

(۳) یہی شمس الدولہ آگے چل کر محمد علی شاہ کے لقب سے اودھ کے تیسرے بادشاہ ہوئے ۔

(۴) گذشتہ لکھنؤ: ص ۱۵

(۵) لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۶۷

نیپال اور برما کی جنگ نے کمپنی کو اور بھی مفلس بنا دیا تھا۔ گورکھوں سے کمپنی کی لڑائی ختم ہونے پر مفتوحہ علاقوں میں سے کچھ علاقے جو نا قابل کاشت تھے (۱) نواب کو قرضے کی ادائیگی کی صورت میں دے دیئے گئے اور مزید قرضہ کے لئے نواب سے درخواست کی گئی۔

ان تمام حالات میں لارڈ ہیسٹنگز کا رویہ نواب کے ساتھ خاصا ہمدردانہ رہا۔ انھوں نے بہو بیگم کی متروکہ جائیداد جو کمپنی کے قبضہ میں تھی نواب کو آدھی قیمت پر واپس دلوادی۔ اس کے علاوہ حکومت برطانیہ سے اجازت حاصل کر کے غازی الدین حیدر کو بادشاہت دلوادی۔ نواب نے بھی مغلیہ سلطنت سے تعلقات منقطع کر کے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۵ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۲۰ء) کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ (۲) اور ''شاہ زمن'' کا خطاب حاصل کیا۔

اس موقع پر بادشاہ غازی الدین نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ شاہی لوازمات کے لئے دو کروڑ روپے منظور کیے گئے۔ جن سے ایک قیمتی تاج، مرصع تخت، شاہی چتر اور کارچوبی کا شامیانہ تیار کیا گیا۔ سلطان العلماء سید محمد صاحب نے سر پر شاہی تاج رکھا۔ شاہی قلم سے پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا صادر ہوا۔ غرض کہ ہفتہ بھر طرح طرح سے جشن منائے گئے۔ تخت نشینی کی تقریب میں شرکت کے لئے فرخ آباد، کانپور، الہ آباد، بنارس اور جونپور وغیرہ کے تمام انگریز حکام مدعو کیے گئے۔ رسم تاج پوشی لال بارہ دری کی عمارت میں ہوئی۔ (۳) تاج پوشی کے دن تیس ہزار روپیہ کے جواہرات لٹائے گئے اور چاندی کے تمغے و خلعت اراکین اور امرا اور رؤساء میں تقسیم کئے گئے یہ تمغے خالص اس موقع کے لئے بنوائے گئے تھے۔ اس میں ایک طرف دائرے میں تاج اور ہار سے مزین بادشاہ کی شبیہ ہے اور بقیہ جگہ میں پھول اور بیل بنی ہے حاشیہ پر گولائی میں کتبہ ہے۔ (۴) جو بادشاہ کے بائیں شانہ سے شروع ہوتا ہے۔

---

(۱) یہ کھیری، گڑھ اور ترائی کا علاقہ تھا۔

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۶۸ گذشتہ لکھنؤ ص ۱۷

(۳) اس عمارت میں اس وقت لکھنؤ کا عجائب خانہ ہے۔

(۴) سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن

غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

دوسری طرف مارکہ ہے اس میں دوشیر ہاتھوں میں جھنڈے لئے ہیں ان جھنڈوں پر مچھلی بنی ہوئی ہے۔ دونوں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹار ہے جس کے اوپر تاج اور نیچے دو مچھلیاں ہیں سب سے نیچے ایک لہردار باریک جھنڈا ہے۔ داہنے گوشہ پر حرف ''ج'' ہے اور کنارے حاشیہ کی گولائی میں دعائیہ شعر ہے(۱)

اس کے علاوہ بادشاہ غازی الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے بھی جاری کیے۔ جو مختلف طرز اور سنہ کے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ نے بادشاہ کے جلوس کی تاریخ نظم کی ہے:

بحمد اللہ کہ بااقبال ودولت — بہ تخت زر جلوس شاہ گردید
زمین وآسمان یک بزم عیش ست — زماہی خرمی تاماہ گردید
مبارک باد اے آفاق عالم — طلوع آفتاب جاہ گردید
ندا آمد بگوشم زود یارب — کہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید
پئے سال ہمایوں جلوسش — بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید(۲)

اس موقع پر ولی عہد بہادر نصیر الدین حیدر کو سلیمان جاہ اور معتمد الدولہ آغا میر کو وزیر اعظم کا خطاب عطا ہوا۔ ابتدا میں بادشاہ نے درباری انتظامات کی طرف توجہ دی اور کئی سال شان وشوکت سے حکومت کی۔ اس کے بعد صحت خراب رہنے کی وجہ سے شراب نوشی کی کثرت ہوئی۔ اس دوران وزیر اعظم آغا میر کا دربار میں اثر ورسوخ بڑھنے لگا۔ آخر کار ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (۱۹/اکتوبر ۱۸۲۷ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے تاریخ وفات کہی:

''ای بسا آرزو کہ خاک شدہ'' (۳)

غازی الدین حیدر کی بہت سی یادگاریں لکھنؤ میں موجود ہیں ان میں ''قدم رسول'' اور شاہ نجف

---

(۱) تا ہزار سال شاہا بقائے عمر تو بادا
ہزار سال باشی تو در زمان خدا

(۲) دیوان ناسخ: ص ۲۱۲

(۳) دیوان ناسخ: ص ۱۹۹

فن تعمیر کا بہترین نمونہ کہلائیں۔ شاہ نجف حضرت علی کے روضہ مطہرہ نجف اشرف (عراق) کے عین مشابہ ہے اس لئے اس کا نام شاہ نجف رکھا گیا۔ بادشاہ نے ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں یہ روضہ اپنے لئے بنوایا تھا۔ وفات پانے پر بادشاہ اس روضہ میں دفن کئے گئے۔(۱)

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر (۲) سلیمان جاہ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں ۲۴ برس کی عمر میں تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۱

(۲) غازی الدین حیدر کی زوجہ بادشاہ بیگم تھیں ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ بیگم کی ایک خواص ''صبح دولت'' کے بطن سے تھے (لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۷۹)

بادشاہ نصیرالدین حیدر سلیمان جاہ

بادشاہ نصیرالدین حیدر کی پیدائش ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں ہوئی (۱)۔ ان کی تاج پوشی بڑے دھوم دھام کے ساتھ ہوئی اور نیا سکہ رائج کرنے کی رسم بھی ادا ہوئی۔ ان کے عہد کے پہلے دو سال کے سکوں پر ان کا نام سلیمان جاہ (۲) ہے اور تیسرے سال یہ شعر بدلا گیا اور سکّوں پر بادشاہ کا نام نصیرالدین حیدر (۳) ہوا۔

اودھ کے بادشاہوں میں نصیرالدین حیدر کی شخصیت بالکل منفرد تھی اور مزاج بھی جدا پایا تھا۔ وہ مغربی طرز زندگی سے بے حد متاثر تھے۔ شراب نوشی کے عادی تھے اور عورتوں کی صحبت پسند کرتے تھے جن میں زیادہ تر طوائفیں تھیں جنھیں بادشاہ نے اپنے محل میں شامل کر لیا تھا۔ (۴)

نصیرالدین حیدر کا زمانہ اودھ کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ نواب سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا روپیہ جو غازی الدین حیدر سے بچ گیا تھا۔ نصیرالدین حیدر نے فراخدلی کے ساتھ خرچ کیا۔ ان کے مصاحبوں میں چند انگریز بھی شامل تھے ان میں سے ایک ولیم نائٹن تھے۔ انھوں نے انگلینڈ جا کر اپنے چشم دید واقعات کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ (۵) یہ کتاب نصیرالدین حیدر کے درباری حالات کے چشم دید واقعات پر مشتمل ہے۔

اس بادشاہ کے عہد میں اودھ کے سیاسی حالات جوں کے توں تھے۔ مالی حالات البتہ خراب

---

(۱) کلام نصیرالدین حیدر بادشاہ: ص ۱۲

(۲) بر ھر سکہ شاہی زدہ ز لطف الہ

سپھر مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ

(۳) سکہ زد بر سیم وزر از فضل حق ظل الہ نائب مہدی نصیرالدین حیدر بادشاہ

(۴) ان بیگمات میں نواب ملکہ زمانیہ، ولایتی محل، تاج محل، پھول محل، خاقان محل، قدسیہ بیگم اور سلطان بہو بیگم بہت مشہور تھیں

(۵) اس کتاب کا نام ''THE LIFE OF AN EASTERN KING'' ہے اور اس کے مصنف WILLIAM KNIGHTEN ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ احد علی نے ''شباب لکھنؤ'' کے نام سے کیا۔

ہورہے تھے۔ اراکین سلطنت میں چند باصلاحیت اشخاص موجود تھے جن کے ذریعہ حکومت کا نظام چل رہا تھا۔ بادشاہ اپنے بیشتر اوقات عیش وعشرت میں یا مذہبی رسومات کی ادائیگی میں گزارتے، حکومتی امور سے انھیں کوئی خاص شغف نہ تھا۔ دس سال کے دوران حکومت میں غازی الدین حیدر کا چھوڑا ہوا دس کروڑ روپیہ نصیر الدین حیدر نے اپنے مصارف میں خرچ کرڈالا۔ نصیر الدین حیدر کی وفات کے وقت شاہی خزانے میں صرف ۷۰ لاکھ روپیہ باقی بچا تھا۔ گویا سالانہ آمدنی کی علاوہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ جو خزانے میں پہلے سے موجود تھا وہ زائد صرف ہوگیا تھا(۱)

دس سال حکومت کرنے کے بعد ۳۵ برس کی عمر میں ۱۲۵۳ھ (جولائی ۱۸۳۷ء) میں بادشاہ نے لکھنؤ میں وفات پائی (۲) اور کربلا نو میں دفن کئے گئے جو خود انھیں کا تعمیر کردہ تھا۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی جسے تخت نشین کیا جاتا لیکن ان کی والدہ بادشاہ بیگم نے ''مرزا فریدون بخش'' عرف منا جان کو اپنا پوتا تسلیم کرتے ہوئے اس کی حمایت کی اور بادشاہ نصیر الدین حیدر کا جانشین بنانا چاہا۔

---

(۱) سفرنامہ سلیمن (انگریزی)، ص ۱۸۹

(۲) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

مرزا فریدون بخش عرف منّا جان

بادشاہ بیگم نے رزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف منا جان کو تخت نشین کروا دیا لیکن کمپنی نے انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہ مشکل چند گھنٹہ (۱) حکمرانی کی اور کمپنی نے انھیں گرفتار کرلیا ساتھ میں بادشاہ بیگم بھی نظر بند ہوئیں انہیں اور منا جان کو چنار گڑھ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اس قلعہ میں منا جان نے بہ حالت قید ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء کو وفات پائی اور بادشاہ بیگم نے ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔

---

(۱) صرف دو ساعت (سوانحات سلاطین اودھ، ص ۱۴)

بادشاہ محمد علی شاہ ابوالفتح معین الدین

حکومت کے دعویداروں میں نصیر الدولہ محمد علی شاہ (۱) کو رزیڈنٹ کی حمایت حاصل تھی چنانچہ ۶۳ برس انھوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ صاحب تاریخ اودھ کا بیان ہے:

''۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۸ جولائی ۱۸۳۷ء کو چھ گھڑی دن چڑھے یہ رسم ادا ہوئی حاضرین موقع روشن الدولہ اور سبحان علی خاں اور دوسرے اراکین سلطنت اور ملازمان شاہی نے نذریں گزاریں اب ابوالفتح معین الدین محمد علی شاہ کہلانے لگے راجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ امیر الانشاء سرکار شاہی نے ان کا سکّہ یوں نظم کیا:

بجود وکرم سکہ زد در جہاں

محمد علی پادشاہ زماں (۲)

محمد علی شاہ نے سونے اور چاندی کے سکوں پر ایک نئے قسم کا نشان ایجاد کیا انھوں نے سکّوں کے ایک طرف شیر کے بجائے دو عورتوں کی شبیہ ڈھلوائی۔ ان کے اولین تین سال کے سکوں کے دوسرے جانب ''صوبہ اودھ بیت السلطنت لکھنؤ'' تحریر ہے لیکن ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء سے ''ملک اودھ'' بجائے ''صوبہ اودھ'' کے تحریر ہے۔(۳)

۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں کمپنی نے سات دفعات کا ایک نیا عہد نامہ تیار کیا جس کی رو سے سلطنت میں انگریزی عمل دخل کا اضافہ ہوا۔ بادشاہ کو اس عہد نامے کی چند شرائط پر اعتراض بھی تھا اس کے باوجود انھوں نے عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر دورۂ حکومت میں ملک کی بگڑتی حالت کو سنبھالنے کی ممکن حد تک کوشش کی۔ طبعاً انصاف پسند تھے۔ باوجود کمزوری کے تمام کاغذات خود دیکھتے اور احکامات لکھتے۔ اس سے رعایا

---

(۱) محمد علی شاہ نواب سعادت علی خاں کے تیسرے بیٹے اور سابق شاہ اودھ کے حقیقی چچا تھے۔

(۲) تاریخ اودھ (جلد ۵) ص ۲

(۳) صوبہ اودھ کے سکے: ص ۲۴۰

بھی مطمئن تھی۔ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں وزارت عطا ہوئی۔ وزیر اور بادشاہ دونوں کی خواہش تھی کہ انتظام سلطنت ٹھیک طرح ہو۔ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں بادشاہ نے ۱۷ لاکھ روپئے برٹش کمپنی کے پاس جمع کروائے اور اپنے خاندان کے کئی افراد کا دائمی وظیفہ مقرر کیا۔

غرض کہ ان کے پانچ سالہ دور حکومت میں سلطنت کی بہت سی خرابیاں اور خامیاں دور ہوئیں۔ وہ بے اعتدالیاں جو نصیر الدین حیدر کے عہد میں کافی بڑھ گئیں تھیں ان پر بھی قابو پایا۔ اگر چند سال انھیں فرمانروائی کے اور ملتے تو ممکن تھا کہ حالات اور بہتر ہو جاتے لیکن زندگی نے انھیں اتنا موقع نہ دیا۔ پانچ سال خوش اسلوبی سے حکومت کرنے کے بعد ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ (۶ مئی ۱۸۴۲ء) کو انتقال کیا(۱) اور اپنے بنائے ہوئے امام باڑہ حسین آباد میں دفن کئے گئے۔(۲)

ان کے پورے عہد میں کسی قسم کا اندرونی انتشار نہیں پیدا ہوا۔ کمپنی بھی بادشاہ کے رویہ سے مطمئن تھی۔ تاریخ اودھ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ان کے حسن انتظام اور خوبی تدبیر سے گورنر جنرل اور کونسل کے اراکین تک ان کے اس رویے سے رضامند و خوش تھے اسی وجہ سے انکی ہر آرزو اور ہر خواہش کی وہاں پذیرائی ہوتی تھی''(۳)

اس مختصر عہد حکومت کی تعریف میں صاحب ''بوستان اودھ'' رقم طراز ہیں:

> ہر امری کہ ازیں بادشاہ بظہور رسید صد ہزار تحسین است۔ در عہد دولتش ہمہ مردم فارغ البال و آسودہ حال بودند۔ ہیچ کس آزاری بر دل نداشت ابواب معدلت بر روی خلائق باز و دست تظلم و تعدی کوتاہ بود۔ باوجود ضعف پیری از کارہائے سلطنت خود را معذور نمی داشتند و بر امور کلی و جزوی می رسیدند،، نظم

عجب عہدے ہمہ در کامرانی	بہر خانہ نشاط و شادمانی
نہ کس دادی کمند کینہ راتاب	نہ کس دیدی خیال فتنہ در خواب(۴)

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد ۵) ص ۲۰

(۲) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

(۳) تاریخ اودھ (جلد ۵): ص ۱۰۔۱۱

(۴) بوستان اودھ: ص ۴۰

امجد علی شاہ ابوالظفر مصلح الدین ثریا جاہ

محمد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں تینتالیس ۴۳ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے (۱) انھیں ''خاقان زمان ثریا جاہ'' کا خطاب ملا۔

مؤرخین کی رائے میں یہ بادشاہ بڑے متقی اور پرہیز گار گزرے ہیں۔ مذہبی امور کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ جس کی وجہ سے حکومت کے نظم ونسق پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ البتہ مذہبی احکام کی شدت کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ انھوں نے عدالتی شعبہ کے تمام کام سلطان العلماء اور سید العلماء کو سونپ دیئے تھے۔ (۲) اس طرح تمام مقدمات کا فیصلہ انہی حضرات کی تجویز پر کیا جاتا تھا۔ ان کے انتظام سلطنت کے متعلق ''عبدالحلیم شرر'' لکھتے ہیں:

> ''علمائے دین ومقتدایان ملت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوسکتا۔ وہ نہ مدبر سلطنت ہوسکتے ہیں نہ اسٹیٹس مین۔۔۔ امجد علی شاہ کے لئے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھیں اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم ونسق مملکت کی طرف توجہ کریں۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری وبیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے، سب درہم برہم ہوگئے۔ اور یہ حالت ہوگئی کہ
>
> قاضی محمد صادق اختر کے بیان کے مطابق:
>
> تمام عمال بدکار وبدباطن اور خودغرض تھے۔ رعایا تباہ تھی زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی اور جو فتنے پیدا ہوئے ،کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے'' (۳)

ان کے عہد میں چند تعمیری کام ضرور ہوئے ان میں مدرسۂ سلطانی کا قیام اور رصد خانۂ سلطانی

---

(۱) لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ص ۸۷

(۲) یہ دونوں شیعہ فرقے کے مجتہد اول سید دلدار علی غفراں مآب کے بیٹے تھے۔

(۳) گذشتہ لکھنؤ: ص ۹۵۔۹۶

کی تکمیل تھی۔ جس کا آغاز نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ہوا تھا۔ آہنی پل (۱) کی تعمیر کا کام بھی اس عہد میں مکمل ہوا۔ لکھنؤ شہر کے خوبصورت ترین حصّے امین آباد اور حضرت گنج انہی کے دورۂ حکومت میں آباد ہوئے۔ اس عہد میں ملک کی آمدنی ایک کروڑ دس لاکھ روپیے کے قریب تھی۔

امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں جو سکّے جاری کئے ان پر ایک طرف شعر (۲) کندہ کروایا اور دوسری طرف کے نشان میں ایک گھومتی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چتر، اور اس کے دائیں اور بائیں گولائی میں دو تلواریں بنوائیں اور کتبہ ''ضرب الملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس'' کندہ کروایا۔

امجد علی شاہ کی وفات ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں ہوئی اور یہ ''چھاؤنی میڈ وخان رسالہ دار'' (۳) میں دفن کئے گئے۔

امجد علی شاہ اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ علی حیدر کو نا اہل سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے مرزا واجد علی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کر کے ''ابو المنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحب بہادر'' خطاب دیا اور قلمدان حکومت کی خدمت ان کے سپرد کی۔

---

(۱) یہ ایک لٹکنے والا پل تھا (Hanging Bridge) جسکا سارا دارومدار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبوں پر تھا۔

(۲) در جہاں زد سکہ شاہی بتائید الہ ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ (صوبہ اودھ کے سکّے، ص ۲۴۰)

(۳) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۱۴

واجد علی شاہ اختر سلطان عالم

واجد علی شاہ کی پیدائش ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء میں ہوئی۔(۱) ابتدائی عمر سیاسیات سے بے خبر ذاتی مشاغل میں گزری۔ جس میں عیش وعشرت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون سے دلچسپی کا بھی کافی حصہ رہا۔ ان کی علمی تربیت امداد حسین خاں نے کی۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد سے لے کر اب تک حکمرانان اودھ کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ خوشگوار تھے۔ ہر فرمانرواں نے جو معاہدہ کمپنی کے ساتھ کیا اسے پورا کیا۔ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء تک کمپنی کا قبضہ ملک کے اکثر وبیشتر حصوں پر ہو چکا تھا۔ درمیان میں اودھ کا زرخیز علاقہ باقی تھا جس پر کمپنی کی نگاہیں تھیں لہذا اب سلطنت کے داخلی معاملات میں کمپنی کی مداخلت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ بادشاہ کوئی بھی کام کمپنی کی مرضی کے خلاف نہیں کرسکتا تھا۔ دوسری طرف ان بادشاہوں کے شاہانہ مصارف حد سے تجاوز کر چکے تھے اور کمپنی کو بھی روپیہ کی ضرورت تھی۔

چنانچہ ان تمام حالات میں روپیہ کی فراہمی ضروری تھی اور اس کے لئے رعایا پر بے جا دباؤ ڈالنا پڑتا تھا۔ اس طرح رعایا میں بھی بے اطمینانی اور پریشانی بڑھتی گئی اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔

۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ نے بادشاہ کو متنبہ کیا کہ اگر دو سال کے اندر انتظامات درست نہ ہوئے تو سلطنت کمپنی کے زیر انتظام آجائے گی۔

اس درمیان کرنل سلیمن رزیڈنٹ بنا کر اودھ کے دورے پر بھیجے گئے (۲) تا کہ سلطنت کے متعلق وہ صحیح رپورٹ دیں اور انہی کی دی ہوئی رپورٹ پر کمپنی نے سلطنت کو اپنے مقبوضہ جات میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔

---

(۱) واجد علی شاہ: ص ۳۹

(۲) تاریخ اودھ (جلد ۵): ص ۲۴۴

جمادی الاول ۱۲۷۳ھ (جنوری ۱۸۵۶ء) میں جنرل اوٹرم نے وزیر اعظم علی نقی خاں کی معرفت لارڈ ڈلہوزی کا حکم سنایا کہ ''کورٹ آف ڈائریکٹرس'' کے فیصلے کے مطابق ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ بادشاہ کے اخراجات کے لئے اور ۳ لاکھ روپیہ ان کے عملے کے لئے مقرر کیا گیا اور کمپنی کا سلطنت پر قبضہ ہو گیا۔ (۱) چنانچہ وہ ملک جس کی آمدنی دو کروڑ روپیہ سالانہ سے کم نہ تھی قابض ہو کر کمپنی نے صرف ۱۵ لاکھ روپے سالانہ بادشاہ کے اخراجات کے لئے مقرر کئے۔ واجد علی شاہ نے یہ سب کچھ قبول کر لیا مگر اپنا تخت سے اتارا جانا قرین انصاف تسلیم نہیں کیا اور اپنا مقدمہ لندن جا کر ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۲۷۲ھ (مارچ ۱۸۵۶ء) میں واجد علی شاہ لندن جانے کی غرض سے لکھنؤ سے روانہ ہوئے (۲) اور ۱۲ مئی کو کلکتہ پہنچے (۳) ان کی طبیعت کی خرابی کے باعث ڈاکٹروں نے انھیں طویل سفر کی اجازت نہ دی۔ تو بادشاہ کی والدہ، ولی عہد مرزا حامد علی اور واجد علی شاہ کے بھائی مرزا سکندر حشمت لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ اور وکالت کے لئے مولوی مسیح الدین کو ساتھ لے گئے۔

غدر کے دنوں میں بادشاہ کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں نظر بند رکھا گیا غدر کے ختم ہونے پر ۱۲۷۶ھ (۹ جولائی ۱۸۵۹ء) کو واپس مٹیا برج میں اپنے لوگوں کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی ۱۲۷۶ھ (۲۹ ستمبر ۱۸۵۹ء) کو مرزا ولی عہد بہادر لندن سے ناکام واپس آئے (۴) ۱۳۰۵ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۸۷ء) میں واجد علی شاہ کا انتقال کلکتہ میں ہوا۔ (۵) مٹیا برج میں اپنے بنائے ہوئے امام باڑے میں دفن کیے گئے۔

ان تمام سیاسی پریشانیوں کے باوجود بادشاہ نے چند اہم امور بھی انجام دیئے۔ مثلاً فوج درست کی مضبوط سپاہیوں کے چند رسالے بھرتی کر کے ان کو نئے انداز پر تعلیم دینی شروع کی۔ قواعد کے لئے

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد ۵): ص ۲۶۳

(۲) سلطان عالم واجد علی شاہ: ص ۲۷۰

(۳) ایضاً، ص ۲۷۷

(۴) ایضاً، ص ۳۰۰

(۵) ایضاً، ص ۳۰۶

فارسی اصطلاحیں وضع کیں۔ بادشاہ خود میدان میں جاتے اور سپاہیوں کی مشق ملاحظہ فرماتے حالانکہ یہ امر بھی رزیڈنٹ کو ناگوار گزرتا تھا۔

فوج کی ترتیب کے ساتھ ساتھ بادشاہ نے شہر کی تزئین و آرائش کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ متعدد عالی شان عمارتیں بنوائیں وسیع اور پر فضا باغ لگوائے ان میں اہم ترین حضرت باغ، حضور باغ، سکندر باغ، بنارس باغ اور سب سے اہم قیصر باغ کی تعمیر ہے جس پر ۸۰ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

واجد علی شاہ نے اپنے عہد میں جو سکّے جاری کئے ان میں ایک طرف شعر کندہ کروایا (۱) اور دوسری طرف شاہی نشان جس میں بجائے عورتوں کے مچھلی دار پریاں بنائی گئیں جن کے ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں مگدر بنوایا درمیان میں ڈھال اس کے اوپر تاج اور تاج کے اوپر چھتر اور اس پر طوطا بنوایا۔ نیچے کی جانب دو تلوار اور ترچھے مگدر، اور سب سے نیچے لہر دار جھنڈا یا لکیر۔ کنارے گولائی میں کتبہ ہوتا، ضرب ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس'' (۲)

۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں واجد علی شاہ نے اپنے سکوں کے دوسری طرف بجائے ضرب ''ملک اودھ بیت السلطنت لکھنؤ'' کے ''ملک اودھ اختر نگر'' (۳) رکھا، کیونکہ بادشاہ شاعر تھے اور ان کا تخلص اختر تھا۔

واجد علی شاہ کے سکّوں سے متعلق پریاگ دیال کا بیان ہے:

> ''واجد علی شاہ کے سکّے بہت نفیس ساخت کے ہیں علاوہ روپیہ کے چاندی کی اٹھنی، چونّی، دونّی اور اکنّی پائی جاتی ہیں اشرفی میں نصف اشرفی بھی موجود ہے۔۔۔'' (۴)

مختصر یہ کہ اگر کمپنی امور سلطنت میں بے جا مداخلت نہ کرتی اور بادشاہ کو آزادانہ طور پر حکومت کرنے کا موقع ملا ہوتا تو اس بادشاہ کے عہد کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔

---

(۱) سکہ زد بر سیم و زر از فضل تائید الہ
ظل حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

(۲) صوبہ اودھ کے سکے: ص ۲۴۸

(۳) اس طرز کے سکے بہت کم ہیں وجہ یہ ہے کہ اسی سال ضرب کے نام میں پھر تبدیلی واقع ہوئی اور بجائے ''ملک اودھ اختر نگر'' کے بیت السلطنت لکھنؤ ملک اودھ اختر نگر'' ہوا۔

(۴) صوبہ اودھ کے سکے: ص ۲۴۸

مرزا برجیس قدر سکندر جاہ

انتزاع سلطنت کی خبر ملتے ہی اودھ کے راجاؤں اور زمینداروں نے بادشاہ واجد علی شاہ کے پاس درخواستیں بھیجیں کہ اگر بادشاہ اشارہ کردیں تو ہم انگریزوں سے جنگ کر کے سلطنت دوبارہ حاصل کرلیں لیکن بادشاہ نے ملک کی تباہی وخونریزی کے خوف سے ایسا نہ کرنے دیا اور فوجوں کو برطرف کر کے کلکتہ روانہ ہوئے۔

لیکن اس کے باوجود امراء وزمیندار طبقہ خاموش نہ رہ سکا اور ان سب نے متحد ہوکر بادشاہ کے نابالغ بیٹے برجیس قدر کو تخت پر بیٹھادیا(۱) اور ایک مجلس نیابت قائم کی جو برجیس قدر کے نام سے امور سلطنت انجام دیتی تھی۔

یہ سلسلہ نو مہینے تک جاری رہا اس کے بعد انگریز فوج کا لکھنؤ پر پوری طرح قبضہ ہوگیا۔ اور برجیس قدر کا پایۂ تخت بونڈی ضلع بہرائچ منتقل ہوگیا۔ ۱۲۷۴-۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں انگریز فوج بہرائچ میں داخل ہوئی اور وہاں بھی اپنا قبضہ کرلیا۔ برجیس قدر کو نیپال بھیج دیا گیا۔(۲)

اس طرح اودھ کی بادشاہی کا سلسلہ واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء کی ابتدا میں نہیں بلکہ اس کے دوسال بعد ۱۲۷۴ھ کے آخر میں ختم ہوا۔

وزرائے اودھ کی مدت وزارت ۱۴۳ سال ۳ ماہ اور ۲۴ دن ہے اور مدت بادشاہت ۴۱ سال کی ہے۔(۳)

---

(۱) سوانحات سلاطین اودھ: ص ۲۲۵

(۲) سلطان عالم واجد علی شاہ: ص ۲۸۳

(۳) تاریخ اودھ (جلد ۵): ص ۲۶۳

باب سوم

نوابین اور شاہان اودھ کے عہد کی تہذیبی اور سماجی زندگی

ہندوستان میں مشرقی تہذیب وتمدن کا نمونۂ آخر اودھ کا دربار تھا۔ یہاں کا انتظام سلطنت، عہدے، اختیارات، عہدہ دار، درباری شان وشوکت اور مشرقی روایات وغیرہ نے مل کر اس چھوٹے سے خطے کو مرکزی سلطنت کا جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا تھا۔ جس وقت دہلی میں مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی، مشرقی ہندوستان کے اس چھوٹے سے علاقہ اودھ میں تہذیب وتمدن بام عروج پر تھا۔ نوابین اودھ کی فیاضیوں اور انکی قدردانیوں نے اسے وہ رونق بخشی تھی جو انسانی تاریخ میں ایک روشن باب کے اضافے کا سبب بن گئی۔

اودھ میں جس تہذیب کا ارتقا ہوا، اسکی بنیاد چند عناصر پر تھی جن میں سب سے اہم عنصر یہاں کی خوشحالی تھی۔ یہ علاقہ دریائے گنگا کے میدان کا وسطی حصہ تھا جو نہایت سرسبز اور زرخیز تھا۔ یہاں کی آب وہوا مرطوب تھی اور سالہا سال بہترین اور عمدہ فصلیں تیار ہوتیں تھیں، آب پاشی کے لئے دریائے گنگا، گومتی، گھاگھرا اور راپتی کافی تھے۔ زراعتی علاقہ ہونے کے علاوہ یہاں کوئی بیس پچیس جنگلات بھی تھے جو شکار کھیلنے، مچھلیاں پکڑنے اور مویشیوں کے لئے چراگاہ کا کام دیتے تھے اور گھاس اور لکڑیاں مہیا کرنے میں معاون ثابت ہوتے تھے۔ چنانچہ زمین کی زرخیزی، سطح کی ہمواری، آب وہوا کا اعتدال، بارش کی کثرت، دریاؤں کی سہولت اور پانی کی فراوانی وغیرہ کے سبب اودھ کا سارا خطہ زراعتی کاروبار کیلئے انتہائی موزوں تھا۔

ملک کی اس قطعۂ اراضی میں شہروں اور قصبوں کی بہ نسبت دیہی علاقے زیادہ تھے۔ دیہاتوں کا درمیانی فاصلہ ڈیڑھ دو میل سے زیادہ نہ تھا شہروں اور قصبوں کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ آبادی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ نیچی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھا، صرف ایک چوتھائی حصہ تھا جس میں مسلمان، برہمن اور

راجپوت شامل تھے۔

یہاں کا پیشہ عموماً کاشتکاری تھا۔علاوہ بریں پارچہ بافی، سپہ گری اور سرکاری عہدے بھی شامل تھے۔ سرکاری محکموں میں نمایاں حیثیت شیخ، پٹھان اور مغل خاندانوں کو حاصل تھی۔ ان میں شیوخ زیادہ تر لکھنؤ، خیر آباد، کاکوری، فیض آباد، پلانی اور گوپامئو کے حصوں میں رہتے تھے۔ پٹھانوں کی آبادیاں خصوصاً ملیح آباد، الہ آباد، فرخ آباد، روہیلکھنڈ اور جونپور کے حصّوں میں تھیں۔ مغلوں یا ترکوں کی وابستگی عموماً فوجی یا تجارتی کاروباروں سے ہوتی لہذا وہ لکھنؤ یا فیض آباد میں ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ بیشتر برہمن مذہبی علوم کے جاننے اور رسوم وروایات کو ادا کرنے میں اپنا وقت گزارتے، راجپوت قوم یہاں کی نمایاں قوم تھی اور یہ تمام علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس قوم میں ہر پیشے کے لوگ موجود تھے۔

انتظام سلطنت

صوبۂ اودھ کے نظام سلطنت میں پہلا درجہ بادشاہ کا تھا یہاں کے حکمراں ابتدا میں نواب وزیر کے نام سے موسوم تھے۔ یعنی نواب صوبۂ اودھ اور وزیر سلطنت مغلیہ دہلی یہ سلسلہ نواب صفدر جنگ کے عہد سے شروع ہوا تھا جبکہ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں انھیں سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا گیا تھا۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں (۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء) یہاں کے حکمرانوں کو بادشاہ کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اگرچہ ان حکمرانوں کو خودمختار بادشاہوں کی سی حیثیت حاصل تھی لیکن درحقیقت اصل اقتدار و اختیارات کی مالک برٹش کمپنی تھی۔ چنانچہ اس وقت کی دوسری ریاستوں کی طرح دربار اودھ میں بھی کمپنی کی جانب سے ایک رزیڈنٹ کا تقرر ہوتا تھا(۱) جسے انتظام حکومت نیز دیگر معاملات میں اختیارات کلّی حاصل تھے۔ کسی کی تخت نشینی کا مسئلہ ہو یا شاہی ملازمین کی تقرری و برطرفی کا معاملہ یہ سبھی باتیں رزیڈنٹ کی مرضی اور اس کے اشاروں پر ہی عمل میں آتی تھیں۔

ابتدا میں رزیڈنٹ کا کام محض یہ تھا کہ وہ ملک میں رہ کر کمپنی کے مفادات کا تحفظ کرے اور دونوں حکومتوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرائے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ رزیڈینٹ کے اختیارات اور پالیسیوں میں تبدیلیاں آئیں نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اختیارات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا اور نوابین اودھ کی طاقت و آزادی ختم ہوتی گئی۔

بادشاہ اور رزیڈنٹ کے علاوہ تیسرا عہدہ نائب السلطنت یا وزیر اعظم کا تھا۔ جب تک اودھ کے حکمراں نواب وزیر کے نام سے موسوم تھے ان کے وزیر ''نائب السلطنت'' کہلائے اور جب ان حکمرانوں کو بادشاہت کا لقب حاصل ہوا تو یہ نائب بھی وزیر اعظم کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دونوں ہی حالتوں میں ان کے اختیارات یکساں تھے۔ ان کے سپرد بہت سی ذمہ داریاں تھیں۔ وقت پڑنے پر یہ شاہی قائم مقامی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ وزیر اعظم کی تقرری عموماً بادشاہ کی مرضی سے ہوا کرتی تھی۔

---

(۱) اودھ میں سب سے پہلے رزیڈنٹ ''ہارپر'' تھے جو نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔

وزیراعظم کے بعد دوسرا اہم عہدہ ''دیوان ریاست کا تھا یہ وزیراعظم کے ماتحت ہوتا تھا۔اس کے ذمہ شعبہ مالگزاری اور دیگر حساب کتاب کے معاملات ہوتے تھے۔تمام پرگنوں اور اضلاع کے کاغذات کی جانچ پڑتال، مالگزاری کی تشخیص اور وصول یابی وغیرہ کی تمام ذمہ داریاں اس کے سپرد ہوتی تھیں۔ اودھ کے مشہور دیوان ریاست میں رام نرائن اور ٹکیٹ رائے (۱) کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک عہدہ صوبہ دار اور ناظم کا بھی ہوتا تھا۔ریاست جتنے صوبوں پر مشتمل ہوتی اس کے مطابق ہر ایک صوبہ میں ایک ایک نائب صوبہ دار رکھا جاتا۔مثلاً نواب صفدر جنگ کے زمانے میں اودھ دو صوبوں پر مشتمل تھا۔چنانچہ اودھ میں محمد قلی خاں اور صوبہ الہ آباد میں علی قلی خاں نائب صوبہ دار تھے۔نائب صوبہ دار کے ساتھ ایک بخشی، ایک قاضی اور ایک صدر بھی ہوتا تھا۔جن علاقوں کے ناظم اچھے ہوتے تھے وہاں کی رعایا خوشحال و پرسکون زندگی گزارتی تھی۔مختصر یہ کہ تمام عہدے اختیارات اور انتظامات اسی طرح تھے جیسا کہ کسی بڑی ریاست میں ہوا کرتے ہیں۔

سلطنت کے بانی نواب سعادت خاں کا خاندانی تعلق ایران کے شاہان صفویہ سے تھا۔لہذا انکی نفاست اور شان وشوکت میں بناوٹ ذرہ برابر نہ تھی، مزاج میں حد درجہ سادگی تھی، نمائشی کرّ وفر سے دور رہے۔رہائش گاہ کے لئے شہری آبادی سے دور جگہ کا انتخاب کیا اور معمولی قسم کے مکانات تعمیر کروائے۔

آہستہ آہستہ آبادیوں میں اضافے ہوتے گئے شہر کی رونق بڑھی، تفریح گاہیں اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں۔نواب صفدر جنگ نے شہر فیض آباد کو مزید آراستہ کیا۔اگرچہ ان کا بیشتر وقت صوبے سے باہر گزرا اس کے باوجود ترقی کے بہت سے مواقع ان کے ہاتھ آئے۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں حالات کافی اچھے رہے۔اہل کمال کی قدردانی گویا انکی تہذیبی میراث تھی۔یہی وجہ تھی کہ ارباب علم وفن کی ایک قابل لحاظ تعداد فیض آباد کے دربار سے منسلک ہوئی۔چونکہ والیان ریاست ایرانی النسل تھے اس لئے فنون لطیفہ سے انکی دلچسپی بھی فطری تھی۔داد ودہش اور مردم شناسی کا جوہر بعد کے حکمرانوں میں بھی بتدریج بڑھتا رہا۔ان عناصر نے اس مشرقی علاقے میں ایک ایسی

---

(۱) رام نرائن نواب صفدر جنگ کے عہد میں اور ٹکیٹ رائے نواب آصف الدولہ ونواب سعادت علی خاں کے زمانے میں دیوان ریاست کے فرائض انجام دیتے رہے۔

تہذیب کی بنیاد ڈالی جسکی ابتداء آصف الدولہ کے عہد سے ہوئی اور انتہا واجد علی شاہ کے زمانے میں۔

''گذشتہ لکھنؤ'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا جس میں وضعداران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویئے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاکے عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ادنی و اعلی سب کی جیبیں روپیوں، اشرفیوں سے بھری ہوئیں تھیں اور ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔ نواب وزیر شجاع الدولہ بہادر شہر کی سرسبزی و رونق و رعایا کی مرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوی کرے گا'' (۱)

اس زمانے میں ہر جگہ کے اور ہر قسم کے اعلی دستکاروں اور صناعوں اور طالب علموں نے اپنے اپنے وطنوں کو خیر باد کہہ کے فیض آباد کو مسکن بنالیا تھا یہاں پر پشاور، کابل، کشمیر، شاہجہاں آباد (دہلی) حیدر آباد، مالوہ، گجرات، بنگال، ڈھاکہ، لاہور اور ملتان کے طلباء کے گروہ ہمہ وقت موجود رہتے یہ طلباء علماء کی درسگاہوں میں زیر تعلیم رہتے اور اس چشمۂ فیض سے جو فیض آباد میں جاری و ساری تھا، سیراب ہوتے۔ یہ ساری خوبیاں نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھیں۔

اس زمانے میں مذہب کی کوئی پابندی نہ تھی۔ ملک میں اکثریت ہندوؤں کی تھی لیکن مذہبی تعصب بالکل نہ تھا۔ ہندو مسلمان شیر و شکر تھے، ایک دوسرے کے تیوہار مل کر مناتے اور ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے دونوں گروہ یعنی شیعہ اور سنّی اس وقت بھی موجود تھے، لیکن ان میں آپس میں کوئی تفریق نہ تھی۔ اس زمانے کے مذہبی رسم و رواج کا اندازہ درج ذیل عبارت سے لگایا جاسکتا ہے:

''پیری، مریدی، عرس قوالی، چادر گاگر، شیخ سدو کا بکرا، میران جی کے گلگلے، احمد کبیر کی گائے، سید سالار کا جھنڈا، مدار صاحب کی کندوری، بابا شکر گنج کا کونڈا، بڑے پیر کی فاتحہ عام مذہبی رواسم تھے'' (۲)

---

(۱) گزشتہ لکھنؤ: ص ۱۷

(۲) تذکرۂ بے بہا: ص ۱۶۲

نوابین اودھ کا مذہبی تعلق مسلمانوں کے شیعہ فرقہ سے تھا، لیکن نماز، روزہ، نکاح، طلاق، کفن دفن عام طور پر اہل سنت کے طریقوں پر ہی انجام پاتے تھے۔ حتٰی کہ عیدین کی نمازیں بھی اہل تشیع، سنیوں کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ محرّم میں تعزیہ بڑی دھوم دھام سے نکالا جاتا تھا۔ شربت و شیرینی وغیرہ چڑھائی جاتی اور مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ تعزیوں کے جلوس میں طبل تاشا اور نقارا وغیرہ بجایا جاتا اور ''یا حسینؑ'' کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ بھی سیاہ پوش، سرو پا برہنہ علم لے کر نوحہ پڑھتے ہوئے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے گشت کرتے تھے۔ آگے چل کر یہی طریقہ تعزیہ داری کا سارے ہندوستان میں رائج ہوا حالانکہ قیاس ہے کہ یہ طریقہ ایرانی تھا۔ شجاع الدولہ کی پیدائش تو ہندوستان میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے اپنے والد اور نانا کو جس طرح علم وغیرہ اٹھاتے دیکھا تھا وہی طریقہ خود بھی اپنایا اور عوام میں بھی اسے رواج دلایا۔

اس زمانے میں فیض آباد ایک مذہبی دارالعلوم کی حیثیت رکھتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد میں شیعہ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام بڑے جوش و خروش کے ساتھ جاری رہا۔ مذہبی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں دور دراز علاقوں سے طلباء تحصیل علوم کے لئے آنے لگے اور بڑے بڑے علماء و فضلاء امامیہ مذہب کے تبلیغی کاموں میں مصروف ہوئے جسکا اثر یہ ہوا کہ عزاداری اور مرثیہ گوئی (۱) کو یہاں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔

اس سلسلہ میں نواب کے عہد کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں نواب شجاع الدولہ اٹاوہ فتح کر کے واپس آرہے تھے، راستہ میں محرّم آگیا، وہیں شیعوں کی ایک بستی ''جلالی'' (۲) میں ٹھہر گئے اور کپڑے کا امامباڑہ تیار کروا کے تعزیہ داری کی۔

لکھنؤ میں رونق اور ترقی کی شروعات نواب آصف الدولہ کے دور سے ہوتی ہے جنھوں نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دارالسلطنت قرار دیا اور وہیں سکونت اختیار کی۔ انکی تخت نشینی اودھ کی تاریخ میں ایک

---

(۱) تاریخی اوراق شاہد ہیں کہ نواب شجاع الدولہ کے انتقال پر خوب ماتم ہوا، ماتم کا یہ ہنگامہ کسی بھی یوم عاشورہ سے کم نہ تھا۔ وفات کے تیسرے دن ان کے مقبرہ پر مرثیہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ یہ مجلس امام باڑے میں منعقد ہوئی جو نواب مرحوم کے مقبرے سے ملحق تھا۔

(۲) ''جلالی'' ایک قصبہ ہے جو ضلع علی گڑھ میں واقع ہے۔

نئے دور کا آغاز ہے۔فنون لطیفہ کی ترقی اور اودھ کی تہذیب وتمدن کا زمانہ دراصل یہیں سے شروع ہوتا ہے اس سلسلہ میں ''گذشتہ لکھنؤ'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر اس کے اوج وعروج کا مقابلہ نہ کرسکتا، شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں پر صرف کرتے تھے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی اور شہر کی آرائش اور خوشحالی میں صرف کرنا شروع کیا۔اور چند ہی روز میں ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کرلی۔ان کا حوصلہ بھی یہی تھا کہ نظام حیدر آباد ہوں یا ٹیپو سلطان، کسی کے دربار کا کرّ وفر میرے دربار سے زیادہ نہ ہوسکے''(۱)

نواب آصف الدولہ کے عہد سے نوابین اودھ کے مشاغل میں غیر معمولی فرق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔اس عہد میں ملک کی ترقی اور عمارات کی تعمیر پر خاص زور دیا گیا۔فیض آباد کی عمارتیں صفدر جنگ کے مزاج کی سادگی اور مصروفیت کا پتہ دیتی ہیں لکھنؤ کی سی عالیشان عمارتیں فیض آباد میں نہیں بنائی گئیں۔ نواب سعادت خاں وصفدر جنگ نے رہائش گاہ کے لئے بھی معمولی درجہ کے مکانات ہی بنائے نواب شجاع الدولہ کا بیشتر وقت انگریزوں اور روہیلوں سے معرکہ آرائی میں گزرا۔لیکن نواب آصف الدولہ کو فن تعمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ اچھی عمارتیں بنوانے میں ان کا نام شاہجہاں کی طرح مشہور ہے۔عبد الحلیم شرر نے ''گذشتہ لکھنؤ'' میں انکی بنوائی ہوئی عمارات اور اس کے امتیازات پر اچھی بحث کی ہے۔دولت خانۂ آصفی، آصفی امام باڑہ، مسجد آصفی، رومی دروازہ، چھٹ کی کوٹھی، حسن باغ، عیش باغ، چہار باغ اور عاشورہ خانہ وغیرہ اس عہد کے فن تعمیر کے عمدہ نمونے ہیں۔جن پر نواب موصوف کے لاکھوں روپیے صرف ہوئے (۲)

اس دور میں سماجی حالات قدرے بہتر تھے۔سلطنت کے ذمہ جہانداری و جہانبانی کا کوئی خاص کام نہ تھا کیونکہ یہ عہدہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے سنبھال رکھا تھا، خارجی حملوں سے حفاظت کی پوری ضمانت تھی۔نواب سعادت خاں کے زمانے سے شجاع الدولہ کے عہد تک اودھ کی سلطنت شمشیر وسنان کی

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۳۲

(۲) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: (الف) گذشتہ لکھنؤ: شرر (ب) مشرقی تمدن کا آخری نمونہ: مرزا جعفر حسین (ج) شباب لکھنؤ: احمد علی (د) تاریخ اودھ (جلد ۳): نجم الغنی خاں

منزل میں تھی لیکن اب طاؤس ورباب کی منزل میں داخل ہورہی تھی۔ چنانچہ شاہ سے لے کر معمولی سپاہی تک ہر ایک نے تلوار ڈال کر عود و بربط سنبھال لیا تھا۔ ہر طرف عیش وطرب کی محفلیں تھیں۔ دولت کی فراوانی نے آرائش و زیبائش کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔ اس عہد کے معاشرے پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

''امراء کی ساری توجہ لباس، آرائش و انداز نشست و برخاست، اچھے کھانوں اور اچھی طوائفوں تک محدود تھی۔ اس کے نتیجے میں نفاست، تصنع اور تکلف کو لازماً فروغ پانا تھا۔ مہدی لگانا مسّی کی دھڑی جمانا، سروں پر بالوں کی پٹیاں جمانا، شوخ رنگ ریشمی کپڑے پہننا اور گفتگو سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک میں لوچ و لچک ملحوظ رکھنا شعار بن گیا تھا۔ اس خاص چیز کو لکھنوی معاشرت کی نمایاں خصوصیت قرار دینا چاہیے۔''(۱)

آصف الدولہ کے عہد میں سب سے بڑا تغیّر لکھنؤ کے مذہبی ماحول میں رونما ہوا۔ یعنی اودھ کے فرمانروایان اگرچہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر بحیثیت ایک منظّم قوم کے شیعوں کا وجود اب تک یہاں نہیں تھا۔ لیکن اس عہد میں شیعہ فرقہ کے مجتہد اوّل سید دلدار علی غفراں مآب (۲) عراق جا کر وہاں سے اجتہاد کی اجازت لے آئے اور شیعوں کو بحیثیت ایک قوم کے منظّم کیا گیا اس سلسلے میں ''تذکرۂ بے بہا'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''اول ظہرین کی جماعت آصف الدولہ کے عہد میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو روز جمعہ وزیر اعظم نواب حسن رضا خاں کے مکان میں واقع ہوئی اور اول جمعہ یہ جماعت مومنین ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ میں ہوا''۔(۳)

خود نواب آصف الدولہ دوسری تمام مصروفیات کے باوجود مذہبی رسوم کی پابندی کرتے تھے۔

---

(۱) دیباچہ گذشتہ لکھنؤ

(۲) سید دلدار علی غفراں مآب کی پیدائش صفدر جنگ کے عہد میں ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۳ء نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم سندیلہ اور الہ آباد میں حاصل کی اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ پھر کربلا گئے جہاں فقہ، حدیث و اصول فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد عراق گئے جہاں سید مہدی اور سید ہدایت اللہ اصفہانی سے استفادہ کیا اور انھیں بزرگوں نے اجازہائے اجتہاد عطا کیا۔ اس کے بعد ہندوستان واپس ہوئے (تذکرہ بے بہا ص ۱۶۲)

(۳) تذکرۂ بے بہا: ص ۱۶۲

تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتے ،محرّم میں پا پیادہ گشت کرتے اور شہر کے تعزیوں پر نذریں چڑھاتے تھے۔سخاوت کا یہ عالم تھا کہ دینے کا بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ان کے متعلق یہ مقولہ مشہور تھا کہ

''جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ''(۱)

نواب سعادت علی خاں کے عہد میں مذہبی روایات میں کچھ اور اضافے ہوئے ،جن کی سختی کے ساتھ پابندی کی جانے لگی۔تعزیہ داری بڑے اہتمام اور انہماک سے ہوتی۔چہلم کی تعزیہ داری انہی کی قائم کردہ ہے اس سے پہلے ہندوستان میں صرف دس دن تعزیہ داری ہوا کرتی تھی۔

تعمیرات کا شوق نواب سعادت علی خاں کو بھی تھا۔شروع شروع میں کوٹھی فرحت بخش کو مسکن بنایا اس سے متصل کئی ایک مکانات بنوائے قریب ہی رزیڈنٹ کی سکونت کے لئے ''ٹیڑھی کوٹھی''،تعمیر کروائی اپنے دربار کیلئے لال بارہ دری کی تعمیر کروائی جوان دنوں ''قصر السلطان'' کے نام سے مشہور تھی(۲) اس کے علاوہ دل آرام،دلکشا اور حیات بخش کے نام سے خوبصورت اور عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔

غازی الدین حیدر اور انکی بیگم ''بادشاہ بیگم'' کو مذہبی معاملات سے بڑی دلچسپی تھی۔ان کے اس انہماک کی وجہ سے اس دور میں شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ساتھ ہی ''خاندان اجتہاد''(۳) کو بھی عروج حاصل ہوا۔یوں تو تمام فرمانروایان اودھ کا مذہب تشیع تھا لیکن حکومت کا طریقہ کار وہی تھا جو سارے ملک میں قائم تھا۔مگر اب ایسا محسوس ہوتا تھا گویا شیعیت حکومت اودھ کا ایک نمایاں عنصر بن چکی تھی۔

اس سے پہلے فرنگی محل کے علماء مذہبی امور کے ذمہ دار ہوا کرتے تھے لیکن اب انکی جگہ خاندان اجتہاد کے شیعہ عالماء نے لے لی تھی۔اگر شیعہ مذہب بھی اپنی اصلیت اور اعتدال پر قائم رہتا تو بھی صحیح تھا لیکن خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ سرگرمیوں نے شیعہ مذہب میں نئی نئی بدعات ایجاد کیں،نتیجہ یہ

---

(۱) تاریخ لکھنؤ:ص ۴۳

(۲) گذشتہ لکھنؤ:ص ۴۸

(۳) سید دلدار علی غفراں مآب کا خاندان ''خاندان اجتہاد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ان کے پانچ بیٹے اور تیرہ پوتے مسند علم و فضل پر متمکن رہے۔ان کے پوتوں میں آٹھ(۸) اپنے عہد کے مجتہد اعظم ہوئے ہیں اس مناسبت سے اس خاندان کا نام ''خاندان اجتہاد'' پڑ گیا۔

ہوا کہ یہاں کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے ایک الگ چیز بن کر رہ گئی ۔ مثال کے طور پر امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم کی بدعت ایجاد کی گئ ۔ اس کے لئے باقاعدہ زچہ خانہ اور زچگی کے تمام لوازمات اور رسوم عمل میں لائے گئے ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ سیّدوں کی خوبصورت کنواری لڑکیاں لے کر انھیں بارہ اماموں کی بیویاں قرار دیا گیا، اور ان کا نام ''اچھوتیاں'' رکھا گیا ۔ ان کے یہاں فرضی ولادت ہوتی اور ولادت کے بعد کی تمام رسوم بڑے دھوم دھام سے منائی جاتیں ۔ ان سب باتوں کا نتیجہ ایک طرف تو غلط مذہبی رجحانات کی شکل میں ظاہر ہوا، دوسری طرف عیاشیوں اور غلط کاریوں کو فروغ ہوا، کیونکہ جو ''اچھوتیاں'' کہلاتی تھیں ۔ بادشاہ بیگم کی شریعت میں ان کے لئے نکاح حرام تھا ۔ (۱) غرض کہ یہ اور قسم کی بہت سی چھوٹی بڑی باتیں مذہب میں شامل ہو چکی تھیں ۔

نصیر الدین حیدر نے اپنے عہد میں چند لغو بدعات مزید شامل کر لیں گویا مذہب کو بازیچۂ اطفال ہی بنا دیا، ملاحظہ ہو:

> ''دھرگاہ روز ولادت کدام امام فرخندہ فرجام رسیدی مثل زنان باردار خود را بدردزدہ وطلق و مخاص از راہ تصنع مبتلا ساختی و بجای طفل یک لعبت مرصع پیشش می گزاشتند و خود در زچہ خانہ می نشستند و پرستاران مخصوصہ ایں خدمت طعامی کہ برای زچہ معین است بکمال احتیاط پختہ می خورانیدند دوران ایام کسی آنحضرت را مس نمی ساخت و ہرگاہ ششم روز می شد آنحضرت غسل می فرمودند و پرستار آن طفل جواہر نگار را بیک گوشہ بردہ بدست گرفتہ می ایستاد و پرستار دیگر چند سبو چہ آب را در انجا فرومی ریخت ایں را بجائے غسل طفل قرار دادہ بودند وقت شب بہ آرائش و پیرائیش زنانہ آں طفل را در آغوش گرفتہ ... مثل زنان نوزادہ برائے ستارہ بینی کہ رسم اہل ہند است در صحن مکاں با کمال شوکت وشان برمی آمدند ...'' (۲)

غرض کہ بادشاہ کو اپنے مذہب اور اس سے وابستہ رسوم سے خاص شغف تھا سال کے بیشتر ایام اپنے ایجاد کردہ مذہبی بدعات میں منہمک رہتے ۔ شیعہ مذہب کا دور دورہ تھا ۔ عشرۂ محرّم کا بیان مرزا رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں اچھی طرح کیا ہے ۔ محرّم کے زمانے میں بادشاہ اپنے اعزّہ و

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۴۱

(۲) وقائع دلپذیر: ص ۲۵

اقارب ہی کے مجمع میں رہتے۔ شراب پینا، دعوتیں دینا اور عیش وعشرت کی محفلوں میں شریک رہنا موقوف ہو جاتا۔ اس کے علاوہ انگریزی مذاق کی جتنی باتیں انھیں پسند تھیں وہ بھی چھوڑ دیتے۔ ان دنوں انگریز مصاحبین کو بھی حضوری بادشاہ کا موقع نہ ملتا تھا اور دربار بھی نہ لگتا تھا تمام ملکی و مالی کاروبار ۲۱ صفر تک ملتوی رہتے تھے ''فسانۂ عبرت'' کے مصنف کا بیان ہے:

''عشرہ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مسکرانا محال تھا۔ روز شب غم اہلبیتؑ میں رونا، اربعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالہ وآہ، ہزار ہا روپیہ اور جہان کی نعمت مرثیہ خوان وسید محتاج آب ونان پاتے'' (۱)

حقیقت یہ تھی کہ بادشاہ کے اخراجات حد سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے ملک کی آمدنی محل کے اخراجات کے لئے ناکافی محسوس ہونے لگی کیونکہ وابستگان دربار تہذیب وتمدن کی نت نئی روایتیں قائم کر رہے تھے لیکن عام رعایا کے حالات اچھے نہیں تھے۔ ملک میں شورش اور بدامنی پھیلنے لگی جسے کم کرنے کے لئے بادشاہ کو فرصت تھی نہ ہی ضرورت، کیونکہ سلطنت انگریز کمپنی کی حفاظت میں تھی۔

محمد علی شاہ کے مختصر دورِ حکومت میں حالات کچھ بہتر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے درباری ماحول میں جو بے راہ روی آ گئی تھی اس پر بڑی حد تک قابو پانے کی کوشش کی۔ مذہب اور شرع کے بہت پابند تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو دکھانے کے لئے مذہب سے دلبستگی اہل دربار بھی ضروری خیال کرنے لگے۔ اس زمانے میں جو تعمیرات ہوئیں ان میں بھی بیشتر امام باڑے اور مساجد تھیں۔ لکھنؤ کا امام باڑہ ''حسین آباد'' محمد علی شاہ کے فن تعمیرات کی ایک بے نظیر یادگار ہے۔

امجد علی شاہ کی دینداری یوں بھی مشہور ہے۔ انھیں امورِ سلطنت سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنا کہ مذہبی رسوم وروایات کے دلدادہ تھے۔ مذہب امامیہ کے پیرو تھے لہذا عزاداری نے اس عہد میں خوب ترقی کی۔ ان کے مذہبی اعتقادات سے متعلق کئی واقعات تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً:

''ایک بار مرزا حیدر شکوہ شاہزادہ خاندان تیمور نے امجد علی شاہ سے عرض کیا کہ ایک رات میرے تعزیے خانے شعاع آفتاب سے بھی تیز نور حضرت امام حسین کی ضریح پر ظاہر ہوا

---

(۱) فسانۂ عبرت: ص ۲۳

درودیوار اور چھت بھی زیادہ چمکنے لگی اور حضرت عباس کا علم جو ضریح کے پاس کھڑا تھا وہ ضریح پر جھک گیا بادشاہ نے یہ سن کر ڈھائی ہزار روپیہ دے کر شاہزادے سے وہ ضریح وعلم خرید کے اپنے تعزیہ خانے میں رکھوالئے، اس طرح ایک دن میر ذکی مرثیہ خاں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میرے مکان میں حضرت امام حسینؑ کا پنجہ موجود ہے، بادشاہ نے وہ مانگ لیا اور انعام بخشا'' (۱)

اس طرح کے مذہبی اعتقادات سے قطع نظر امجد علی شاہ تمدنی ارتقاء کی طرف سے بھی بے خبر نہ تھے۔ انہیں اس بات کی خواہش تھی کہ تمام رعایا کے مکانات یا تو رنگین کردیئے جائیں یا ان پر نقش ونگار بنادیئے جائیں۔ اپنے متعلق ان کو یہ گمان غالب تھا کہ وہ عمارت سازی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں ''امین آباد'' اور ''حضرت گنج'' تعمیر ہوئے جو لکھنؤ شہر کے خوبصورت ترین حصّے سمجھے جاتے ہیں۔

اس عہد میں عنان سلطنت سلطان العلماء (۲) اور سید العلماء کے ہاتھوں میں تھی، مقصد یہ تھا کہ سرکاری امور شرعی طریقے سے انجام دیئے جائیں۔ چنانچہ محکمۂ شرعیہ کی تجویز رکھی گئی۔ جس کے ذمہ عدلیہ، فوجداری، آبکاری، امور خبر اور نشہ آور اشیاء پر پابندی وغیرہ جیسے امور سونپے گئے۔ تجویز کے منظور ہوتے ہی محکمۂ شرعیہ قائم ہوا جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ محکمہ کے تحت سب سے پہلے شراب پر سختی سے پابندی عائد کی گئی، اور شراب کی تمام دکانیں بند کرادی گئیں۔ ہر نظامت پر قاضی مقرر ہوئے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ اودھ میں شیعہ، مفتی وقاضی مقرر ہوئے تھے۔ اس طرح ہندوؤں کیلئے بھی فاضل برہمن قاضی کے عہدے پر مقرر کیے گئے۔ شرعی قوانین کے تحت اور بھی بہت سی سختیاں عائد ہوئیں ان میں طوائفوں کا خاتمہ کیا گیا ائمہ اہل بیت کی ولادت اور وفات کی تعطیلیں معین ہوئیں، تعزیہ داری کو بہترین کارثواب قرار دیا گیا۔ ہر شخص مجلس وماتم کرتا تھا حتی کہ ہندو حضرات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ غرض کہ اس عہد میں ہر طرف ایک خاص قسم کا مذہبی ماحول نظر آتا ہے جس میں شیعیت کا عنصر نمایاں ہے۔

لیکن واجد علی شاہ کا دور آتے آتے حالات میں تبدیلیاں آئیں کیونکہ یہ بادشاہ موصوف

---

(۱) تاریخ اودھ (جلد ۵): ص ۲۴

(۲) سید دلدار علی غفراں مآب کے دو بیٹے ''سید محمد'' معروف بہ سلطان العلماء اور سید حسن معروف بہ سید العلماء تھے۔ عوام میں مجتہد العصر وقبلہ وکعبہ کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

تعصب سے پاک تھے۔ خود شیعہ تھے مذہبی امور کے پابند بھی تھے لیکن انکی نظروں میں شیعہ سنّی کی کوئی تفریق نہ تھی ورنہ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ مذہبی احکام کی سختی سے پابندی کرتے ہیں ان میں تھوڑا بہت تعصب کا عنصر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عبدلحلیم شرر کا بیان خاص اہمیت کا حامل ہے ملاحظہ ہو:

> ''بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ ''میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سنّی ہے'' ... بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنّیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منصرم الدولہ بہادر سنی تھے، منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانور خانے، کل اہل قلم اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سنّی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے ملازموں حتی کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی سنی تھے۔ عطار الدولہ اور داروغہ معتبر علی خان جو آخر میں سب سے بڑے عہدے دار اور کل کاروبار کے مالک تھے، دونوں سنّی تھے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجا لانے کا انصرام بھی سنّیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنی ہے اور کون شیعہ'' (۱)

واجد علی شاہ مذہبی معاملات میں کسی قسم کی رورعایت سے کام نہ لیتے تھے۔ امام حسینؑ کی عزاداری ان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا، عزہ داری کے مقدس فرض کو وہ اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ اس عہد کا لکھنؤ ہندوستان بھر میں عزہ داری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ محرم کے دنوں میں لاکھوں روپے مذہبی امور و عقائد کے پورا کرنے پر صرف ہوتے۔ ''قصر العزا'' کے نام سے انھوں نے ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کروایا جسے بعد میں ''قیصر باغ'' کی بارہ دری کہا جانے لگا۔

سیاسی اعتبار سے واجد علی شاہ کا زمانہ اگرچہ زوال پذیری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس دور کے اودھ میں خصوصاً لکھنؤ میں علوم و فنون کی جو ترقیاں ہوئیں، انہیں کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ: ص ۴۵

امور مملکت سے متعلق بادشاہ کی مصروفیات کا اندازہ ''احسن التواریخ'' کی عبارت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ملاحظہ ہو:

''بادشاہ بہ تعمیل قواعد عدالت طلوع صبح سے آدھی رات تک ایک دم استراحت نہیں فرماتے اور بملاحظۂ عرض داشت سائلان و اہل معاملات و مرفوعات ارباب حاجات وقراطیس و قایع بلاد وقریات اور بہ سماعت روداد زبانی عرض بیکیان وخواہش مندان بحضور خاص سے تعرض وتعلق متوسطان واجرائے احکام و داد دہی مستغیثان وتعزیر جفا پیشگان و تنقیح مقدمات ملکی و مالی وتقرر وظائف ادانی و اعالی مصروف رہتے ۱۰۰۰ اکثر مقدمات بہ تجویز خاص بادشاہ تصفیہ ہوتے''(۱)

مختصر یہ کہ اس عہد کے پورے معاشرے میں رعایا خوش حال تھی اور بادشاہ پر نثار تھی۔ خود بادشاہ کو بھی عوام کا خاص خیال تھا۔ مذہب میں اگرچہ شیعہ، سنّی کی تفریق تھی لیکن یہ دونوں برابر سمجھے جاتے تھے۔ ہندو مذہب اپنی جگہ عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا، ہر مذہب وملت کے وابستگان مطمئن تھے۔ بادشاہ عوام وخواص میں حد درجہ ہر دلعزیز تھا۔ ان تمام اچھائیوں کے باوجود انگریزی حکومت نے بادشاہ میں متعدد خامیاں بیان کرتے ہوئے انھیں حکومت کے اقتدار سے برطرف کر دیا۔

سیاسی اتار چڑھاؤ سے قطع نظر چند باتیں اودھ کے معاشرے میں ایسی تھیں جو وہاں کے خواص میں شامل ہیں۔ یہاں کے عام باشندے اپنی عادات واطوار کے اعتبار سے بڑے معتدل، نرم مزاج، پرتحمل اور مہمان نواز رہے ہیں۔ انداز گفتگو میں شیرینی وشائستگی یہاں کا ایک خاص امتیاز ہے۔

معاشی فارغ البالی کی وجہ سے شاہان اودھ میں عیش پسندی کے عناصر، ان کے رہن سہن، کھانے پینے اور ذوق وشوق ہر چیز سے نمایاں تھے۔ جمال پرستی اور مئے نوشی لوازمۂ عشرت خیال کی جاتیں تھیں۔ نواب شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک بہ استثنائے امجد علی شاہ کوئی حسن پرستی کے جذبے سے بیگانہ نظر نہیں آتا۔ شجاع الدولہ کے متعلق ایک تذکرے میں ہے:

''ان کے حرم میں دو ہزار سات سو سے زیادہ عورتیں تھیں جن میں سے دو ہزار خواصیں اور سات سو ایک ان کے محلات تھے۔ ان میں سے بہو بیگم صاحبہ خاص محل تھیں اور باقی

---

(۱) احسن التواریخ: ص ۴۳۔۴۴

بیویاں خورد محل کہلاتی تھیں''(۱)

نواب سعادت علی خاں کے متعلق ہے:

''نواب ایسے حسن پرست تھے کہ اہل شہر حسن پرستی کا لفظ ان کی نسبت اطلاق کرتے ہیں''(۲)

غازی الدین حیدر بادشاہ بھی اپنے ذوق حسن پرستی میں طاق تھے چناچہ ان کے عہد حکومت میں لکھنؤ کے گلی کوچے مینا بازار بن گئے تھے۔ان کے صاحبزادے نصیرالدین حیدر نے بھی اس ذوق کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رکھی واجد علی شاہ کا عہد آنے تک یہ ذوق اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔خواصوں کے زمرے میں جو حسین عورتیں آتی تھیں انھیں ''حضور والیاں'' کا خطاب دیا گیا۔خادماؤں اور کنیزوں کی کوئی گنتی تھی نہ کمی تھی۔عورتوں کی ایک بڑی تعداد ''پری خانہ''(۳) میں رقص وموسیقی سے متعلق داخل تھی۔

واجد علی شاہ فن موسیقی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے وہ اسے مزے کے لئے نہیں بلکہ علم وفن کی حیثیت سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔اس کیلئے وہ خود بھی ریاضت کرتے اور دوسروں سے بھی اس قسم کی توقع رکھتے تھے۔

چند دوسری باتیں جو لوگوں کے شوق اور دلچسپیوں کا باعث تھیں ان میں بٹیر بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ بازی وغیرہ شامل تھیں۔کبوتر، بٹیر اور مرغ وغیرہ عام طور سے پالنے کا رواج تھا لیکن بادشاہ رؤساء کے یہاں نہ صرف یہ پالے جاتے بلکہ انھیں لڑائی کی بھی باقاعدہ تعلیم دی جاتی، اور پھر آپس میں ایک دوسرے کے کبوتر لڑائے جاتے۔اس لڑائی کا باقاعدہ اہتمام ہوتا اور دیکھنے والوں کیلئے یہ تماشا خاصا دلچسپ رہتا تھا۔اودھ میں شاہی دلچسپی کا یہ ایک خاص شعبہ تھا۔واجد علی شاہ خود بھی کبوتروں کے بڑے شوقین تھے۔اس طرح بٹیر بازی ومرغ بازی کو اس عہد میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

پتنگ بازی کا شوق لوگوں میں عام تھا۔پتنگ کی کئی قسمیں تھیں جن میں ''کنکوا'' زیادہ

---

(۱) چہار گلزار شجاعی: ص ۵۱۸

(۲) تاریخ اودھ (جلد۴) :ص ۲۲۵

(۳) واجد علی شاہ نے ''پری خانہ'' کے نام سے ایک خوبصورت ہال تعمیر کروایا جس میں خوبصورت اور حسین عورتوں کو رقص و سرور کی تعلیم دی جاتی تھی۔(تاریخ لکھنؤ: ص ۱۳۹)

رائج تھا۔لوگ کنکوالڑانے اوراونچا اڑانے کے دلدادہ تھے۔یہ کنکوے بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیے جاتے اور پیچ لڑائے جاتے۔لوگوں میں یہ شوق بھی فن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

فرمانروایان اودھ سیر وتفریح کے ساتھ ساتھ شکار کے بھی شوقین تھے۔سیر وتفریح کے ذوق کی تکمیل کیلئے فیض آباد اور لکھنؤ کے علاقوں میں سینکڑوں قسم کے باغات موجود تھے جنکی تفصیلات ہم عصر مؤرخین اور دوسرے سیاحوں(۱) کے بیانات سے ہوتی ہے۔اودھ میں شکار کا شوق رکھنے والوں کے لئے شکارگاہوں کی بھی کثرت تھی۔''سفرنامۂ سلیمین'' سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہاں ترائی والے علاقے کے علاوہ ۲۴ جنگلات اور بھی تھے جو ۸۸۶ مربع میل میں پھیلے ہوئے تھے(۲) اور شکار کیلئے بڑی کثرت سے جانور موجود تھے۔حکمراں طبقہ کے علاوہ عام لوگوں کو بھی شکار کھیلنے کی اجازت تھی۔

سپہ گری اس زمانے میں ایک ایسا فن تھا جسے تقریباً نوے فیصدی لوگ ضرور سیکھتے تھے۔علماء کو چھوڑ کر باقی سبھی لوگ اسلحہ سے لیس رہتے۔سپہ گری کے علاوہ شہسواری، چابک سواری، شہزوری اور تیراکی بھی یہاں کے فنون میں شامل تھیں، واجد علی شاہ خود ایک اچھے تیراک تھے۔(۳)

کھانے پینے سے متعلق اشیاء میں اس دور کا اودھ بالخصوص لکھنؤ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔قسم قسم کے کھانوں میں لکھنؤ کے باورچیوں نے حیرت انگیز کمالات دکھائے۔جنکی تفصیل میں اگر جایا جائے تو ایک الگ دفتر درکار ہوگا۔پلاؤ، زردہ، قورمہ، قلیہ، تنجن، شیر برنج، باقر خانی، شیر مال اور کباب وغیرہ دراصل ایرانیوں کی دین ہیں، لیکن لکھنؤ کے باورچیوں نے ان کے مزے اور قسموں میں جو اضافے کئے اس سے اہل ایران بھی ناواقف تھے کباب کی پچاس قسمیں، بیسیوں قسم کے چاول، قورمے، پلاؤ کی تو انگنت قسمیں ایجاد ہوئیں قسموں میں جو اضافے ہوئے ان سے اہل ایران بھی ناواقف تھے کباب کی پچاسوں قسمیں ایجاد ہوئیں جن میں سے ہر ایک کا ذائقہ الگ ہوتا تھا۔

شاہان اودھ کی اس خوش خوراکی نے اودھ میں بڑے بڑے باورچی اور رکابدار پیدا کر دیئے تھے۔

---

(۱) سفرنامۂ کیپٹن لیو پولڈ وان اورلچ (جلد دوم)

(۲) سفرنامہ سلیمین: ص ۶۸

(۳) تاریخ لکھنؤ: ص ۱۵۲

مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے باورچی خانے کا خرچ دو تین ہزار روپیہ روزانہ تھا۔ اس سلسلہ میں مرزا جعفر حسین کی کتاب ''لکھنؤ کا دسترخوان'' ایک اہم ماخذ ہے جس میں تمام تفصیلات درج ہیں۔ پیش ہے اسی کتاب سے ایک اقتباس:

''لکھنؤ کے باشندوں کیلئے نفاست ونزاکت اور رنگینی وتنوع سے زندگی کو سنوار لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا، ان کے مذاق ومزاج میں فنکارانہ صلاحیتیں بس گئی تھیں۔ غذاؤں پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ توجہ تھی۔ اس لئے ہر رئیس ایجادات واختراعات کے پہلو نکالا کرتا تھا۔ انھیں رئیسوں کی سرپرستی اور قدردانی کی بدولت بہترین باورچی پیدا ہوتے رہتے تھے''(۱)

نواب سعادت علی خاں کے باورچی کے متعلق مشہور ہے کہ سادہ چاولوں کی ایسی گلتھی پکاتا تھا کہ ہر کھانے والا اس کے ذائقے پر فریفتہ ہو جاتا تھا۔ غازی الدین حیدر کے باورچی کا پراٹھے پکانے میں کوئی جواب پیدا نہیں ہوا۔ ناصر الدین حیدر کے زمانے میں ایک باورچی بادام اور پستے کتر کے اس کی ایسی نفیس کھچڑی تیار کرتا تھا جو ماش کی دال کی کھچڑی کہلاتی اور نظر آتی تھی لیکن کھانے میں اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد کا ایک واقعہ مشہور ہے۔

''آخری دور میں واجد علی شاہ کے دسترخوان پر ایک ظرف میں مربّے پر نواب سلیمان قدر کو قورمہ کا دھوکا ہو گیا تھا۔ نواب موصوف بڑے صاحب ذوق تھے اور ان کے یہاں بھی اعلیٰ درجہ کے ہنرمند باورچی ملازم تھے انھوں نے بادشاہ کو مخصوص طور پر کھانے کی دعوت دی اور وہ بھی تیار ہو کر گئے کہ ان کو دھوکہ دیا جائے گا لیکن پھر بھی دھوکہ کھا گئے اس دسترخوان پر تمام غذائیں شیریں تھیں یہاں تک کہ دسترخوان، ظروف اور سلفچہ تک شکر سے تیار کیا گیا تھا۔''(۲)

مشرقی کھانوں کا یہ مخصوص رنگ یوں تو واجد علی شاہ کے عہد تک قائم رہا لیکن نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے انگریزی کھانے بھی استعمال کئے جانے لگے تھے مثلاً قہوہ، چائے انڈا، مکھن وغیرہ

(۱) لکھنؤ کا دسترخوان: ص ۱۳

(۲) لکھنؤ کا دسترخوان: ص ۱۵

اس کے علاوہ غازی الدین حیدر کے عہد سے دسترخوان کے بجائے میز کا چلن رائج ہوا۔

اشیائے خوردنی کے علاوہ لباس وغیرہ کے معاملے میں بھی اہل اودھ نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ دربار مغلیہ کے عہد تک جو لباس حکمراں طبقہ میں رائج تھا وہی لباس اودھ میں نواب آصف الدولہ کے عہد تک برقرار رہا۔ اس میں سر پر پگڑی، بدن میں شلوکہ اور اس کے اوپر جامہ جو بہت کچھ عجمی قبا سے ملتا جلتا تھا۔ کمر میں پٹکا، ٹانگوں میں تنگ مہریوں کا پائجامہ اور پیروں میں کفش نما ایڑی دار جوتا شامل تھا۔ سعادت علی خاں کے عہد سے پگڑی کی جگہ شملہ اور جامہ کی جگہ ''بالابر'' نے لے لی تھی۔ پائجامہ کی تنگ مہریاں بھی چوڑے عرض کے پائچوں میں تبدیل ہوگئی تھیں ان کے علاوہ انگریزی لباس بھی پسند کئے جانے لگے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں پگڑی کا رواج کم ہوگیا تھا صرف دربار میں حاضری کے وقت گول کارچوبی ٹوپی پہنی جاتی تھی۔

عورتوں کا لباس کم وبیش وہی تھا جو عام طور پر سارے ہندوستان میں رائج تھا یعنی چنا ہوا دوپٹہ، کرتا اور چست پائجامہ، آرائش و زیبائش پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ بناؤ سنگھار کے علاوہ زیورات کا کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ شاہی گھرانے کی عورتیں جو زیورات استعمال کرتی تھیں ان میں قیمتی موتی، زمرّد، ہیرے، نیلم اور پکھراج وغیرہ کا جڑاؤ کام ہوتا تھا۔ اس زمانے میں پردے کا رواج عام تھا۔

اس دور میں مختلف علوم وفنون کے ساتھ شعروادب نے بھی خوب ترقی کی۔ جس کا ذکر اگلے باب میں تفصیل سے آئے گا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کا یہ چھوٹا سا خطہ جسے اودھ کے نام سے جانا جاتا تھا تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جس نے تقریباً اپنے ڈیڑھ سو سالہ دوران حکومت میں قومی یگانگت اور یک جہتی کی ایک ناقابل فراموش مثال پیش کی۔

باب چہارم

نوابین اودھ کی علمی وادبی سرپرستی

اودھ کے حکمرانوں نے سلطنت میں اپنے سیاسی استحکامات بحال کرنے کے بعد سب سے پہلے علم وادب کی ترویج وترقی پر توجہ مرکوز کی۔اس کام میں حکمرانان اودھ نے بڑے ہی ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا اور علم وادب کے شعبہ میں قابل قدر خدمات انجام دیتے ہوئے گذشتہ حکومتوں کے علمی ورثے میں ممکن حد تک اضافہ کیا۔

سیاسی اعتبار سے ان حکمرانوں کے لئے اودھ کی فضا کبھی بھی سازگار یا سکوں بخش نہیں رہی۔انہیں ہمیشہ کچھ اس طرح کے حالات کا سامنا رہا جو انکی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے رہے،لیکن ان تمام پریشانیوں اور ناسازگاریوں کے باوجود نوابین اودھ نے علمی وادبی سرپرستیوں سے کبھی سرمو انحراف نہیں کیا۔ان کے زیر سایہ شعروسخن اور علم وادب نے خوب ترقی کی۔اودھ اور اس کے اطراف میں صدہا دانشور اور اہل علم پیدا ہوئے جو شاہان اودھ کی سرپرستیوں کی بدولت عزت وشہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔

ان سرپرستیوں کا سلسلہ نواب سعادت خاں برہان الملک سے شروع ہوکر نواب واجد علی شاہ پر ختم ہوتا ہے۔شاہان اودھ میں سے ہر ایک نہ صرف یہ کہ علم وادب کا قدردان تھا بلکہ اپنی ذات میں آپ ایک بڑا عالم اور شاعر تھا۔

تاریخی اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ صوبۂ اودھ میں پانچ پانچ دس دس میل کے فاصلوں پر شرفاء کی بستیاں آباد تھیں۔جہاں بڑے بڑے علماء وفضلاء درس وتدریس میں مصروف رہا کرتے تھے۔ سلاطین وحکام کی جانب سے ان مدرسوں اور علمی مراکز کے لئے جائدادیں وقف ہوا کرتی تھیں۔اودھ کے مدارس اور خانقاہوں میں جوق در جوق طلبہ تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔نہ صرف حکمراں وسلاطین بلکہ اچھے اور صاحب ثروت گھرانے کے لوگ ان مدرسوں اور خانقاہوں کی اعانت کرتے تھے۔

نواب سعادت خاں برہان الملک ایران کے رہنے والے تھے۔ شعروادب سے انھیں غایت درجہ دلچسپی تھی۔ وہ خود ایک اچھے شاعر تھے اور شعراء کے بڑے قدردان تھے۔ ان کے دربار سے وابستہ اہم ترین شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے چند ایک کا مختصر (۱) تذکرہ حسب ذیل ہے:

احمد قلی خاں ایمنؔ: ایران کے رہنے والے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور نواب برہان الملک کے امرائے خاص میں جگہ پائی (۲)

شیخ عبدالرضا متینؔ: اصلاً عرب کے تھے۔ پیدائش اصفہان میں ہوئی۔ محمد شاہ کے عہد میں دہلی آئے اور کچھ عرصہ بعد اودھ روانہ ہوئے اور نواب کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ نواب صفدر جنگ کے عہد میں بھی ان کی شاعری کا چرچا رہا۔ صاحب سفینۂ ہندی لکھتا ہے:

''از تصوف بہرہ داشت و راغب صحبت آن بود'' (۳)

میر عبدالعلی طالعؔ: یہ شیراز کے تھے۔ پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ایک عرصہ تک نواب کی رفاقت میں رہے اور اودھ میں انتقال ہوا۔ (۴) شرف تلمذ اپنے چچا سید محمد ثاقب سے حاصل کیا۔

آغا عبدالعلی تحسینؔ: ان کا آبائی وطن شہر ''ری'' تھا۔ مرزا داراب بیگ جویاؔ کے نواسے تھے۔ (۵) نواب کے ملازموں میں جگہ پائی اور اپنے کلام کی وجہ سے بے پناہ شہرت پائی۔

سید محمد فدائی: ایران کے شہر ہمدان کے رہنے والے تھے۔ نواب کے ملازموں میں سے تھے۔ (۶)

شاہ فصیح افصحؔ: فارسی کے مشہور صاحب دیوان شاعر، افصحؔ کے آباواجداد بخارا کے تھے۔

---

(۱) تفصیلات شعراء کے باب میں ملاحظہ ہو۔

(۲) سفینۂ خوشگو: ص ۲۶۵

(۳) سفینۂ ہندی: ص ۱۸۹

(۴) ایضاً، ص ۱۲۸

(۵) ایضاً، ۴۱

(۶) ایضاً، ۱۵۹

افصح کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ شروع میں دہلی میں قیام رہا۔ اس کے بعد لکھنؤ آ گئے۔ شعر وسخن میں مرزا بیدلؔ کے شاگرد تھے۔(۱)

مرزا امام قلی حشمتؔ: دہلی کے رہنے والے تھے۔ کچھ عرصہ نواب کی رفاقت میں بسر کیا۔(۲)

میر محمد افضل ثابتؔ: دہلی کے رہنے والے تھے یہاں سے الہ آباد روانہ ہوئے (۳) اور باقی تمام زندگی درویشانہ طریقہ سے گزار دی۔ فارسی اشعار بہت عمدہ کہتے تھے۔

اودھی علماء کے لئے البتہ یہ دور کچھ اچھا ثابت نہیں ہوا۔ یہاں کی سیاسی فضا نے نواب کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اودھ کے علمی خانوادوں کی جاگیریں اور وظائف وغیرہ ضبط کر لیں۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ علماء وشرفاء کی جاگیریں اور ان کے وظائف ضبط ہو جانے کی وجہ سے درس وتدریس کا جو سلسلہ جاری تھا اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ میر غلام علی بلگرامی کے الفاظ میں:

> ''تا آنکہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد و اکثر بلاد عمدہ صوبۂ الہ آباد نیز مثل دار الخیر جونپور و بنارس و غازی پور و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیرہا صمیمۂ حکومت گردید وظائف وسیور غالات خانوادہ ہائے قدیم وجدید یک قلم ضبط شد و کار شرفاء ونجابہ پریشانی کشید۔ واضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشۂ سپاہ گری انداخت ورواج تدریس وتحصیل بہ آن درجہ نہ ماند و مدارس کہ از عہد قدیم معدن علم وفضل بود یک قلم خراب افتاد وانجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد'' (۴)

نواب صفدر جنگ کے عہد میں جونپور اور دیگر مقامات کے علمی خانوادے جن کی جاگیریں نواب سعادت خاں نے ضبط کر لی تھیں انھیں واپس کرنے کے بجائے نواب صفدر جنگ کو باقی ماندہ جاگیریں بھی ضبط کرنی پڑیں چنانچہ علماء حضرات کے لئے بہت سی پریشانیاں کھڑی ہو گئیں اور جب معاشی مشکلات کا سامنا ہوا تو ان کی علمی ترقیات بھی متاثر ہوئیں۔ لیکن ان حالات میں بھی علماء نے انفرادی طور پر اپنے

---

(۱) (الف) گلشن سخن: ص ۵۸۔ (ب) گلشن ہند: ص ۲۷

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۵۸

(۳) ایضاً ص ۴۴

(۴) مآثر الکرام: ص ۲۲۱

عہدے اور ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کیا۔ چنانچہ فاقے کئے، مصیبتیں برداشت کیں اور دوسری تمام سختیوں کے باوجود اپنے فکر وفن اور علمی سبزہ کی آبیاری سے دست کش نہ ہوئے۔ انکی یہ قربانیاں بارآور ثابت ہوئیں اور علوم وفنون کے مراکز وشعر وسخن کے پودے سرسبز وشاداب رہے۔ معاصر مؤرخ لکھتے ہیں:

''باوجوایں خرابیہا رواج علم خصوص منقولات بہ کیفیتی کہ آنجا است در قلم رو ہندوستان ہیچ جانیست''(۱)

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے آخری عہد میں اس کے حکم سے علماء حضرات کی جاگیریں بحال کردی گئیں صفدر جنگ کے زمانے میں ادباء وشعراء کی ایک بڑی تعداد (جن میں بیشتر بیرون ہند سے تھے) یہاں موجود تھی۔ ان باکمالوں میں سرفہرست زبردست خاں وفائی، مرزا ابوعلی ہاتف، مرزا مجیدی شوستری، شیخ عبدالرضا متین اور مرزا ابوطالب اصفہانی کے نام لئے جاسکتے ہیں جن کی قدردانیاں مشہور تھیں اور جن کے چرچے سن کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ادباء وشعراء فیض آباد میں جمع ہوگئے تھے۔ پیش ہے عہد صفدر جنگ کے چند مشاہیر شعرائے فارسی کا مختصر تعارف:

مرزا عظیما اکسیر: اکسیر محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ایران سے دہلی آئے اس کے بعد صفدر جنگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصاحبوں میں جگہ پائی فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے بھگواندا س ہندی لکھتے ہیں:

''دیوانش مع قصاید وغزل وترکیب بند وجمیع اقسام شعر قریب سی ہزار بیت خواہد بود''(۲)

مرزا باقر حقیر: اصفہان کے رہنے والے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ ہوئے (۳) کلام میں میر شمس الدین فقیر سے اصلاح لی۔

مرزا ابوعلی ہاتف: اصفہان سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ کا سفر کیا (۴) نواب صفدر جنگ کی

---

(۱) مآثر الکرام: ص ۲۲۳

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۴

(۳) ایضاً، ص ۶۱

(۴) ایضاً، ص ۲۴۰

رفاقت میں رہے ۔شعر وسخن میں خاص مہارت حاصل کی پہلے میر افضل ثابتؔ سے اور بعد میں شمس الدین فقیرؔ سے اصلاح لی۔

غلام نبی بلگرامی: بلگرام کے رہنے والے تھے۔نواب کی ملازمت سے وابسطہ ہوئے ۱۱۶۳/ ۱۷۵۰ء میں وفات پائی۔(۱) فارسی کے علاوہ اردو و ہندی میں بھی شاعری کرتے تھے۔

راجہ نول رائے وفاؔ: وفا کا شمار اس عہد کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔یہ نواب کے نائب تھے اور امور سلطنت میں برابر شریک رہتے ۔فارسی و اردو دونوں زبانوں کے اچھے شاعر تھے۔میر حسنؔ نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''بزیور علم وعمل آراستہ ہوش وگوش فہم وذکا، صاحب حلم وحیا، لطافت مزاج از گل زیادہ مانند بلبل دل از دست دادہ ۔۔۔''(۲)

مردان علی خاں مبتلاؔء: مبتلا کا شمار اس عہد کے قابل ذکر شعراء میں ہوتا ہے۔ان کا نام مرزا کاظم تھا اور ''مردان علی خاں'' خطاب تھا۔نواب کی سرکار میں بڑی مقتدر شخصیت کے مالک تھے۔

شیخ عبدالرضا متینؔ: ان کا تذکرہ نواب برہان الملک کے عہد میں آچکا ہے۔نواب موصوف کی وفات کے بعد انہوں نے نواب صفدر جنگ کی رفاقت اختیار کی۔

میرزا مجید اشوستری: شوستر سے ہندوستان آئے ۔کچھ عرصہ نواب کی سرکار سے وابسطہ رہے اور آخری عمر میں اپنے وطن واپس ہوئے۔انکی طبیعت ہزل گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔

ان کے علاوہ میر ضاحکؔ اور میر حسنؔ دہلی سے آئے اور نواب کے مصاحبوں میں داخل ہوئے۔ میر ضاحکؔ جو کہ میر حسنؔ کے والد تھے۔اردو مثنوی نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔فارسی اشعار بھی کبھی کبھی کہتے تھے۔اور دوسرے میر حسنؔ تھے جن کا اردو کی رزمیہ شاعری میں جواب نہ تھا۔ان کی

---

(۱) ایضاً، ص ۶۱

(۲) تذکرہ شعرائے اردو: ص ۲۰۷

تصنیف ''تذکرہ شعرائے اردو'' بزبان فارسی شعراء کا ایک اہم اور ضخیم تذکرہ ہے۔(۱)

نواب شجاع الدولہ کا بیشتر وقت انگریزوں سے معرکہ آرائی میں گزرا لیکن اس کے باوجود انھوں نے شعراء وادباء کی سرپرستیوں کا سلسلہ ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس عہد میں فارسی واردو کے بیشتر شعراء دہلی سے فیض آباد آ گئے۔ دہلی کے سیاسی حالات اس عہد میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ ہر طرف انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اور اس پر احمد شاہ ابدالی (۲) کے پیہم حملوں نے بادشاہ دہلی کی طاقت صلب کر لی تھی۔

شہنشاہ عالمگیر ثانی (۱۱۶۷۔۱۱۷۲ھ) مطابق ۱۷۵۴۔۱۷۵۹ء) ایک طرف احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور وزراء کی سیاسی سازشوں سے پریشان تھے تو دوسری جانب مرہٹوں کا سامنا تھا۔ آخر کار یہ بادشاہ اپنے وزیر کے ہاتھوں قتل ہوا اور گوہر شاہ عالم ثانی (۱۱۷۲۔۱۲۲۱ھ/۱۷۵۹۔۱۸۰۶ء) تخت پر بیٹھا۔(۳)

غرض یہ کہ اس تباہی و بربادی اور آئے دن کی لوٹ مار کی وجہ سے یہاں کے عوام کا امن وسکون مفقود تھا۔ جس کا اثر یہاں شعروادب کی محفل پر بھی پڑا۔ چنانچہ دہلی کے اکثر نامور شعراء مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا سودا، میر سوز وغیرہ نے فیض آباد کا رخ کیا۔

دہلی کے علاوہ اور بھی کئی مقامات ایسے تھے جہاں سے ادباء وشعراء کی ایک بڑی تعداد فیض آباد میں آ کر جمع ہوئی۔ کشمیر، بلگرام، نارنول اور اکبر آباد وغیرہ سے آنے والے ادباء وفضلاء میں میر شیر علی افسوس، مرزا علی نقی محشر، محمد صدیق سخنور اور لالہ پٹکا رام وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ عہد شجاع الدولہ کے چند مشاہیر ادباء وشعراء کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

سراج الدین علی خاں آرزو: آرزو فارسی زبان کے زبردست شاعر دہلی سے فیض آباد آئے۔ اور تین سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوا۔ انکی اہم تصنیفات میں دیوان آرزو، سراج اللغت، چراغ ہدایت، تذکرہ مجمع النفائس اور زائد الفوائد (فرہنگ مصادر) سرفہرست نظر آتی ہیں۔ ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ میں وفات پائی۔

---

(۱) تذکرہ شعرائے اردو میر حسن کا لافانی شاہکار ہے جسے انھوں نے فیض آباد میں ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء تا ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ کے درمیان تالیف کیا۔ اس تذکرہ سے فیض آباد کی ادبی نشستوں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

(۲) احمد شاہ ابدالی ایران کا بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ سے ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء تک ہندوستان پر پانچ بار حملہ کیا۔

(۳) مغل امپائر (انگریزی): ص ۴۴۲

میر تقی میرؔ اپنے تذکرہ میں ان کی تصنیفات کے متعلق لکھتے ہیں:

''پانزدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات حاصل کمالات ایشان از چیرۂ بیان بیرون است۔۔۔''(۱)

مرزا رفیع سوداؔ: سوداؔ کا آبائی وطن بخارا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور سات سال دہلی میں گزار کر لکھنؤ آئے۔ قصیدہ گوئی میں ان کا جواب نہ تھا۔ بیشتر اردو میں کہتے تھے۔ اکثر فارسی اشعار اچھے کہے ہیں مثلاً ان کا یہ شعر ہے:

بیا بیا نفسی چند شمع بالیں شو
کہ خستۂ غمت امشب بحالت دگراست(۲)

میر زا ماشاء اللہ مصدرؔ: نواب کے مصاحبوں میں تھے اور کئی ہزار جاگیر کے مالک تھے۔

انشاء اللہ خاں انشاؔ: یہ بھی نواب کی سرکار سے وابستہ رہے یہ میر مصدرؔ کے بیٹے تھے سولہ سال کی عمر میں اردو کے صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

''چون شانزدہ سال رسید بحضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ داخل جلسہا شد در آں وقت دیوان ہندی بطور خود بطرز نو ۔۔۔ تمام نمود''(۳)

گدا علی بیگ بسملؔ: بسملؔ سپاہی پیشہ تھے۔ مثنوی ''دیمک نامہ'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔

میر شیر علی افسوسؔ: افسوسؔ اردو کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ فیض آباد میں ایک عرصہ تک قیام رہا۔ ان کے والد میر علی مظفر خاں نواب شجاع الدولہ کے یہاں تین سو روپے ماہانہ پر ملازم تھے۔(۴)

میر جلال الدین غالبؔ: یہ زید پور کے رہنے والے تھے۔ عالم اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک

---

(۱) نکات الشعراء: ص ۲۵

(۲) سفینہ ہندی: ص ۱۰۵

(۳) تذکرہ مخزن الغرائب: مکتوبہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۴۰ء کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد قلمی وغیرہ مطبوعہ (بحوالہ اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء، اکبر حیدری کشمیری، ص ۵۹)

(۴) تذکرہ شعرائے اردو: ص ۲۱

اچھے طبیب اور فارسی کے صاحب دیوان (۱) شاعر تھے۔

جگل کشور ثروتؔ: یہ دہلی سے فیض آباد آئے۔ نکتہ دانی اور لطیفہ گوئی میں جواب نہ تھا۔ بھگوان داس ہندیؔ لکھتے ہیں:

''خوش معاشی ویار باشی معروف بودہ'' (۲)

میر شمس الدین فقیرؔ: فقیر ایک صوفی عالم اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے (۳) فارسی شعر وادب میں ان کا جواب نہ تھا۔ دہلی سے لکھنؤ آئے اور کچھ عرصہ بعد کربلا روانہ ہوئے واپسی میں راستے میں وفات پائی۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

تغافل میکند درکار من لطف نہانی را
جنونم خوب می فہمد زبان بی زبانی را

۱۰*اشرف علی خاں فغاںؔ: فغاںؔ احمد شاہ بادشاہ کے آخری عہد (۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء) میں اودھ آئے اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے وابسطہ ہوئے (۴)۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

یہ تمام شعراء اور دوسرے متعدد علماء وفضلا فیض آباد میں موجود تھے۔ جنکی زبردست تعداد کو دیکھتے ہوئے ''آرائش محفل'' کا مصنف لکھتا ہے:

''شعراء بھی جتنے اس شہر میں ہیں کیا فارسی گو، کیا ریختہ گو کہیں نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہجہاں آباد کے اکثر غریب امیر، میرزایان ہندوستان سے نواب صفدر جنگ وشجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آکر اس شہر میں بسکونت دائمی ساکن ہوئے ۔۔۔'' (۵)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ۱۴۸

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۴۶

(۳) ایضاً، ص ۱۵۲

(۴) تذکرۂ ہندی: ص ۱۵۹

(۵) آرائش محفل: ص ۱۲۱

علماء میں فلسفہ و منطق کے استاد تفضّل حسین خاں دہلی سے، مولوی سدید الدین شاہجہاں پور سے اور مولوی عبدالحکیم کشمیر سے آئے۔ اس عہد کی دو اہم تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

نوطرز مرصّع: حسین عطا خاں تحسینؔ نے نواب کی فرمائش پر چار درویش کا قصّہ اردو نثر لکھا اور ''نوطرز مرصّع'' نام رکھا۔ اس میں فیض آباد کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی شامل کیا جس کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

خدا نے جب کیا شرف البلاد فیض آباد — کہ سب صفت میں یہ موصوف ہے بہ عزّ و وقار
غرض میں کر نہیں سکتا ہوں اس کی کچھ تعریف — کہ ہے وہ زینت ہندوستان بہ نقش و نگار (۱)

تحسین اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔

چہار گلزار شجاعی: نواب شجاع الدولہ کے لئے منشی ہرچرن داس نے ایک بہت ضخیم کتاب لکھی اور نواب کے نام کی مناسبت سے اس تاریخی کتاب کا نام ''چہار گلزار شجاعی'' رکھا یہ ابتداء سے ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء تک کی عمومی تاریخ ہے جو ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء میں شروع اور ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء میں تمام ہوئی۔ (۲)

غرض یہ کہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ فیض آباد کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں شعراء و ادباء کی کثرت نے عوام میں بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ ہر طرف شعر و ادب کی محفلیں گرم تھیں۔

نواب آصف الدولہ سابقہ حکمرانوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی فیاض واقع ہوئے تھے۔ علماء، ادباء و شعراء کی قدر دانی اور تعظیم کو اپنا اولین فریضہ سمجھتے اور ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ علم و ادب کا مرکز قرار پایا۔ چنانچہ مختلف مقامات سے ارباب فضل و کمال کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ نواب نے ان باہر سے آنے والے ادباء و شعراء کا خوشدلی کے ساتھ خیر مقدم کیا، انھیں اچھے عہدوں پر فائز کیا۔ سرکاری طور پر بڑی بڑی تنخواہیں اور حسب مراتب جاگیریں عطا کیں اور انعام و

---

(۱) نوطرز مرصع: ص ۵۸

(۲) اورینٹل کالج میگزین: اگست ۱۹۲۹ء (بحوالہ لکھنویات ادیب: مسعود رضوی، ص ۵۵)

اکرام سے بھی نوازتے رہے۔ جوارباب ہنر ودانشور دور دراز علاقوں سے اپنے اپنے وطنوں کو خیر باد کہہ کر یہاں آ گئے تھے انھیں روزگار مہیا کیا۔ اس طرح اصحاب علم وفن کو بھی خوشحالی اور آزادی کی فضا میں اپنے زور طبع دکھانے کا موقع ملا۔ الغرض زبان وادب کی صحیح معنوں میں نشو ونما ہوئی۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں جو شعراء باہر سے آئے تھے وہ اب آہستہ آہستہ فیض آباد سے لکھنؤ کی جانب منتقل ہو رہے تھے۔ گھر گھر میں شعر وسخن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں نہ صرف لکھنؤ بلکہ قرب وجوار کے ہر قصبہ وقریہ میں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ جن میں بیشتر شعراء تھے۔

اس عہد میں بھی دہلی کی تباہی و بربادی کا وہی حال تھا جو اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ بادشاہت شاہ عالم ثانی (۱۱۷۲۔۱۲۲۱ھ مطابق ۱۷۵۹۔۱۸۰۶ء) کی تھی لیکن حکمرانی وزیر اعظم نجیب الدولہ کی تھی۔ ۱۱۷۵ھ / ۱۷۷۱ء میں وزیر اعظم کی وفات ہوئی تو اس کا قائم مقام ضابطہ خاں ہوا۔ اس درمیان بادشاہ الہ آباد کے قلعہ میں تھا۔ جہاں اسے انگریزوں کی پناہ حاصل تھی۔ ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں شاہ عالم مرہٹوں کی امداد حاصل کر کے دہلی پہونچا، لیکن حالات حسب سابق بدستور تھے۔ ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء میں ضابطہ خاں کا لڑکا غلام قادر روہیلہ میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہوا اور اس نے ظلم کی انتہا کر دی یعنی شاہ عالم کو تخت سے اتار کر اندھا(۱) کروا دیا ان حالات میں بادشاہ اہل کمال کی خاطر خواہ قدر دانی اور سرپرستی کرنے سے معذور تھا۔ چنانچہ بیشتر شعراء حضرات کو دہلی چھوڑ کر دوسری جگہوں پر جانا پڑا اور اس وقت لکھنؤ سے بڑھ کر علم وادب کا مرکز اور کون ہو سکتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کے عہد کے چند نامور شعراء کا تعارف حسب ذیل ہے۔

میر سوزؔ: اس عہد کی اہم شخصیات میں میر سوزؔ ہیں۔ یہ دہلی کے تھے۔ فرخ آباد و مرشد آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے۔ انھیں نواب کے استاد ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ اور انشاء پردازی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔(۲)

میر تقی میرؔ: اردو کے مشہور ومعروف شاعر تھے عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزار کر اور کامیابیوں سے

---

(۱) مغل امپائر: ص ۴۴۵

(۲) طبقات الشعراء: ص ۵۸

ہمکنار ہو کر دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے اور تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔(۱)

میر حیدر علی حیرانؔ: نواب کے مصاحبوں میں تھے۔اکثر فارسی میں کہتے تھے۔(۲)

رائے کھیم نرائن رندؔ: نواب کی سرکار میں پانچ سو روپیہ ماہوار کی ملازمت حاصل تھی۔ رندؔ نے ''چہار درویش'' کا قصہ ''مثنوی خسرو شیریں'' کے وزن میں اور ہیر رانجھا کا افسانہ مثنوی نل دمن'' کے وزن میں نظم کیا۔(۳)

ٹیکا رام تسلیؔ: لکھنؤ کے رائے گوپال رائے اور ان کے چار بیٹے آصف الدولہ کے عہد میں بخشی گری کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے گوپال رائے کے چھوٹے بیٹے ٹیکا رام تسلیؔ اردو و فارسی کے مشہور اور صاحب دیوان شاعر تھے۔تسلیؔ کا ایک اہم کارنامہ فارسی غزلوں کا انتخاب بنام ''مجموعۃ الشعراء'' ہے جس میں سات سو فارسی دواوین سے ہم طرز غزلوں کے اشعار منتخب کر کے ان کو ردیف وار ترتیب دیا ہے۔(۴)

دولت رام دولتؔ: موزونی طبع اور صحبت شعراء کے فیض سے اکثر ایک دو شعر موزوں کر لیتے تھے نواب کی سرکار میں اچھے عہدہ پر فائز تھے۔

کرشن چندر رقیبؔ: دہلی کے تھے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔اور مستقل سکونت اختیار کی۔شاعری میں مرزا فاخر مسکینؔ کے شاگرد تھے۔(۵)

ان شعراء حضرات کے علاوہ اس عہد کی ایک اور اہم شخصیت کا ذکر کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہ تھے تفضّل حسین خاں سیالکوٹی جو ''خان علامہ'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

تفضّل حسین خاں المعروف بہ خان علامہ مختلف علوم کے بے نظیر عالم تھے۔حکیمیات و

---

(۱) گلشن ہند: ص ۱۵۲

(۲) سفینۂ ہندی: ۶۴

(۳) سفینۂ ہندی: ص ۸۸

(۴) دیباچہ مجموعۃ الشعراء

(۵) سفینۂ ہندی: ص ۱۶۸

الٰہیات میں بے مثال، عربی، فارسی، انگریزی، لاطینی اور یونانی زبانیں بہت اچھی جانتے تھے۔ نواب نے انہیں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف خود کتابیں تصنیف کیں بلکہ متعدد کتابوں کے ترجمے عربی و فارسی زبانوں میں کئے۔ اس کے علاوہ کئی مشکل کتابوں کی شرح و حواشی اور تعلیمات لکھیں ۱۲۰۵ھ/۱۸۰۱ء میں انتقال کیا۔(۱)

آصف الدولہ کے عہد میں ایک ایرانی عالم اور سیاح عبداللطیف شوستری ۱۲۱۱ھ (۱۷۶۹ء) میں لکھنؤ آئے نواب آصف الدولہ کے ہمراہ شاہی کتب خانے کی سیر کی۔ اور اپنے سفرنامہ میں یہاں کے چشم دید حالات قلمبند کئے۔ ان کے بیان کے مطابق اس وقت آصفی کتاب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابوں کے خوشخط نسخے موجود تھے۔ ان کے سفرنامے سے ایک اقتباس:

''سہ لک کتاب منتخب خوش خط پاکیزہ کہ بر ہر صد مجلد یک کس گماشتہ بود، در کتاب خانۂ او دیدم واکثر یرا برفاقت خاں، بتدریج سیر کردم، از اقسام فنون و اصناف علوم عربی و فارسی و انگریزی نظم و نثر، تاریخ و دیوان در آنہا بود و قطعات زیبا سیر خوش نویساں، اولین و آخرین و تصاویر مصوران ایران و ہند و روم و فرنگ آنقدر داشت کہ بصری از دیدن آنہا فراغ حاصل نمی شد، مجلدات بسیاری از کتب علمی نظر در آمدند چون شرائع و مدارک و مسالک و مفاتیح و کشکول و بعض مجلدات بحار الانوار کہ ہمہ بخط مؤلفین بودند از کسی کہ کتاب خانہ در تحویل او بود شنیدم کہ ہفت صد مجلد کتب علمی اند کہ بخط مصنفین اند و از کتاب خانہ سلاطین تیموریہ بعد از تخریب سلطنت بدست افتادہ اند و الحق آنہمہ خزاین و دفاین و اسباب طلا و جواہر مکہ داشت معادلہ با عشر عشیر کتاب خانہ او نمی کردند''(۲)

نواب وزیر علی خاں کی حکومت محض چند ماہ کی تھی۔ انھوں نے اپنے مختصر عہد میں علوم و فنون کی سرپرستی کا سلسلہ قائم رکھا۔ ان کی معزولی کا صدمہ شعراء حضرات نے بھی برداشت کیا اور اپنے اپنے طور پر نظمیں اور معزولی کی تاریخیں موزوں کیں۔ نواب موصوف خود بھی شاعر تھے اور اردو میں شاعری کرتے تھے ان کا تخلص ''وزیری'' تھا۔ تاریخ اودھ ''میں ان کی ایک نظم موجود ہے۔

---

(۱) تحفۃ العالم: ص ۲۹۰

(۲) تحفۃ العالم: ص ۵۳۳۔۵۳۴

نواب سعادت علی خاں کی تعلیم و تربیت علامہ تفضّل حسین خاں کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں خوش نویسی اور انشا پردازی سے نواب کو غیر معمولی شغف ہوگیا۔ ان کی انشاء پردازی مشہور تھی۔ خط شکستہ بہت اچھا لکھتے تھے۔ دوسروں کی املاء کی غلطیاں ان کی طبیعت پر سخت ناگوار گزرتی تھیں۔ سرکاری ملازمین میں سے اگر کوئی خوشخط یا املا کی غلطی کر بیٹھتا تو اس پر جرمانہ عائد ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں نواب کے عہد کی کئی مثالیں اور دلچسپ واقعات تاریخ (۱) اودھ میں درج ہیں۔

غرضیکہ نواب کی اس قسم کی توجہات اور قدر دانیوں نے علم وادب کے دامن کو اور بھی زیادہ وسعت بخشی۔ لکھنؤ اب پہلے سے کہیں زیادہ علم وادب کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ اس وقت یہاں علوم وفنون کے دو اہم ادارے تھے یعنی فرنگی محل اور شیعہ مجتہدین۔ ان دونوں اداروں میں بزبان عربی و فارسی علم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول حدیث، منطق، علم کلام وعقائد اور دیگر علوم کی ترویج واشاعت کے کام جاری تھے۔

پہلا ادارہ ''فرنگی محل'' تھا (۲) جس کے بانی ملا نظام الدین محمد سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) اور ان کے بیٹے عبدالعلی بحر العلوم (۱۱۴۲ھ/۲۹-۱۷۳۰ تا ۱۲۳۵ھ/ ۱۹-۱۸۲۰ء) تھے۔ یہ اور ان کے اخلاف نے علوم دینیہ، علوم عقلیہ، علم ریاضی وہیئت وغیرہ کی تعلیم کو وسعت بخشی۔

دوسرا ادارہ خاندان اجتہاد تھا جس کے بانی سید دلدار علی غفراں مآب نصیر آبادی ۱۱۶۶ھ ۱۷۵۳ء تا ۱۲۳۵ھ/۲۰-۱۸۱۹ء تھے۔ ان کے دو بیٹے سید العلماء (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء تا ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء) اور سلطان العلماء (۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء تا ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) نے اس ادارے کو فروغ بخشا اور نہایت بلند پایہ کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس عہد کی چند اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں:

---

(۱) تاریخ اودھ: جلد ۴ ص ۱۰۰-۱۰۵

(۲) فرنگی محل شہر لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے۔ مغل عہد میں اس کی حیثیت ایک مکان سے زیادہ نہ تھی اس میں ایک انگریز سوداگر رہا کرتا تھا۔ اس وقت اسے فرنگی تاجر کا محل کہتے تھے اس کے کوئی اولاد نہ تھی اسلئے آگے چل کر یہ جگہ شاہی مقبوضات میں شامل کرلی گئی۔ شہنشاہ اورنگزیب نے یہ جگہ ملا قطب الدین شہید کے خاندان کو بخش دی۔ اس طرح اس جگہ کو فرنگی محل کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور یہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں سے جو علمائے کرام اور صوفیہ عظام تحصیل علم سے فراغت پاتے فرنگی محلی کہلاتے تھے۔

عمائدالاسلام: مولوی دلدار علی غفراں مآب نے یہ کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں تصنیف کی۔(۱)

دریائے لطافت: انشاءاللہ خاں انشاء نے دریائے لطافت لکھی۔ یہ اکیلے انشاء کی تصنیف نہیں بلکہ اس کی تالیف میں ان کیدوست مرزا قتیل بھی شریک کار تھے۔(۲)

دستورالفصاحت: احمد علی یکتا(۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء تا۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء)

ریاض الفصحاء: یہ اردو شعراء کا تذکرہ ہے جسے غلام ہمدانی مصحفی نے فارسی زبان میں تصنیف کیا۔

گلشن نو بہار: حکیم محمد بخش مہجور

لطائف السعادت: چند لطائف جو نواب اور انشاء کے درمیان پیش آئے تھے۔ انشاء نے انھیں جمع کر کے ''لطائف السعادت'' مرتب کردی۔ اس میں نواب سعادت علی خاں کے ۵۵ لطائف محفوظ ہیں۔ جن سے نواب کی فراست، قیافہ شناسی، دقیقہ آفرینی اور حاضر جوابی پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شگفتہ مزاجی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

لطیفہ ۸:

درمقدمہ مداخلت بے جا کردم ارشاد شد خط غلط، معنی غلط، املا غلط، انشا غلط

لطیفہ ۲۵:

روزی بہ خیال این کہ آدم برای محافظت نیست کفش مغرق زر باف را بیرون گذاشتہ کفش سادہ پوشید، در حضور آمدم وقت شام بود ارشاد شد بلے صاحب این شب خوابی است سوائے خندہ ہیچ جوابی نیامد۔

لطیفہ ۲۸:

روزی معروض نمودند کہ امروز میلہ پیر جلیل کہ مجمعی از خلایق بود فیل سواری را دیدم کہ

---

(۱) عربی زبان میں اسکا مکمل قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

(۲) یہ انشاء اور قتیل کی مشترکہ تالیف ہے اصل نسخہ میں منطق عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے متعلق جو معلومات ہیں وہ قتیل کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں لیکن انجمن ترقی اردو نے اس کا جو اردو ترجمہ شائع کیا ہے اس میں صرف معانی اور بیان کے حصے کو رہنے دیا ہے منطق و عروض قافیہ کے بیان کو نکال دیا ہے۔ اس طرح ''دریائے لطافت'' کے موجودہ متداول نسخے میں قتیل کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔۔۔ موجودہ صورت میں یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔

درسواری خود سہ مرد رانشانیدہ بود، گفتم چہ طور گنجائش سہ تادرمکان تنگ شدہ باشد
درزبان اردوارشادشداوپر تلے بیٹھ لئے ہوں گے۔(۱)

ہفت تماشا: مرزاحسن قتیل کی تصنیف ہے۔اسے قتیل نے نواب کے نام معنون کیا۔اس کتاب کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:

''احوال ہندوان دررسوم این فرقہ وشیوۂ مسلمانان ساکن ہندقدیم الایام یاجدیدالایام''(۲)

ان تمام تصنیفات کے بعدایک مختصر جائزہ اس عہد کے مشہورشعراء کاملاحظہ ہو:

مرزاحسین قتیل: قتیل دہلی کے رہنے والے تھےنواب سعادت علی کے عہد میں لکھنؤ آئے اوران کے دربار سے وابستہ ہوئے۔فارسی زبان کے مشہورشاعرومصنف تھے۔

انشاءاللہ خاں انشاء: نواب کے خاص دوستوں میں تھےان کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔

رای جے سکھ رائے: جے سکھ رائے نواب کی سرکار سے وابستہ تھے۔انھیں شعروسخن کاذوق تھااورانداز بیان بھی دلکش تھا۔۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا۔(۳)

گربخش ادیب: ادیب لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔پہلے مصحفی اور بعد میں محمدعیسی تنہا سے شعر پراصلاح حاصل کی۔اردوفارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔(۴)

غلام ہمدانی مصحفی: مصحفی امروہہ کے رہنے والے تھے۔۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں باقاعدہ طور پرلکھنؤ آکرمقیم ہوئے۔اردوفارسی کے مشہورشاعر تھے۔ان کی اہم تصنیفات عقدثریا، ریاض الفصحاءاورتذکرہ ہندی ہیں جواردوشعراءکی ایک بڑی تعدادکااحاطہ کرتی ہیں،دونوں تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔(۵)

ان شعراء کے علاوہ علماء میں مفتی خلیل الدین کاکوروی تھے جوعربی وفارسی کے عالم اورعلوم ریاضی

---

(۱)لطائف السعادت (آمنہ خاتون)

(۲) ہفت تماشا: مرزاحسن قتیل

(۳)بہارستان اودھ:ص۵۸

(۴)ریاض الفصحاء:ص۳۶

(۵)گل رعنا:ص۲۲۷۔گلشن بے خار:ص۲۵۲

کے ماہر تھے۔نواب نے ان کی قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے ہزار روپیہ تنخواہ مقرر کی اور اپنی مصاحبت میں داخل کیا(۱)

غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں علمائے ''فرنگی محل'' اور ''خاندان اجتہاد'' نے معقولات، مناظرہ اور فقہ وحدیث پر گرانقدر کتابیں تصنیف کیں۔شعروشاعری کی محفلیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ سرگرم نظر آئیں۔بادشاہ خود شاعر تھے اور اہل علم کی قدردانی انھیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھی چنانچہ اس عہد میں بہت سی نایاب تصنیفات عمل میں آئیں جو بادشاہ کے ادبی ذوق کا نتیجہ تھیں۔ان تصنیفات کا یہاں ایک سرسری جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

''فرھنگ رفعت'' بنام ہفت قلزم: بادشاہ کو علم لغت سے خاص شغف تھا۔انھوں نے فارسی کی ایک ضخیم لغت ''فرہنگ رفعت'' خود تالیف کی۔یہ نام ''رفعت الدولہ رفیع الملک'' کی مناسبت سے تھا۔ اس لغت کی ترتیب میں پورے دو سال لگ گئے قبول محمد نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴اور ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ کے دوران اسے مرتب کیا۔اس کی طباعت شاہی مطبع سے پانچ سال بعد شروع ہوئی۔اور دوسال کے اندر ''ہفت قلزم'' کے نام سے سات جلدوں میں چھپ کر تیار ہوئی۔اکبر حیدری کشمیری لکھتے ہیں:

> ''بادشاہ موصوف نے ایک مفید اور کارآمد فارسی لغت بھی تصنیف کی جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اس کا نام ''ھفت قلزم'' ہے اس کے ہر صفحہ پر شاہی مہر ہے جس پر ۱۲۳۰ھ کی تاریخ ہے لغت کی سب جلدیں بادشاہ کے زمانے میں ہی چھپی تھیں پہلی اور دوسری جلد ۱۲۳۶ھ میں باقی پانچ جلدیں ۱۲۳۷ھ میں مطبع سلطانی میں چھپی تھیں۔ہفت قلزم کا دیباچہ قبول محمد نے لکھا ہے''(۲)

تاج اللغات: فارسی لغت کے بعد بادشاہ نے اپنی توجہ عربی لغات کی طرف مبذول کی اور اس سلسلے میں لغات عربی کے ہندوستانی ماہرین کا ایک عملہ تیار کروایا جن کے ذمہ یہ کام سونپا کہ وہ عربی لغت کی مشہور کتاب ''قاموس'' کو بنیاد قرار دے کر اور امکانی حد تک الفاظ وفقرات کا اضافہ کر کے عربی کی ایک

---

(۱) سوانح عمری مفتی خلیل الدین خاں: ص ۵

(۲) تحقیقی جائزے: جلد ۱ ص ۶۴

جامع لغت تیار کریں جس میں مطالب و معانی فارسی کے ہوں۔ عربی علماء کی اس جماعت نے کئی سالوں کی کوششوں کے بعد ''تاج اللغات'' کے نام سے ایک لغت تیار کی۔ یہ عظیم کارنامہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں مکمل ہو کر آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔(۱)

مرأت الاقلیم: بادشاہ کو علم ہیئت سے بھی کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ان کے عہد میں لکھنؤ میں ایک رصد گاہ قائم کی گئی جس کے ضروری آلات باہری ملکوں سے منگوائے گئے اس سلسلے میں بادشاہ خلیل الدین خاں کی خدمات حاصل کیں جو علوم ریاضی بالخصوص علم ہیئت کے ماہر تھے۔ انھوں نے فن ہیئت کے قواعد کی ایک کتاب ''مرأت الاقلیم'' تصنیف کی۔(۲) اس کتاب میں احاطۂ اودھ کے طرق و شوارع کا جغرافیہ اور دنیا کے مشہور شہروں کا طول و عرض بیان کیا۔

المناقب الحیدریہ: بادشاہ کی مدح میں احمد شروانی نے ایک کتاب بزبان عربی تصنیف کی یہ کتاب ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ میں شائع ہوئی۔

بہار بے خزاں: شعراء کا تذکرہ ہے جسے محمد صادق اختر نے تصنیف کیا۔

محامد حیدریہ: محمد صادق اختر نے ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ میں بزبان فارسی تالیف کی(۳)

گلدستۂ محبت: محمد صادق اختر نے بادشاہ غازی اور لارڈ ہیسٹنگز کی ملاقات کا بیان ۱۵۱ صفحات میں کیا ہے یہ ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں شائع ہوئی(۴)

تذکرہ آفتاب عالمتاب: صادق اختر نے فارسی شعراء کا نہایت ہی ضخیم تذکرہ لکھا اس میں ۴۲۶۴ شعرائے فارسی کا احاطہ کیا گیا ہے(۵)۔

---

(۱) یہ مکمل لغت مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس موجود تھی۔ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء میں انھوں نے اسے کشمیر یونیورسٹی کے کتب خانے کو دیدیا۔(تحقیقی جائزے: جلد ۱ ص ۶۵)

(۲) سوانح عمری مفتی خلیل الدین خاں، ص ۲۱

(۳) اس کتاب کا ایک نسخہ شاہی مطبع سے شائع ہوا لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۴) لکھنویات ادیب: ص ۱۰

(۵) حاشیہ گل رعنا: ص ۳۴۳

ان کتابوں کے علاوہ بہت سی کتابوں کے تراجم کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ اس سلسلہ میں پہلا نام محمد صالح کا آتا ہے یہ شاہی کتاب خانے میں ملازم تھے۔ بادشاہ نے انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا کام ان کے سپرد کیا۔ یہ روزانہ جتنا ترجمہ کرتے بادشاہ کو حسب حکم سناتے چنانچہ چودہ کتابیں انگریزی سے ترجمہ ہوئیں اس کے علاوہ چھ کتابیں فارسی میں تصنیف ہوئیں اور سب بادشاہ نے حرف بہ حرف سماعت فرمائیں۔(۱)

عہد غازی کے چند مشہور شعراء:

قاضی محمد صادق اختر: شعراء میں سرفہرست اختر کا نام آتا ہے جنہیں بادشاہ نے ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا تھا۔(۲) یہ ہوگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگ یہاں قاضی اودھ اور صدر الصدور کے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اختر نظم ونثر میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ اردو و فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

مرزا محمد خان نصیبی: ایران کے مشہور شہر کرمان کے رہنے والے تھے۔ بادشاہ غازی کے عہد میں لکھنؤ آئے اور یہاں فوج میں ملازمت کرلی۔ پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی "لالہ بوستاں" لکھی اور بادشاہ کے نام معنون کی۔ یہ مثنوی سعدی کی "بوستاں" کے طرز پر ہے۔ چند اشعار اس مثنوی سے نقل کئے جاتے ہیں:

نصیبی ہمیں لالۂ رنگ رنگ — بہ پاشید درعہد حکم فرنگ
بہ عہدی بہ ہندم فتادیگزار — کہ در آں نہ بودی کسی شہریار
کہ بہ بر نامش ایں نامہ انشاکنم — سرش از نہ افلاک بالاکنم
نصاری درآں ملک بد حکمراں — مراطبع راغب نشد مدح آں
بنام وزیر الممالک رقم — نمودی مرا طبع زریں قلم
وزیری کہ از شہر یاراں تمام — بود شہرہ چون مہر زریں بنام
خداوند غازی دیں حیدر است — کہ از قدر از نہ ملک برتراست(۳)

---

(۱) دیباچہ لطائف الظرائف: ص۵

(۲) تذکرہ شعراء: ص۶۰

(۳) لالہ بوستاں: مرزا محمد خاں نصیبی (قلمی نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔)

نصیرالدین حیدر بادشاہ: اس عہد کے مؤرخین نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے کو ترقیوں کا زمانہ بتایا ہے۔اس عہد میں شعروادب اپنے انتہائے عروج پر تھا۔ساتھ ہی اسلامی علوم وفنون کا بھی بول بالا تھا۔علماء کے اپنے اپنے مختلف حلقے تھے۔درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ ہر طرف جاری تھا۔مرکزی اعتبار سے کوئی مخصوص مدرسہ اس وقت تک قائم نہ ہوا تھا۔البتہ انفرادی طور پر علماء درس دیتے تھے اور ہر بڑا عالم اپنی جگہ بہ ذات خود ایک مدرس کی حیثیت رکھتا تھا۔

علاوہ بریں یہ بادشاہ مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔چنانچہ لکھنؤ میں پہلا انگریزی اسکول قائم کیا گیا۔اور بہت سی انگریزی کی علمی وادبی کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔اس عہد کی چند اہم تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:

مفتاح الافلاک: یہ علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے(۱)۔اس کتاب میں ان بادشاہوں کا ذکر بھی ہے جنھوں نے علم ہیئت کی ترقی کی کوشش کی۔جولیس سیزر،الفانسیوس،مامون رشید،الغ بیگ اور ہمایوں کے بعد نصیرالدین حیدر کے ذکر میں لکھا ہے:

> ''یہ بادشاہ والا جاہ۔۔۔بھی مثل سلاطین سلف کے ترقی اور ترویج اس علم میں مصروف ہے۔چنانچہ یہ مفتاح الافلاک حسب الحکم۔۔۔نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ ۔۔۔کے زبان انگریزی سے سلیس اردو عبارت میں ترجمہ کی گئی۔۔۔''(۲)

لطائف الظرائف: عہد غازی میں محمد صالح شاہجہاں پوری ترجمہ وتالیف کا کام انجام دیتے تھے۔انھوں نے لطیفوں کی ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی نذر کی۔لطائف الظرائف کے دیباچہ میں صالح شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

> ''دریں ولا کہ سال اول جلوس مبارک حضرت ظل سبحانی ۔۔۔ کا مطابق سال بارہ سے پینتالیس ہجری کے ہے اس بندۂ ہیچمداں نے لطائف اچھے اچھے اکثر کتابوں عربی اور فارسی سے انتخاب کر کے زبان ہندی میں جمع کیے اور نام اس کا

AN EASY INTRODUCTION TO ASTRONOMY(۱)

(۲) مفاتیح الافلاک:(ترجمہ)ص۱۲۔۱۳

لطائف الظرائف رکھا''(۱)

مثنوی مہ چہاردہ: اس عہد میں بہت سی مثنویاں بھی لکھی گئیں اس زمانے کی مشہور مثنویوں میں ''مثنوی مہ چہاردہ'' ہے آقا محمد حسین برشتہ نے یہ دس ہزار ابیات کی مثنوی اردو زبان میں کہی (۲)

مثنوی درد الفت: مقبول احمد مقبولؔ کی اس مثنوی کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں تصنیف کی گئی۔(۳)

خلاصۂ شاہنامہ: اس عہد میں شاہنامۂ فردوسی کا خلاصہ فارسی نثر و نظم میں کیا گیا ''کپتان مکان''(۴)(مترجم) نے اس کا انتخاب کیا۔ تاریخ اودھ کا بیان ہے:

''جو شاہ نامہ فردوسی کا کپتان مکان صاحب نے باخراج اشعار اسدی وغیرہ انتخاب کیا تھا اس کے چھاپنے کے واسطے پچاس ہزار روپے عنایت کئے''(۵)

۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میں منشی پردھیان سنگھ ابن دیوان شیولال نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہونچایا۔

راحت القلوب: امیر مختار کے حالات پر مبنی یہ کتاب حسین علی لکھنوی (۶) نے لکھی۔

اس عہد کے چند مشہور شعرا حسب ذیل ہیں:۔

شیخ امام بخش ناسخ: اردو کے نامور شاعر، تمام عمر لکھنؤ و فیض آباد کے درمیان گزری اکثر الہ آباد بھی جاتے رہتے تھے۔ شیفتہؔ ان کے کلام کے مطابق رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ارباب لکھنؤ میں سے ان کی چمن طبع کی نسیم نکہت ریز ہے اور ان کے فکر کے پھولوں کی خوشبو دلآویز ہے۔ ان کے غور (فکر و خیال) کا طائر بلند پرواز شاخ سدرہ کے علاوہ

---

(۱) لطائف الظرائف مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔

(۲) لکھنویات ادیب: ص ۸۵

(۳) لکھنویات ادیب: ص ۸۶

(۴) وائے سرائے لارڈ کیمبر میر کے ساتھ کپتان مکان بحیثیت مترجم کے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔

(۵) تاریخ اودھ (جلد ۴) ص ۲۲۷

(۶) لکھنویات ادیب: ص ۸۹

کہیں آشیانہ نہیں بناتا" (۱)

ناسخ کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

خواجہ حیدر علی آتش: آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور ناسخ کے ہم عصر تھے۔ یہ دونوں نہ صرف اس عہد کے مشہور اردو شاعر ہیں بلکہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء سے ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء کا یہ زمانہ "آتش و ناسخ کے زمانے" کے نام سے موسوم ہے۔ محمد حسین آزاد آتش کے طرز کلام کے متعلق فرماتے ہیں:

"جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں" (۲)

پنڈت دیا شنکر نسیم: لکھنؤ کے رہنے والے تھے اردو مثنوی "گلزار نسیم" (۳) لکھی اور شہرت و عزت سے ہمکنار ہوئے آتش کے شاگردوں میں تھے۔ ۱۲۴۹ھ / ۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔

خود بادشاہ موصوف کو شعر و شاعری سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ ان کی کئی اردو غزلیں، قصائد، مرثیہ اور سلام مختلف تذکروں میں موجود ہیں جو آئمہ معصومین سے متعلق ہیں۔ تذکرہ روز روشن کے الفاظ ہیں:

"طبع موزوں داشت، احیاناً توجہ بہ انشائے اشعار اردو و فارسی می گماشتند" (۴)

محمد علی شاہ کا دورۂ حکومت اگرچہ مختصر تھا لیکن اودھ کا دار السلطنت روز افزوں ترقی پر تھا۔ عبد الحلیم شرر کا بیان ہے:

"ان دنوں لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اس کے سواد میں آباد تھے کہ اسے ہندوستان کا بابل کہنا بے جا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اس عہد کا زندہ بابل تھا" (۵)

---

(۱) گلشن بے خار: ص ۳۰۸

(۲) آب حیات: ص ۳۸۹

(۳) اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ: ص ۱۷۲

(۴) تذکرہ روز روشن: ص ۱۳۰

(۵) گذشتہ لکھنؤ: ص ۹۴

اس عہد کا لکھنؤ اور اس کا اطراف فارسی، عربی اور اسلامی علوم کا زبردست مرکز بن چکا تھا۔ شیعہ سنی علماء نے شعر و ادب، منطق، فلسفہ، و اصول فقہ میں خاص امتیاز حاصل کر لیا تھا اور مذکورہ بالا اصناف میں ایسی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں کہ سابق میں اس کی نظیر لکھنؤ میں نہیں ملتی۔ پیش ہیں اس عہد کی چند اہم اور منفرد تصنیفات:

حدیقۂ سلطانیہ: غفراں مآب کے چھوٹے صاحبزادے سید العلماء نے فارسی میں علم کلام پر ایک بے مثال کتاب لکھی ''حدیقۂ سلطانیہ'' پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔(۱)

تفسیر قرآن: غفراں مآب کے بڑے بیٹے سید علی نے اردو میں قرآن کی تفسیر لکھی۔ آٹھ جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر مطبع شاہی (۲) سے شائع ہوئی۔

باقیات الصالحات: غفراں مآب کے تیسرے صاحب زادے سید حسن صاحب نے اردو میں اصول دین پر مبنی یہ کتاب لکھی۔(۳)

تشئید مبائی الآیمان: سلطان العلماء کے بڑے بیٹے محمد باقر منصف الدولہ نے علم کلام میں یہ کتاب بزبان فارسی تصنیف کی۔(۴)

جہاں نما: مقبول احمد مقبولؔ نے اس عہد میں بادشاہ کی اجازت سے ایک کتاب ''جہاں نما'' کے نام سے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں تصنیف کی جس کی طباعت کا کام ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مطبع محمدی سے ہوا۔

سوانح سلاطین اودھ: اس عہد میں کمال الدین حیدر حسینی نے اودھ کی تاریخ مرتب کی یہ تاریخ دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی۔ پہلی جلد سوانح سلاطین اودھ اور دوسری جلد ''قیصر التواریخ'' ہے۔ تاریخ اودھ کے سلسلہ میں یہ کتاب بے حد مفید اور مکمل ہے۔ اس کے علاوہ کمال الدین حیدر نے سائنس

---

(۱) نزہۃ الخواطر (جلد ۷) ص ۱۴۰

(۲) لکھنویات ادیب: ص ۹۹

(۳) نزہۃ الخواطر (جلد ۷) ص ۱۳۱

(۴) ۱۲۷۵ھ/۱۸۴۱ء میں مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی۔

اور ہیئت کی ۱۸ کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔(۱)

مثنوی بحرالاعجاز: غلام علی زائر نے مثنوی ''بحرالاعجاز'' نظم کر کے محمد علی شاہ کے نام معنون کی۔(۲)

دیوان زخمی: راجہ رتن سنگھ زخمی فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ان کا فارسی دیوان ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں مطبع محمدی سے چھپ کر شائع ہوا(۳) یہ محمد علی شاہ کے عہد میں امیر الانشاء مقرر ہوئے اور انھیں ''فخر الدولہ دبیر الملک ہوشیار جنگ'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

نفائس اللغات: مولوی اوحد الدین بلگرامی نے اپنی لغت ''نفائس اللغات'' میں ہندی الفاظ کے معنی فارسی میں لکھ کر ان کے عربی و فارسی مترادفات بتائے اور دیباچہ میں محمد علی شاہ کی مدح بیان کرتے ہوئے کتاب ان کے نام معنون کی۔(۴)

حدیقۃ الارشاد: محمد صادق اختر جو گذشتہ شاہان اودھ کے عہد میں تصنیف و تالیف کا کام انجام دے رہے تھے۔ایک ضخیم کتاب ''حدیقۃ الارشاد'' لکھی۔اسکا سال کتابت و تصنیف ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء ہے۔(۵) یہ کتاب محمد علی شاہ نے تخت نشینی سے بہت پہلے اختر سے لکھوائی تھی۔اس بات کی تصدیق اس کتاب کے طویل دیباچہ سے ہوتی ہے۔

امجد علی شاہ: امجد علی شاہ نہایت دین دار اور مذہبی قسم کے آدمی تھے۔مذہبی امور کے علاوہ دیگر محفلوں سے دور ہی رہتے تھے۔ان کے عہد میں لکھنؤ میں مدرسۂ سلطانی کا قیام عمل میں آیا جس میں دوسو کے قریب طلباء تھے اور تیس مدرس درس دیتے تھے(۶) اس عہد میں کئی گرانقدر تصنیفات عمل میں آئیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

---

(۱) قیصر التواریخ: ص ص ۴۲۔۴۳

(۲) اس کا قلمی نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتابخانے میں ہے۔

(۳) اس کا قلمی نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتابخانے میں ہے۔

(۴) یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں مطبع مصطفائی سے شائع ہوئی۔

(۵) اس کا قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

(۶) قیصر التواریخ: ص ۳۷

حق الیقین: محمد باقر مجلسی نے امجد علی شاہ کے حکم پر یہ کتاب لکھی یہ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں مطبع سلطانی سے شائع ہوئی۔

خلاصۃ الاعمال: مولوی سید عبداللہ نے بزبان اردو لکھی یہ کتاب بھی اس عہد میں شاہی مطبع سے شائع ہوئی۔

سبعہ سیارہ: محمد بخش ملاواں نے سات مشہور قصوں کو اردو میں لکھ کر ان کا مجموعہ ''سبعہ سیارہ'' کے نام سے مرتب کیا۔ لیکن اس کے قلمی نسخہ میں صرف پانچ قصے ملتے ہیں جن میں یوسف زلیخا، نل دمن، پدماوت، لیلی مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے شامل ہیں (۱)

خوش معرکۂ زیبا: سعادت خاں ناصر نے اردو شعراء کا ضخیم تذکرہ تین حصوں پر مشتمل ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۶ء میں لکھا تھا اس میں شاعروں کی کل تعداد ۸۲۴ ہے۔ (۲) اس تذکرے کے چار مخطوطے پٹنہ، علی گڑھ، لکھنؤ اور انجمن ترقی اردو، کراچی میں ہیں۔ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں مشفق خواجہ نے اسے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا۔

بہار بے خزاں: احمد حسین سحر نے شعراء کا تذکرہ بزبان فارسی ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں لکھا۔ (۳) اس کا خطی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔

واجد علی شاہ: واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ وہ خود ایک اچھے شاعر اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔ تخت نشینی کے چند ماہ بعد انہوں نے شاہی کتب خانے کی طرف توجہ کی۔ اور ایک اشتہار شائع کرایا جس کا مقصد نادر و نایاب کتابوں کا اکٹھا کرنا تھا۔ اشتہار کچھ اس طرح تھا:

''از کتب فہرست مفصلۂ ذیل پر نسخہ کہ بغایت بیست و چہارم این ماہ روز پنج شنبہ ۱۲۶۳ھ
نزد محمد حسین مہتمم مطبع سلطانی در تکیۂ شاہ فصیح بہ مکانش برسد ہماں وقت بشرط پسند قیمتش

---

(۱) لکھنویات ادیب: ص ۱۰۱

(۲) خوش معرکۂ زیبا: (مقدمہ) ص ۸۴

(۳) اس کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں ہے ۱۹۶۹ء مطابق ۱۳۸۸ھ میں نعیم احمد نے اسے مرتب کیا اور کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع کیا۔

خاطر خواہ بائع دادہ خواہد شد" (۱)

اس فہرست میں ڈھائی سو کتابوں کے نام شامل تھے جن میں اکثر کتابیں نادر اور کمیاب تھیں مختلف موضوعات پر بلند پایہ کتابوں میں بیشتر علم تاریخ سے متعلق تھیں۔ اس اشتہار سے واجد علی شاہ کے علمی مذاق کا اندازہ لگالینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ اس عہد کی چند بلند پایہ کتابوں کی ایک مختصر فہرست ملاحظہ ہو:

فیوض جلیلہ سلطان عالم: واجد علی شاہ کے درباری طبیب مسیح الدولہ نے علم طب میں ایک جامع کتاب "فیوض جلیلہ سلطان عالم" کے نام سے لکھی۔ جس سے اس کا سال آغاز ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء نکلتا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کا صرف مقدمہ ۴۲۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ (۲)

قصائد وقار: اسی زمانے کے ایک اور عالم منصب ارمدیر الدولہ منشی الملک راجہ جوالہ پرشاد تھے جو فارسی زبان وادب کے زبردست انشاء پرداز اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا تخلص وقار تھا۔ انھوں نے بادشاہ کی مدح میں سات قصیدے کہے، یہ قصائد وقار کے دیوان میں مندرجہ ذیل عنوان کے تحت درج ہیں:

"قصائد سبعہ در مدح حضرت سلطان عالم خلد اللہ وسلطنتہ" (۳)

معیار الاشعار کی شرح: اس دور کے ملک الشعراء شیخ مہدی علی خاں ذکی نے محقق طوسی کی کتاب معیار الاشعار کی شرح "تزکیہ" کے نام سے لکھی۔ اسکے علاوہ عروض کا ایک رسالہ "یادگیر" کے نام سے لکھا۔ (۴)

مفید الاذھان: مولوی مرزا علی مجتہد نے بادشاہ کی فرمائش پر ایک رسالہ مفید الاذھان کے نام سے لکھا۔ (۵)

---

(۱) لکھنویات ادیب: ص ۱۰۴

(۲) اس کتاب میں نو فصلیں ہیں مقدمے کے علاوہ کتاب میں پانچ باب اور ایک خاتمہ ہے اس کتاب کے مقدمے کا قلمی نسخہ بوٹانگ گارڈن لکھنؤ لائبریری میں ہے۔ اصل کتاب کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔

(۳) دیوان وقار مطبع محمدی کانپور سے ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔

(۴) لکھنویات ادیب: ص ۱۰۹

(۵) ایضاً

چشمۂ حیات: بادشاہ کے درباری طبیب سید افضل علی خاں نے یہ کتاب بادشاہ کی فرمائش پر لکھی۔

اشواق اختری: کاتب الملوک سید محمد شفیع رضوی نے لکھی۔

خود واجد علی شاہ کثیر التعداد تصانیف کے مالک تھے۔ سید مسعود حسن رضوی کی تحقیق کے مطابق اردو وفارسی نظم ونثر میں واجد علی شاہ کی کتابوں کی تعداد سو سے کہیں زیادہ ہے ۔ان میں سے ۷۰ کتابیں مسعود صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔(۱) ان میں دستور واجدی، نصائح اختری، مجموعہ واجدیہ سلطانی، بحر ہدایت، مباحثہ بین النفس، صحیفۂ سلطانیہ وعشق نامہ فارسی کی اہم کتابیں ہیں۔ یہ جملہ کتابیں واجد علی شاہ کی سخن فہمی، سخن سنجی اور علمی استعداد کا بین ثبوت ہیں۔

موسیقی واجد علی شاہ کی زندگی کا ایک اہم حصہ رہی ہے۔ فنی حیثیت سے بادشاہ کو دو چیزوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ یعنی شاعری اور موسیقی۔

فن موسیقی کی قدر دانی اور سرپرستی ہندوستان کے سبھی راجاؤں اور بادشاہوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اودھ کے حکمراں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ نواب شجاع الدولہ کی قدر دانی وفیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر اکٹھا کر دیا تھا(۲) آصف الدولہ کے عہد میں علم موسیقی پر ایک بلند پایہ کتاب ''اصول النغمات الآصفیہ'' لکھی گئی۔(۳) غازی الدین حیدر کو موسیقی کا بہت شوق تھا نصیر الدین حیدر کے یہاں ناچنے گانے والیوں کا شمار مشکل تھا۔ امجد علی شاہ یوں تو مذہبی آدمی تھے لیکن ارباب نشاط کا محکمہ ان کے یہاں بھی موجود تھا۔(۴)

موسیقی کے فن میں واجد علی شاہ نے جو کمالات پیدا کئے اس سے ان کی طبیعت کی موزونیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اسے بحیثیت ایک فن کے سیکھا اور اس کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے

---

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ (مقدمہ)

(۲) لکھنؤ کا شاہی اسٹیج: ص ۱۹

(۳) گذشتہ لکھنؤ: ص ص ۱۶۶۔۱۶۷

(۴) محل خانۂ شاہی: واجد علی شاہ (اردو ترجمہ فدا علی خنجر) ص ص ۴۲۔۴۳

انیس الدولہ ورضی الدولہ کا شمار اس عہد کے ماہرین فن میں کیا جاتا ہے۔(۱)

علاوہ بریں اس زمانے میں اسٹیج ڈراموں نے بھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔ مختصر یہ کہ واجد علی شاہ کے دور حکومت میں جس قدر علماء، فضلاء، شعراء، موسیقار، رقص وسرود کے ماہر اودھ میں تھے کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوئے جتنی فراخدلی سے واجد علی شاہ نے ان فنکاروں اور باکمالوں کی سرپرستی اور عزت افزائی کی کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوئی۔

بہرکیف نوابین اودھ کی فیاضیوں، قدردانیوں اور سرپرستیوں کے نتیجہ میں سرزمین اودہ نے ہزاروں علماء، ادباء، وشعراء پیدا کئے جن کا قیمتی کلام اور بیش بہا تصنیفات فارسی، عربی اور اردو ادب کے سرمایے میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔

---

(۱) تاریخ لکھنؤ: ص ۱۳۰

باب پنجم

نوابین اودھ کی چند اہم فارسی تصنیفات

نوابین اودھ کا زمانہ فارسی زبان وادب کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے ہر چند کہ اس زمانے میں اردو زبان نے اپنے قدم جما لئے تھے اور فارسی روبہ زوال تھی تاہم اس کا کارواں ایک بار پھر ترقی کی طرف جادہ پیما ہوا۔ چونکہ حکمراں ایرانی النسل تھے اس لئے فارسی علوم وادبیات سے انھیں غایت درجہ دلچسپی تھی۔ یہ شعروادب کے قدردان ہی نہ تھے بلکہ سخن گو اور سخن شناس بھی تھے۔ ان کی فیاضیوں کا ہی یہ اثر تھا کہ اس زمانے میں علوم وفنون نے بہت زیادہ ترقی کی۔ نظم ونثر میں مختلف موضاعات پر ایسی بے شمار تصنیفات وجود میں آئیں جو آج ہمارے لئے علم کا معدن ہیں اور ہمارے کتب خانوں کی زینت ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ نوابین اودھ نے فنون لطیفہ اور علم وادب سے دلچسپی کی سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں ہر طرح فروغ اور استحکام بھی بخشا۔ ان کے عہد میں عوام نے جن میں ہر قوم اور طبقہ کے لوگ شامل تھے، فارسی جیسی شیریں اور بلیغ زبان کو نہایب دلچسپی سے سیکھا۔ نتیجتاً نہایت سلیس، فصیح اور آساں زبان میں لاتعداد تصنیفات عالم وجود میں آئیں۔ اودھ کی سرزمین نے ایسے ایسے مایہ ناز ادیب اور شاعر پیدا کئے جو اپنی طرز نگارش، حسن بیان، زبان کی صفائی، شیرینی اور سلاست و روانی میں ہر طرح سے ممتاز وممیز تھے۔

تاریخ وتذکرہ نگاری اور سیر وسوانح کے موضوعات پر بہت سی تصنیفات منظر عام پر آئیں نہ صرف شاہان اودھ بلکہ دیگر ریاستوں کی تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی حالات پر بھی بکثرت کتابیں تالیف ہوئیں۔ تذکرہ نگاروں میں سے بعض تذکرہ نگار ایسے گزرے ہیں جن کے نام آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں، اور جن کی خدمات محققین کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس عہد کی چند اہم فارسی تصنیفات پیش کی جاتی ہیں:

تذکرے

۱*تذکرہ شعرائے اردو

۲* گلشن سخن

۳*سفینۂ ہندی

۴*حدیقۂ ہندی

۵*عقد ثریا

۶*تذکرہ ہندی

۷*ریاض الفصحاء

۸*دستور الفصاحت

۹*تذکرہ خلاصۃ الافکار

۱۰*انیس الاحباء

۱۱*انیس العاشقین

تاریخی کتابیں

۱۲*سلطان التواریخ

۱۳*چہار گلزار شجاعی

۱۴* تنقیح الاخبار

۱۵* تفضیح الغافلین

۱۶*محبوب التواریخ

۱۷*تاریخ سعادت جدید

۱۸*صفت تماشا

۱۹*تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ

لغات

۲۰*ہفت قلزم

۲۱*تاج اللغات

۲۲*نفائس اللغات

متفرق موضوعات

۲۳*دریائے لطافت

۲۴*لطائف السعادت

۲۵*عشق نامہ

۲۶*صوت المبارک

۲۷*بحر ہدایت

۲۸*حدائق النجوم

۲۹*مرأۃ الاقالیم

۳۰*تحفۂ آصفیہ

۳۱*مجموعۃ الشعراء

۳۲*دستور واجدی

۳۳*نصائح اختری

۳۴*چہار گلشن

۳۵*مسیر طالبی

تذکرے

۱* تذکرہ شعرائے اردو: میر حسن نے اپنا یہ لافانی شاہکار فیض آباد میں ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء اور ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء کے درمیان تالیف کیا۔ اردو شعراء کے حالات پر فارسی زبان میں یہ تذکرہ خاص اہمیت کا حامل ہے اس میں تین سو چار (۳۰۴) شعرائے ریختہ گو شامل ہیں (۱)

اس تذکرے میں مؤلف نے شعراء کے حالات اور ان کے کلام پر نقد و تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس کی ترتیب میں میر تقی میرؔ اور قائمؔ چاند پوری کے تذکروں (۲) سے مدد لی گئی ہے۔ تمام شعرائے متقدمین و متوسطین اور متاخرین بالترتیب تین طبقات میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ فہرست شعراء حروف تہجی کے مطابق ہے۔ طبقۂ اول میں زیادہ تر دکنی شعراء کا ذکر ہے، دوسرا طبقہ ''شعرائے اواخر عہد فرخ سیر اور ابتدائے سلطنت محمد شاہ'' تک کے شعراء پر مشتمل ہے۔

تیسرے طبقے میں معاصرین شعراء کے حالات اور ان کے کلام پیش کیے گئے ہیں۔

اس تذکرے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس سے زمانے میں فیض آباد کی ادبی نشستوں پر پوری روشنی پڑتی ہے اس کا شمار اردو شعراء کے مستند اور معتبر تذکروں میں کیا جاتا ہے۔

۲* گلشن سخن: تذکرہ ''گلشن سخن'' کے مؤلف مرزا کاظم مبتلا لکھنوی ہیں (۳) اردو شعراء کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جو نوابین اودھ کے زمانے میں فارسی میں لکھا گیا۔ اس کے دیباچہ میں ایک قطعہ سے اس کا سال تالیف ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء نکلتا ہے۔

---

(۱) یہ تذکرہ پہلی بار مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مقدمہ کے ساتھ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوا۔

(۲) نکات الشعراء از میر تقی میرؔ اور مخزن نکات از قائمؔ چاند پوری

(۳) مبتلاؔ کا اصلی نام میرزا کاظم تھا۔ نواب اودھ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ نے ان کو ''مردان علی خاں'' کا خطاب دیا تھا۔ بیشتر تذکروں میں مبتلاؔ کا نام ''مردان علی خان'' لکھا ہے۔

آب ورنگ اس کا ہے جوں باغ ارم　　نہیں اس کے مقابل گلشن
سال تاریخ میں پوچھا ان سے　　جو تھے اس فن کے سخن سنج کہن
سب لگے کہنے کہ اک عمر کے بعد　　آج پھولا ہے سخن کا گلشن

۱ ۱ ۹ ۴

بعض حالات و واقعات اس ہجری کے بعد کے بھی ملتے ہیں تذکرہ میں تین سو اکیس (۳۲۱) شاعروں کے حالات اوران کے منتخب اشعار ہیں۔(۱) شعراء کے حالات کے مقابلے میں ان کے کلام کا انتخاب زیادہ ہے۔تذکرے کے دیباچہ سے ایک مختصر عبارت نقل کی جاتی ہے۔

''چنان بہ خاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویان سابق وحال کہ درین زمان کمال اشتہار در قلمرو ہندوستان دارند۔۔۔منتخب نمودہ صحیفۂ جمع نماید تا از مطالعۂ آن شیفتگان محبوبان معنی خطی وافر بردارند۔الحمد نواسب العطایا کہ دراندک زمان کامیاب گردیدہ و بہ مقصد رسیدہ۔
چون عقدۂ خاطر را بہ ناخن حسن انجام تالیف کشود مسمّٰی بہ گلشن سخن نمود'' (۲)

تذکرے میں خاص بات جو قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ مؤلف نے انتخاب کلام کے لئے دو اوین کے مطالعہ پر کافی توجہ دی ہے۔اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ رامپور رضا لائبریری میں تھا جس کو مسعود حسن رضوی ادیب نے مرتب کر کے ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع کرایا۔

۳*سفینۂ ہندی: تذکرہ ہذا کے مصنف بھگوان داس ہندی ہیں۔ یہ تذکرہ تین سو پینتس (۳۳۵) فارسی شعراء کے حالات اوران کے نمونۂ کلام پر مشتمل ہے۔اس کا سال تصنیف ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء ہے، مادہ تاریخ ''باغچہ بہار'' سے نکلتا ہے۔

این باغچہ یافت حسن اتمام　　یارب نرسد گہی زوالش
گلہای خرد درو شگفتہ　　شد باغچہ بہار سالش (۱۲۱۹ھ)

شعراء کے حالات و واقعات کے علاوہ ان کے کلام پر تنقیدی جائزے بھی شامل ہیں۔اسکا واحد

(۱) گلشن سخن: مردان علی خاں مبتلا لکھنوی، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب (مقدمہ)
(۲) گلشن سخن (قلمی) رضا لائبریری رامپور

نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے (۱) عطاء الرحمٰن عطاء کاکوی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''این تذکرہ بر بنائے نایابی قابل قدر است و نیز اہمیتش بریں سبب زیادی شود کہ مصنف احوال شعرائے معاصرین رابہ تفصیل نوشتہ است وتاریخ ولادت ووفات ودیگر معلومات علمی وسیاسی وملکی بکار بردہ'' (۲)

۴*حدیقۂ ہندی: سفینۂ ہندی کے مقدمہ میں صراحت ہے کہ اس کے مصنف بھی بھگوان داس ہندی ہیں۔ اور یہ تذکرہ انھوں نے قدیم فارسی شعراء کے حالات پر ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ تذکرہ اب مفقود ہے۔ (۳) اور مزید تفصیلات بھی نہیں ملتیں۔

۵*عقد ثریا: اس کے مؤلف غلام ہمدانی مصحفی ہیں۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں مصحفی نے شعرائے فارسی کا یہ تذکرہ تالیف کیا۔ مادہ تاریخ ''زہی باغ باصفا'' سے نکلتی ہے۔

ایمن روضہ شد چو ساختہ چون روضہ بہشت

تاریخ یافت خامہ ''زہی باغ باصفا''

۱۱۹۹

اس تذکرہ میں عہد محمد شاہ (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء۔ ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۷ء) سے شاہ عالم (۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۲ء) کے عہد تک ایک سو سینتیس (۱۳۷) شعراء کے احوال شامل ہیں۔

تذکرہ نویسی کے میدان میں یہ مصحفی کی کوششوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس تذکرے کے لکھنے کی ابتداء دہلی کے زمانہ قیام میں ہوئی اور تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے شائع کیا۔ (۴)

۶*تذکرہ ہندی: اس تذکرے کے مصنف بھی مصحفی ہیں۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے قریب مصحفی نے اپنے شاگرد میر مستحسن خلیق کی فرمائش پر ''تذکرہ ہندی'' کی ترتیب کا کام شروع کیا، جو

---

(۱) عبدالرحمٰن کاکوی نے ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء میں مرتب کر کے ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ سے شائع کیا۔

(۲) سفینۂ ہندی: (مقدمہ)

(۳) سفینۂ ہندی: (مقدمہ)

(۴) یہ تذکرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن) کی جانب سے برقی پریس دہلی سے شائع ہوا۔

۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء میں مکمل ہوا۔ اردو شعراء کے حالات پر مصحفی کا یہ کارنامہ قابل تعریف ہے۔ اس میں ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) شعراء اور پانچ شاعرات کو شامل کیا گیا ہے۔ (۱)

۷*ریاض الفصحاء: یہ بلند پایہ تصنیف بھی مصحفی کے قلم کی دین ہے۔ اس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے تقریباً تین سو بائیس (۳۲۲) شعراء شامل ہیں۔ جن میں دو سو بہتر (۲۷۲) خالصتاً ریختہ گو ہیں، ۳۷ شاعروں کا صرف فارسی کلام پیش کیا گیا ہے اور تیرہ شاعروں کے انتخاب میں اردو و فارسی دونوں زبانوں کے اشعار شامل ہیں، ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر سابقہ تذکروں (عقد ثریا اور تذکرہ ہندی) میں بھی آچکا ہے۔ ''ریاض الفصحاء'' اس تذکرے کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء برآمد ہوتا ہے۔ لالہ چنی لال حریف کی فرمائش پر مصحفی نے اس تذکرہ کی شروعات اسی سنہ میں کی تھی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں یہ تذکرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مصحفی کے ان تذکروں کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت سوانحی اور تنقیدی عناصر کا امتزاج ہے۔ سنین اور تواریخ کے حوالے کم ہیں۔ اس کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ مرتبہ نسخہ میں تین سو اکیس (۳۲۱) شاعر ہیں (۲)

۸*دستور الفصاحت: اس کتاب کے مصنف احد علی خاں یکتا لکھنوی ہیں۔ اس کتاب کو تذکرہ کا نام تو نہیں دیا جاسکتا، لیکن درحقیقت یہ اسی فہرست میں آتی ہے کیونکہ اس کتاب کے بعض حصے شعرائے اردو کے تعارف کیلئے مخصوص ہیں۔ خاتمہ میں اردو کے پینتیس (۳۵) صاحب طرز اور ممتاز شعراء کا ذکر شامل ہے۔ اور اس میں جو مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں اس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کی تصنیف ہے جو ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں نظر ثانی کے بعد از سر نو مرتب کی گئی۔ کتاب کا مقدمہ اردو کے لسانی جائزے سے متعلق ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری نے ابتدائی اور آخری دونوں حصوں کو یکجا کر کے اسے ایک تذکرے کی صورت عطا کر دی ہے۔ (۳)

---

(۱) ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ ترقی اردو کے سلسلہ مطبوعات کے تحت شائع ہوا اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔

(۲) مولوی عبدالحق نے ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں اس تذکرہ کو مقدمہ کے ساتھ ترقی اردو کے سلسلہ مطبوعات کے تحت شائع کیا۔

(۳) ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء میں ہندوستانی پریس رامپور سے شائع ہوا (تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک: سید علی رضا نقوی: ص ۴۰۷)

۹* تذکرہ خلاصۃ الافکار: اس کے مؤلف مرزا ابو طالب اصفہانی لکھنوی ہیں۔ اس تذکرے کی شروعات ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء میں ہوئی، اور ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا۔ تذکرے کے دیباچہ میں مؤلف نے ایسے سترہ قطعہ کہے ہیں جن سے تذکرے کے آغاز و انجام کی صحیح تاریخ نکلتی ہے۔ آخری قطعہ ملاحظہ ہو:

"گل بیخار و گنج بی رنج "است　　سال اتمام این خجستہ نگار(۱۲۰۷ھ)

ورتواز مبداش بخواہی گو　　"جمع یکجا خلاصۃ الافکار"(۱۲۰۶ھ)

تذکرہ میں چار سو چورانوے (۴۹۴) شعراء کے احوال شامل ہیں(۱) جس میں متقدمین متاخرین اور معاصرین سبھی شامل ہیں۔ احوال کم ہیں مقابلتاً نمونہ کلام زیادہ ہے۔ علی رضا نقوی لکھتے ہیں:

تعداد اشعار منتخب در این تذکرہ خیلی زیاد است۔۔۔ بعض شعرا بچہار صد حتی بہفت صد بالغ میشود"(۲)

مؤلف نے تذکرے کی تالیف کے سلسلے میں لکھا ہے:

بسیاری از کتابھا را مطالعہ کردہ و چون بشعر خیلی علاقہ داشت از مدتی تصمیم گرفتہ بود کہ تذکرہ ای از شعرائے متقدم و متاخر تألیف کند کہ مورد چند خاطر مردم باشد۔۔۔"(۳)

اس کا مکمل قلمی نسخہ تہران یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں ہے۔(۴)

۱۰* انیس الاحبا: تذکرہ انیس الاحباء کے مؤلف "موہن لعل انیسؔ" ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں لکھا گیا۔(۵) چنانچہ کتاب کے آخر میں درج ذیل قطعہ ملتا ہے:

---

(۱) تفضیح الغافلین: میرزا ابو طالب اصفہانی، (مقدمہ) سید علی رضا نقوی نے شعراء کی کل تعداد ۴۹۲ بتائی ہے، تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک: ص ۴۸۴

(۲) تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک: ص ۴۸۵

(۳) تذکرہ خلاصۃ الافکار: (مقدمہ)

(۴) ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء کا میرزا محمد کاظم شہیر کا لکھا ہوا مکمل قلمی نسخہ جس میں صفحات کی کل تعداد ۳۸۵ ہے (تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک: ص ۴۸۸)

(۵) قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

این نسخہ کہ رشک باغ بی سعی جلیس　　چون ساخت انیس ازگل شعرنفیس

سالش زچمن طراز دانش جستم　　فی الفور بگفت ''این بود باغ انیس''

۱۹۷ھ

یہ تذکرہ خاص طور پر مرزا فاخر مکیںؔ اور ان کے شاگردوں کے احوال پر مشتمل ہے مؤلف نے خود مقدمہ میں اس بات کی صراحت کی ہے تذکرہ ہذا میں دو باب ہیں۔ باب اول میں تینتس (۳۳) مسلمان شعراء ہیں۔ باب دوم میں چھ (۶) ہندو شعراء ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے خاتمہ میں مؤلف نے گیارہ شاعروں کا مزید ذکر کیا ہے یہ تمام شعراء مکیںؔ کے ممتاز شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں اس طرح شعراء کی کل تعداد پچاس (۵۰) ہے۔

۱۱*انیس العاشقین: رتن سنگھ زخمیؔ نے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں فارسی شعراء کا یہ ضخیم تذکرہ تالیف کیا۔ (۱) دو حصوں پر مشتمل اس تذکرے میں شعراء کے اشعار کی تعداد دو ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ پہلا حصہ آبرو سے شروع ہو کر ضیائی پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا حصہ طالبؔ جاجرمی سے شروع ہو کر ''یونس ابھریؔ'' پر ختم ہے۔

تذکرہ میں شعراء کے احوال نہایت مختصر ہیں۔ بلکہ بعض جگہوں پر تو صرف ایک یا دو سطر پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ تذکرہ کے دیباچہ میں بادشاہ نصیر الدین حیدر کی تعریف ملتی ہے اس کے بعد چند صفحات میں مصنف نے اپنا ذکر کیا ہے۔

۱۲*سلطان التواریخ: محمد علی شاہ کے عہد میں ''رتن سنگھ زخمیؔ'' نے اودھ کی تاریخ لکھی انہیں فارسی، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ شاعر بھی تھے اور مصنف بھی، نصیر الدین حیدر کے عہد میں دیوانی اور منشی گیری کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سلطان التواریخ اہم ہے (۲)

---

(۱) پہلے حصہ کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے کتاب خانہ میں ہے، دوسرا حصہ جس میں ۱۷۲ شاعروں کا تذکرہ شامل ہے۔ کتابخانہ گوری پرشاد (لکھنؤ) میں ہے۔ (تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاک: ص ۵۲۶)

(۲) قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتابخانے میں ہے۔

۱۳*چہار گلزار شجاعی: اس تاریخی کتاب کے مصنف منشی ''ھرچرن داس'' ہیں ۔ یہ کتاب انھوں نے نواب شجاع الدولہ کے نام معنون کی اور عنوان بھی نواب کے نام کی مناسبت سے رکھا۔ ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء سے ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۷ء کے درمیان یہ مکمل ہوئی۔ اس کتاب سے نواب سعادت خاں اور صفدر جنگ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے تاریخ اودھ کے سلسلہ میں یہ کتاب ایک اہم ماخذ ہے۔ (۱)

۱۴* تنقیح الاخبار: اس کتاب کے مصنف منولال فلسفی ہیں۔ سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن نہایت ہی جامع ہے۔ اس میں ہندو بیرون ہند کی تاریخ بڑی جامعیت سے قلمبند کی گئی ہے۔ یہ کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس کے باب اول میں ۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء سے قبل کے ہندوستان اور اس کے دوسرے حصوں پر حکمرانی کرنے والے سلاطین کا تذکرہ ہے۔ دوسرے ابواب میں مغل سلاطین، فارس بابل، مصر و شام وغیرہ کی تاریخ و سیاست کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۵* تصفیح الغافلین: اس کے مؤلف مرزا ابوطالب اصفہانی ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں ترتیب دی گئی۔ اس کا دوسرا نام ''وقایع زمان نواب آصف الدولہ'' بھی ہے اس کتاب میں نواب آصف الدولہ کے عہد کے تاریخ واقعات بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ ہر سال کو نئے باب کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اور اس باب کو ''وقایع'' کا نام دیا ہے (۲)

۱۶* محبوب التواریخ: اس کے مصنف راجہ جے گوپال ثاقب ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کے مصاحبین خاص میں سے تھے۔ نوابین اودھ کی حکومت کے آخری دور میں ثاقب نے یہ تاریخ مرتب کی۔ (۳)

۱۷*تاریخ سعادت جدید: مصنف ''ہرنام سنگھ'' کی تصنیفات میں یہ کتاب سرفہرست ہے۔ ''ہرنام سنگھ'' نے نواب سعادت علی خاں کے نام معنون کی۔ اس کتاب میں چار فصلیں ہیں۔ فصل اول کے عہد

---

(۱) قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتابخانے میں ہے۔

(۲) قلمی نسخہ کتابخانہ رضا لائبریری رامپور میں اور دوسرا نسخہ صولت لائبریری رامپور میں ہے۔ تصحیح و ترتیب کے بعد عابد رضا بیدار نے اسے ۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء میں شائع کروایا۔

(۳) اس کا نادر نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری فصل سلاطین دہلی، تیسری عہد آصف الدولہ اور چوتھی فصل متفرق امور پر ہے۔(۱)

۱۸* ہفت تماشا: اس کے مصنف مرزا محمد حسن قتیل ہیں۔ یہ کتاب قتیل کی زندگی کے آخری دنوں (۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء) کی تصنیف ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ نہایت اہم ہے۔(۲) اس کتاب میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی معاشرت پر اتنی قابل قدر معلومات ہیں جو اس عہد کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں سات تماشے یعنی سات ابواب ہیں۔(۳) ابواب کو تماشوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان ابواب میں انسان کی آفرینش کا بیان، ہندو فرقوں کے عقائد، ہندوؤں کے متبرک تہواروں، ہندوؤں کے رسوم و رواج اور ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے رسوم و رواج کا بیان ہے قتیل نے یہ کتاب نواب سعادت علی خاں کے نام معنون کی تھی۔

۱۹* تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ: تاریخ اودھ پر یہ نہایت ہی اہم تاریخی کتاب ہے۔ اس کے مصنف ''قاسم علی'' ہیں، جن کا خاندانی تعلق نیشاپور (ایران) سے تھا۔ قاسم علی نے نواب سعادت علی خاں کے دور سے لے کر محمد علی شاہ کے عہد تک کے چشم دید واقعات سے روشناس کرایا ہے۔(۴) اس کتاب میں شاہان اودھ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔

---

(۱) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان: نریندر بہادر سریواستو، ص ۱۷۴

(۲) ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع نولکشور سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔

(۳) ہفت تماشا: (مقدمہ)

(۴) اس اہم تاریخی کتاب کا مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ چار سو پچاس (۴۵۰) صفحات پر مشتمل بہت ہی خوش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ یہ مخطوطہ کافی عرصہ تک گمنامی کے اندھیروں میں پڑا رہا۔ آخر کار اس نایاب تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے اس کا اردو ترجمہ کیا اور اسے ترتیب دے کر ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع کیا۔

''لغات''

۲۰* ہفت قلزم: فارسی کا ایک ضخیم لغت جسے ''شاہ اودھ غازی الدین حیدر'' نے خود تالیف کیا، پہلے اس کا نام ''فرہنگ رفعت'' تھا۔ رفعت الدولہ بادشاہ مذکور کا خطاب بھی رہ چکا تھا۔ مولوی قبول محمد نے اسے ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۴ء سے ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء کے درمیان ترتیب دیا۔ پانچ سال بعد شاہی مطبع میں اس کی طباعت کا کام شروع ہوا اور ۱۲۳۷ھ/ ۲۲-۱۸۲۱ء میں ہفت قلزم کے نام سے سات ضخیم جلدوں میں چھپ کر تیار ہوا (۱) اس کے صفحات کی تعداد ''۱۵۵۰'' ہے۔

۲۱* تاج اللغات: یہ عربی زبان کا نہایت ضخیم لغت ہے۔ اس کی تالیف کے لئے غازی الدین حیدر نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں لغات عرب کے ہندوستانی ماہروں کا ایک عملہ مقرر کیا تا کہ عربی کا ایک ایسا جامع ترین لغت تیار کریں جس کے معانی و مطالب فارسی میں ہوں، یہ لغت کئی سال کی محنت کے بعد مکمل ہوا۔ غازی الدین حیدر کے فرزند نصیر الدین حیدر کے عہد میں مکمل ہو کر آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔ (۲) جلدوں کی ضخامت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جلد اول میں ۷۲۵ صفحات، جلد دوم ۶۲۴، جلد سوم میں ۲۵۲، جلد چہارم میں ۷۶ا جلد پنجم ۵۹۶، جلد ششم میں ۴۰۸ اور جلد ہفتم میں ۱۳۸ صفحات ہیں۔

۲۲* نفائس اللغات: مولوی احد الدین بلگرامی نے ایک ایسا جامع لغت تیار کیا جس میں ہندی الفاظ کے معانی فارسی میں لکھ کر ان کے عربی و فارسی مترادفات بتائے گئے ہیں، اس کے دیباچہ میں بادشاہ وقت ''محمد علی شاہ'' کی طویل مدح بیان کی گئی ہے۔ (۳)

---

(۱) اس کا ایک نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ہے۔

(۲) تاج اللغات کے صرف چند سیٹ ہندوستان میں موجود ہیں مگر سب زیادہ سے زیادہ سات جلدوں پر مشتمل ہیں۔ پوری آٹھ جلدیں صرف مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کے کتب خانے میں موجود تھیں جو ادارۂ کتاب نگر لکھنؤ کی معرفت کشمیر یونیورسٹی لائبریری میں پہنچ گئیں (لکھنویات ادیب: ص ۸۹)

(۳) ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء میں پہلی مرتبہ مطبع مصطفائی لکھنؤ سے چھاپی گئی۔

متفرق موضوعات

۲۳*دریائے لطافت: دریائے لطافت انشاء اللہ خاں انشاؔء اور مرزا محمد حسن قتیلؔ کی مشترکہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ اردو صرف ونحو سے متعلق ہے جو انشاؔء کی جودت طبع کا نتیجہ ہے، دوسرا حصہ منطق وعروض کے بیان میں ہے جو قتیلؔ کا لکھا ہوا ہے یہ کتاب ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں مکمل ہوئی۔

انشاؔء نے پہلے اس کتاب کا نام ''ارشاد و ناظمی'' اور ''بحر سعادت'' تجویز کیا تھا۔ اور قتیلؔ نے ''دریائے لطافت'' اور ''حقیقت اردو'' لیکن مقبولیت ''دریائے لطافت'' کے حصہ میں آئی۔(۱)

دریائے لطافت کے مترجم کی حیثیت سے پنڈت کیفی نے انشاؔء کی صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اپنے ادب اور زبان سے متعلق جو کوئی بھی جو کچھ لکھتا ہے اس کے سامنے یورپ کا لٹریچر اور اس کے ادیبوں کے نظریے ہوتے ہیں۔ دریائے لطافت کا سنہ تصنیف انیسویں صدی عیسوی کا آٹھواں برس ہے۔ اس زمانے میں یورپ کی زبانوں اور علم وادب سے ناواقف محض ہونے کے باوجود سید انشاء کا یہ کتاب تصنیف کرنا، اس کی یہ پرواز رکھنا، ان کی دقت نظر اور سائنٹفک تنقید اس روشنی کے زمانے میں محیر العقول ہے''(۲)

۲۴*لطائف السعادت: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب لطائف پر مشتمل ہے، اس میں نواب سعادت علی خاں کے زمانے کے ''۵۵'' لطائف جمع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف بھی انشاؔء

---

(۱) پہلی بار ۱۲۲۶ھ/۱۸۴۹ء میں مولوی مسیح الدین خاں بہادر نے مطبع آفتاب عالم مرشد آباد سے طبع کرایا۔ عرصہ تک اس کتاب کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوئی۔ دوسری بار ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو نے اسے طبع کرایا۔ اس مرتبہ اس میں تھوڑی ترمیم کی گئی یعنی علم منطق اور علم عروض کے شامل حصوں کو کتاب سے خارج کر دیا گیا۔ تیسری بار اس کتاب کو زیادہ عام فہم اور مقبول بنانے کے لئے اس کا اردو ترجمہ پنڈت کیفی دہلوی سے کرایا گیا، اور یہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء کا مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

(۲) دریائے لطافت: مترجمہ پنڈت کیفی دہلوی، ص: ض ق

ہیں کتاب کے نام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام لطائف نواب سعادت علی خاں سے متعلق ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ وہ لطائف ہیں جو نواب کی صحبتوں میں اکثر و بیشتر پیش آئے تھے۔ چند لطائف تو نواب سے ہی منسوب ہیں مگر بیشتر لطائف میں دیگر لوگ شامل ہیں، جو نواب یا انشا کے برجستہ جملوں کی زد میں آ گئے ہیں۔(۱)

اس کتاب کے صحیح سنہ تالیف کا کہیں ذکر نہیں ملتا، کچھ لطائف کی تاریخوں اور ''دریائے لطافت'' کے مقدمے سے یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء کا رہا ہوگا۔ البتہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء تک انشاء یہ لطائف قلمبند کرتے رہے اور اسی سنہ میں اسے ترتیب دے کر اس کا عنوان بھی تجویز کر لیا تھا لیکن افسوس کہ وہ تمام اوراق محفوظ نہ رہ سکے۔ شروع کے صرف سولہ ورق ہی برٹش میوزیم پہنچ سکے جسے ڈاکٹر آمنہ خاتون نے مرتب کر کے مع حواشی اور تعلیقات کے ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ اس کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ اصل فارسی متن دائیں طرف کے صفحات پر اور ان کے اردو تراجم مقابل کے بائیں کے بائیں طرف کے صفحات پر درج ہیں(۲)

ان لطائف سے انشا اور نواب کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لطائف کی زبان فارسی ہے کیونکہ یہ اس وقت کی درباری زبان تھی، لیکن کہیں کہیں اردو کے جملے بھی آ گئے ہیں جو سہل اور سادہ نثر کے عمدہ نمونے ہیں جب کوئی جملہ انشاء نے اردو میں لکھا ہے تو اس کے ساتھ صراحت بھی کی ہے کہ ''در لہجۂ اردو'' بعبارت اردو، بزبان ہندی، در زبان اردو وغیرہ وغیرہ۔

۲۵* عشق نامہ: یہ کتاب واجد علی شاہ کے قلم کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی عمر کے ابتدائی ۲۶ سال کے تفصیلی حالات پیش کئے ہیں، جس میں عشق و محبت کی ۱۳۲ داستانیں بھی شامل ہیں یہ داستانیں صرف بادشاہ سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اس عہد کے امراء و رؤساء کی نجی زندگی سے بھی متعلق ہیں(۳)

(۱) اس کتاب کا صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔

(۲) دریائے لطافت (مقدمہ)

(۳) اس کتاب کا اردو ترجمہ فدا علی خنجر نے ''محل خانہ شاہی'' کے نام سے ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں مطبع نامی لکھنؤ سے شائع کیا۔ فارسی متن کا قلمی نسخہ ریاست محمود آباد کے کتاب خانے میں تھا جس کی نقل مسعود حسن صاحب کے پاس موجود ہے۔

۲۶*صوت المبارک :اس کے مصنف بھی بادشاہ مذکور ہیں۔۱۲۲۹ھ /۱۸۵۳ء میں مطبع سلطانی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔۱۶۴صفحات پر مبنی کتاب میں ایک مقدمہ اور چھ باب ہیں۔

۲۷*بحر ہدایت :واجد علی شاہ کی اس کتاب میں ایک سو تیرسٹھ (۱۶۳) مسئلے ہیں۔ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع سلطانی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

۲۸*حدائق النجوم :علم ہیئت کے موضوع پر یہ ایک ضخیم کتاب ہے،جس کے مصنف راجہ رتن سنگھ زخمی ہیں۔یہ کتاب محمد علی شاہ کے عہد (۱۲۵۳ھ /۱۸۳۷ء۔۱۲۵۸ھ /۱۸۴۲ء) میں مکمل ہوئی۔اس میں شامل نقشے اور جدولیں مصنف نے خود ہی تیار کیے ہیں۔(۱)

۲۹*مرأت الاقالیم :فن ہیئت سے متعلق یہ اہم تصنیف خلیل الدین خان نے بادشاہ غازی الدین کی فرمائش پر مرتب کی تھی۔اس میں اودھ کی شاہراہوں کا جغرافیہ اور دنیا کے دوسرے مشہور ملکوں کے طول و عرض درج کیے گئے ہیں۔

۳۰*تحفۂ آصفیہ :فخر الدین احمد معروف بہ مرزا جعفر نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔یہ کتاب صید و شکار سے متعلق ہے۔نواب آصف الدولہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔(۲)

۳۱*مجموعۃ الشعراء :نواب آصف الدولہ کے عہد میں ٹیکا رام تسلی نے سات سو فارسی دواوین سے ہم طرح غزلوں کے اشعار منتخب کر کے ان کو ردیف وار دیوان کی صورت میں ترتیب دیا تھا۔اس کام میں ۱۷ سال صرف ہوئے۔(۳)

۳۲*دستور واجدی :واجد علی شاہ کی یہ تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہے بلکہ اس کتاب کو ''واجد علی شاہ'' کا آئین حکومت سمجھنا چاہیے۔اس میں چھیاسٹھ (۶۶) دستور ہیں جن کی

---

(۱)اس کتاب کا ایک نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں ہے۔

(۲)اس کتاب کا ایک نسخہ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں ہے۔

(۳)قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں ہے۔

تفصیل ''وزیرنامہ'' میں درج کی گئی ہے۔(۱)

۳۳*نصائح اخگری: یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار فصلیں ہیں۔اس کے مصنف واجد علی شاہ ہیں۔(۲)

۳۴*چہار گلشن: کتاب ہذا چہار گلشن ''چترگلشن'' اخبار النوادر اور خلاصۃ النوادر کی ایک ناموں سے مشہور ہے۔اس کے مؤلف ''رائے چترمن کایستھ'' معروف بہ ''رائے زادہ'' ہیں۔اس کتاب کو ''رائے زادہ'' نے اپنی عمر کے آخری سال میں تصنیف کیا۔بادشاہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں انہی کی فرمائش پر یہ کام شروع ہوا تھا۔اس کے بعد مصنف کے پوتے ''رائے خان'' (یا رائے بھان منشی) نے ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء میں اس (کتاب) پر نظر ثانی کر کے اسے مرتب کیا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں چہار گلشن یعنی چار باب ہیں (۳) اگرچہ تاریخی نقطہ نظر سے یہ کتاب زیادہ اہم نہیں لیکن اس کے بعض حصے نہایت کارآمد ہیں۔

۳۵*مسیر طالبی: مسیر طالبی (۴) ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء کا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامہ کے مصنف مرزا ابو طالب اصفہانی لکھنوی ہیں۔

مرزا ابو طالب کے والد حاجی محمد بیگ خان آذربائیجان کے ترکوں میں سے تھے۔ان کی پیدائش ''عباس آباد'' (اصفہان) میں ہوئی۔نوجوانی میں ہندوستان آنا ہوا۔یہاں آکر نواب صفدر جنگ (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء۔۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ابو طالب کی پیدائش شہر لکھنؤ میں ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء میں ہوئی خود لکھتے ہیں:

---

(۱) وزیرنامہ: ص ص ۱۴۷۔۱۵۲

(۲) ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔

(۳) پہلا باب صوبہ ہائے ہندوستان، دوسرا صوبہ دکن، تیسرا دہلی سے مختلف شہروں کا فاصلہ اور چوتھا باب ہندو اور مسلمان فقیروں کے حالات پر مبنی ہے۔

(۴) مسیر طالبی کا نام ''مسیر طالبی فی بلاد افرنجی'' بھی لکھا ہوا ملتا ہے (مسیر طالبی: ص ۲)

''ولادت این بی سعادت در آخر سنہ ۱۱۶۶ یک ہزار و یکصد وشصت وشش در لکھنؤ اتفاق افتاد''(۱)

چودہ سال کی عمر میں ان کے والد محمد بیگ خان نے انھیں مرشد آباد (بنگال) بلا لیا۔ ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء کے قریب لکھنؤ سے روانہ ہوئے، یہ ان کا پہلا سفر تھا۔ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ نے انہیں واپس بلا لیا۔ غرض کہ لکھنؤ اور کلکتہ کے درمیان ابو طالب نے کئی بار سفر کیا۔(۲)

''مسیر طالبی'' ابو طالب کا وہ سفر نامہ ہے جو انھوں نے یورپ کے مختلف ممالک (۳) کے سفر کے دوران مرتب کیا تھا۔ اس سفر کی شروعات ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء میں کلکتہ سے ہوئی۔ پانچ سال بعد (۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء) میں ابو طالب لکھنؤ واپس آئے۔

یہ سفر نامہ آٹھ سو تیس (۸۳۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تصحیح و ترتیب کا کام ابو طالب کے بیٹوں مرزا حسین علی اور میر قدرت علی نے انجام دیا۔ ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔(۴)

سفر نامہ کے شروع کے صفحات میں مؤلف نے اپنے حالات لکھے ہیں، پھر سفر کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

---

(۱) مسیر طالبی: ص ۱۱

(۲) ۱۔ مسیر طالبی: ص ص ۱۲۔۱۴

۲۔ تفضیح الغافلین: (مقدمہ)

(۳) مثال کے طور پر انگلینڈ، پیرس آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ہالینڈ، اسپین اور جنیوا وغیرہ کے بارے میں کافی تفصیلات مہیا کی ہیں۔

(۴) مسیر طالبی کا ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء کا مطبوعہ نسخہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہے۔

باب ششم

اودھ کے فارسی گو شعراء

(حصہ اول) صاحب دیوان شعراء

گذشتہ ابواب میں ہم نے ''اودھ سے متعلق جو مختصر معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ سیاسی و تاریخی پس منظر، نوابین و شاہانِ اودھ اور ان کے سوانحی خاکے، ان کی تہذیب، ان کی علم دوستی، ادب کی سرپرستی اور ان کے اہم تصنیفی کارناموں پر مشتمل تھے۔ اس باب میں ہم اصل موضوع ''اودھ کے فارسی گو شعراء'' پر بالتفصیل بحث کریں گے جو دراصل ہمارا موضوع ہے۔ مقالے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ یہاں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی پس منظر کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے جو شعراء اور ان کے کلام اور احوال و آثار کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو۔

اگر چہ فارسی شعراء اور ان کے کلام سے متعلق بے شمار تذکرے لکھے گئے لیکن دور نوابین کے فارسی شعراء پر ایسا کوئی خاص علمی کارنامہ سامنے نہ آیا جس میں اودھ کا موضوع زیر تحقیق آیا ہو۔ ''نوابین اودھ'' نے جس خصوصی توجہ اور دلچسپی سے علماء و ادباء اور شعراء کی سرپرستی کی، ضرورت تھی کہ ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے کتابی شکل دی جائے۔

اس سلسلے میں ہمیں شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جس میں کافی قطع و برید کے بعد سو (۱۰۰) شعراء اس مقالے میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس تراش و خراش کی وجہ یہ ہوئی کہ بہت سے شعراء ایسے ملے، جو فارسی شاعر تو تھے لیکن ان کے بارے میں تسلی بخش معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔

یہاں جن شعراء کو ہم نے شامل کیا ہے، وہ ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں عہد نوابین میں ''سرزمین اودھ'' سے وابستہ تھے۔ یہ دور ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۱ء) سے ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء پر محیط ہے۔

شعراء کی تعداد کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، حصہ اول میں ان شعراء کو شامل کیا ہے جو باوثوق ذرائع کے مطابق فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔

حصۂ دوم میں وہ مشہور و معروف شعرائے اودھ ہیں جو اپنے کلام کی مقبولیت کی بنا پر شہرت و عظمت کے مالک تھے، اگرچہ صاحب دیوان نہیں تھے۔ ان میں اکثر شعراء ایسے بھی ہیں جن کے حالات زندگی تذکروں میں برائے نام دستیاب ہیں، اور کچھ شاعر ایسے ہیں جن کے احوال تو کسی قدر ملتے ہیں لیکن ان کے نمونۂ کلام مفقود ہیں۔

یوں تو اس عہد میں فارسی گو شعراء تعداد میں مقابلتاً کم تھے۔ لیکن اس زمانے کے تمام اردو شعراء نے بالعموم فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان ذولسانی شاعروں میں بڑی تعداد ان مہاجرین شعراء کی ہے جو زیادہ تر دہلی سے تعلق رکھتے تھے چونکہ اس زمانے میں دہلی میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا لہذا بادشاہ خود لاچار و مجبور اور علماء و ادباء کی سرپرستی سے معذور تھے برخلاف اس کے صوبۂ اودھ میں ملک کی دیگر ریاستوں اور درباروں کے مقابلے میں جود و سخا اور داد و دہش کا کچھ اور ہی عالم تھا یہاں سیاسی طور پر امن و سکون تھا، انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ ہو جانے کے بعد یہ ریاست اور بھی محفوظ ہو گئی تھی چنانچہ فیض آباد اور لکھنؤ میں دہلی سے ہجرت کر کے آئے کئی بڑے ادبی و شعری ستون قائم تھے مثال کے طور پر میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ جیسی شخصیات تھیں، جو فارسی کے نامور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو میں اپنی نظیر آپ تھے۔

اس زمانے میں علم و ادب کا بہترین گہوارہ اور معاشرے کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز حکمرانوں کا دربار تھا۔ درباری سرپرستی کسی شخص کے وقار میں اضافہ کا سبب ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ اودھ میں جب نوابین نے ہمارے شعراء کو نوازا تو معاشرے میں بھی ان کی عزت بڑھ گئی اور ہر صاحب کمال دربار اودھ میں آ کر اپنے فن کی داد پانے لگا۔

اصناف شعر میں اولین درجہ غزل کو حاصل تھا اس عہد میں شعراء کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں اس میں بیشتر غزلیں ہیں دوسرے درجہ پر قصیدہ ہے، چونکہ بیشتر شعراء دربار سے وابستہ تھے لہذا انہوں نے والیان ریاست کی شان میں قصائد بھی کہے ہیں، تیسرا درجہ مرثیہ گوئی کو حاصل ہے اس لئے کہ شیعیت کا رنگ ہر طرف غالب تھا لہذا شعراء نے اس میدان میں بھی کھل کر طبع آزمائی کی، علاوہ بریں مثنوی اور رباعیات کے نمونے ملتے ہیں۔

آئندہ صفحات میں جن صاحبان کے احوال و آثار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

(حصہ اول) صاحب دیوان شعراء

۱* حکیم شفائی خاں ارشدؔ

۲* میر غلام علی آزادؔ بلگرامی

۳* شاہ فصیح افصحؔ

۴* انشاء اللہ خاں انشاءؔ

۵* موہن لعل انیسؔ

۶* جسونت سنگھ پروانہ

۷* مولانا شاہ تراب علی قلندرؔ

۸* سید محمد اشرف حسرتؔ

۹* بندرابن داس خوشگوؔ

۱۰* سرب سکھ دیوانہؔ

۱۱* مرزا بھچو ذرہؔ

۱۲* برہان علی خاں رہینؔ

۱۳* راجہ رتن سنگھ زخمیؔ

۱۴* میر عنایت بیگ ساکنؔ

۱۵* محمد صدیق سخنورؔ

۱۶* مرزا محمد رفیع سوداؔ

۱۷* کنور دولت سنگھ شکریؔ

۱۸* شیخ نظام الدین احمد صانعؔ

۱۹* طالب علی خاں عیشیؔ

۲۰* کرتا کرشن فیضؔ

۲۱* مرزا کاظم مبتلاؔ لکھنوی

۲۲* شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

۲۳* مرزا فاخر مکینؔ

۲۴* میر قمر الدین منتؔ

۲۵* موجی رام موجیؔ

۲۶* میر تقی میرؔ

۲۷* رائے پنجاب رائے والیؔ

۲۸* بھگوان داس ہندیؔ

حکیم شفائی خاں ارشدؔ

حکیم شفائی خاں نام اور تخلص ''ارشدؔ'' تھا۔ یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، خاندانی پیشہ طبابت تھا، جس پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا، اس وقت نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ ارشدؔ کو آصف الدولہ کے دربار میں دوسروں کے مقابلے میں امتیاز حاصل تھا۔

ارشدؔ شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے اور گاہے بہ گاہے فارسی کے اچھے اور عمدہ اشعار کہہ جاتے تھے غلام ہمدانی مصحفیؔ کے بیان کے مطابق ان کا ایک مختصر دیوان بھی تھا لکھتے ہیں:

''گاہ گاہی بمقتضائے موزونئ طبع اشہب خیال رادر میدان شعر فارسی جولاں میدھد دیوانی مختصر دارد ... (۱)

ارشدؔ کے تاریخ تولد کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا، البتہ تاریخ وفات مصحفیؔ کے تذکرے میں ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء درج ہے۔ اس سے اس بات کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے طویل عمر پا کر انتقال کیا اور نواب آصف الدولہ سے لے کر سعادت علی خاں کے عہد تک زندہ رہے۔

ان کے کلام کے چند نمونے پیش ہیں ملاحظہ ہوں:

چو خواندم نالہ اش بے اختیار از دیدہ آب آمد
جو اب نامۂ من آمد و لیکن جواب آمد

در سینۂ من جز غم دلخواہ نماندہ است
او می طلبد دل بجگر آہ نماندہ است

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۳۱

ارشد چہ فتادی تو بدنبال نکویاں
آں قوت وآں طاقت آہ ماہ نماندہ است

چیں برجبین رسیدۂ ودامن کشیدہ رفت
صبح امید از درد باھم دمیدہ است

زدور دید مرا وبرخ نقاب گرفت
حذر کنید کہ امروز آفتاب گرفت

درقتل من بیدل ،تدبیر نمی باید
خود کشتۂ الفت را شمشیر نمی باید

ایک اورغزل کے چنداشعار:

از کوی اوبسوی چمن گر صبا رود
دیگر بسوئے گل دل بلبل کجا رود

بر دیگراں ترحم ولطف ونوازش است
برمن اگررود ھمۂ جو رو جفا رود

گفتی بروز کوی من انصاف خود بدہ
کین پا شکستہ از در دولت کجا رود

گرفتۂ آئینہ دردست بیقرار خوداست
بہ کسی نہ می گردد والۂ بہار خوداست

نگاہ بررخ اوکردم وز خود رفتم
زخویش رفتہ دل من درانتظار خوداست

مکن زجرم ملامت محبت ارشد را
تو دیدۂ کہ دل کس دراختیار خوداست

رباعی کے دونمونے ملاحظہ ہوں:

بامن اگر یار سرے داشتی
ازدل من جزے داشتی

نالۂ جان سوز مرامی شنید
چشم ترم گر اثر داشتی

بہ ناز طبیب احتیاجی نماندہ
کنوں درد مارا علاجی نماندہ

بہ کشت امید اوفتادہ است برقی
دگر فکر باج و خراجی نمانده(۱)

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۳۲

۲۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی

میر غلام علی نام اور تخلص آزاد تھا۔ اپنے نام کے ساتھ بلگرامی لگانا پسند کرتے تھے، کیونکہ ان کا تعلق اودھ کے مشہور اور مردم خیز قصبہ بلگرام سے تھا۔ ان کی پیدائش ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ / ۱۶۹۶ء میں بلگرام کے محلّہ میدان پورہ میں ہوئی۔ (۱) سلسلۂ نسب کے بارے میں ''نقش علی'' لکھتے ہیں:

''خلف الصدق سید محمد نوح بلگرامی نوادہ فاضل گرامی میر عبد الجلیل بلگرامی از سادات زیدی حسینی واولاد ابو الفرج واسطیست آخر ھا نسبتش بعیسٰی ابن زید رضی اللہ عنہ کہ ملقب بموتم الاشبال بودمی پیوندد'' (۲)

خود آزاد کہتے ہیں:

گر چہ یاشد موتم الاشبال عیسٰی جد من عیسٰی جاں بخش شیرانم بامداد نفس (۳)

آزاد نے اس عہد کے پانچ بلند پایہ استادوں سے کسب علم کیا۔ ان کے استادوں میں میر طفیل محمد تھے جن سے آزاد نے کتب درسی کی تعلیم حاصل کی۔ دیگر اساتذۂ گرامی میں اپنے نانا میر عبد الجلیل بلگرامی سے فنون ادب اور حدیث و سیرت، سید میر محمد سے عروض وقوافی، شیخ محمد حیات سے صحاح ستہ اور شیخ عبد الوہاب طبطاوی سے مکہ معظمہ میں علم حدیث کی تحصیل کی اور انھیں کے توسط سے سید لطف اللہ بلگرامی طاب ثراہ کی بیعت میں داخل ہوئے۔

آزاد نے اپنی زندگی میں تین اہم سفر کئے۔ ان کا پہلا سفر دہلی کا تھا، جہاں آزاد ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ ان کا یہ سفر ۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء میں میر عظمت اللہ بلگرامی کے ساتھ ہوا تھا۔ دوسرا سفر ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء میں بلگرام سے دہلی ملتان، لاہور، اوچ اور بھکّر ہوتے ہوئے سندھ پہنچے جہاں ان کے ماموں میر سید محمد

---

(۱) بلگرام کے فارسی شعراء: ص ۹۲

(۲) باغ معانی: ص ص ۱۸۔۱۹

(۳) خزانۂ عامرہ: ص ص ۱۲۳۔۱۲۴

بادشاہ دہلی کی طرف سے میر بخشی و وقائع نگاری کے عہدے پر فائز تھے۔ آزاد اپنے ماموں کے عہدہ پر بحیثیت نائب کے چار سال تک اقامت پذیر رہے اور اس کے بعد دہلی، الہ آباد ہوتے ہوئے بلگرام واپس آ گئے۔

آزاد کا تیسرا اور اہم سفر مکہ معظمہ کا تھا۔ لہذا ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء کو بیت اللہ شریف پہنچے، اور حج کا فریضہ ادا کیا۔ واپسی پر ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں آزاد دکن کی طرف روانہ ہوئے اور اورنگ آباد میں گوشہ نشین ہو گئے۔ شبلی کے بیان کے مطابق ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۰ء میں آزاد نے بمقام اورنگ آباد رحلت کی۔ (۱)

آزاد کا شمار ہندوستان کے ممتاز اور باکمال فارسی شعراء اور تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے انہیں زبان پر قدرت کمال حاصل تھا ایک بے مثال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تاریخ گو بھی تھے شاعری انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی فارسی اور عربی کے ممتاز عالم اور شاعر تھے اور ماموں میر محمد بھی فارسی کے شاعر تھے لہذا آزاد کی تعلیم و تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی نہ صرف فارسی بلکہ عربی اور اردو میں بھی مشق سخن کرتے تھے۔

آزاد نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ شعر و شاعری اور تاریخ گوئی میں گزارا۔ وہ ایک بلند پایہ نثار بھی تھے، انکے مشہور فارسی تذکروں میں ید بیضا، خزانۂ عامرہ، مآثر الکرام اور سرو آزاد ہیں۔

فارسی شاعری میں آزاد نے اپنے زور قلم کی بنیاد پر ایک ضخیم دیوان مرتب کیا جو تقریباً پانچ ہزار ابیات پر محیط ہے۔ (۲)

شعر و شاعری سے متعلق آزاد کی خط و کتابت ہمیشہ آرزو سے رہی۔ ان دونوں سخنوروں میں فارسی اشعار کے تبادلے ہوتے۔ ایک دوسرے کی سنتے، سناتے۔ آرزو نے تذکرہ مجمع النفائس میں

---

(۱) مقالات شبلی (جلد پنجم)، ص ۱۲۴

(۲) ''دیوان آزاد'' کا ایک خطی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے اور اسی دیوان کا دوسرا خطی نسخہ کتاب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۵۵۲ ہے۔ دیوان کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

برآرا زید بسم اللہ تیغ خوش مقالی را
مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

دیوان کے علاوہ فارسی اشعار کی ایک بیاض بھی یہاں موجود ہے جس میں ۳۲۱ صفحات ہیں۔

دو جگہ آزاد کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح آزاد نے بھی اپنے تذکرہ ''خزانۂ عامرہ'' اور ''سرو آزاد'' میں آرزو کا حال لکھا ہے، آرزو لکھتے ہیں:

''مردی فاضل و عالم، بزیارت بیت اللہ فایز گردیدہ از چندگاہ در اورنگ آباد فروکش کردہ۔ صوبہ داران دکن خیلی در تعظیم وتوقیر او میکوشند وسعادت دارین حاصل مینمایند۔ با فقیر آرزو اخلاص غایبانہ دارد۔ سابق از کمال شوق ہندوی جوانی فرستادہ وطلب اشعار واحوال فقیر نمودہ یک دوغزل فارسی و یک قصیدۂ عربی در کمال فصاحت و بلاغت فرستادہ بود'' (۱)

آرزو اور آزاد کے درمیان خط و کتابت میں پیش قدمی آزاد ہی کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔

الٰہی نالۂ گرمی دل دیوانۂ مارا　　کرامت کن نہال آتشینی دانۂ مارا

تو آن رساند ببالین حضرت صیاد　　زمرغ بسمل او مشت بال و پر باقی است (۲)

عبدالغنی خاں آزاد کے متعلق لکھتے ہیں:

''در انشاء شعر عربی و فارسی ید طولیٰ داشت'' (۳)

آزاد کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں:

سخن روشن گر آئینہ جان است در واقع　　چراغ مشہد طوطی نوایان است در واقع
نظر کن صبح نو روزی کہ افتد روز عاشورا　　نشاط وغم بہم دست وگریباں است در واقع

دل از خیال مہوشان یک شہر سامان در بغل　　این شیشہ باشد دیدنی دارد حریفان در بغل
روز قیامت ہر کسی در دست گیر نامۂ　　من نیز حاضر می شوم تصویر جانان در بغل

دست و پا گم کردہ ھمچوں کاروان سبحہ ایم
ھر قدم در رہ بزور سینہ می غلطیم ما

---

(۱) تذکرہ مجمع النفائس: ص ۱۵

(۲) خزانۂ عامرہ: ۱۲۶

(۳) تذکرۃ الشعراء: ص ۲

چو مژگان بتان خوش شیوۂ رندانہ دارم
کہ در محراب طاعت گوشہ میخانہ دارم

چو خورشید قیامت از گریباں سر برون آرد
کف محتاج گردد سایبان بر سر گریبان را

تحفہ ٔ شائستہ احباب از اقلیم فقر
گر نہ این دست دعا بودی چہ بر میداشتم

از حرم آورد سوی دید ہندوستان مرا — کژدم چشم سیاہت کرد سر گردان مرا
زذوق بانگ الستند عارفان دروجد — سخن تمام شد و لذت سخن باقیست

دردمندان را دوا کردن بہشت دیگر است
خار از پای بر آوردن گل بیخار ماست(۱)

رباعی کے دو نمونے ملاحظہ ہوں:

ای گل ہر چند خالی از رنگ نہ — ایٔ خر تو ہماں غنچۂ دل تنگ نہ
ای شیشہ مزن لاف نزاکت امروز — انصاف کن آخر تو ہماں سنگ نہ(۲)
ان شاہ کہ با رسول یکتا گردید — بردوش شریف جلوہ پیرا گردید
درگلشن دین زبسکہ جوشید بہار — نخل قد احمدی دو بالا گردید(۳)

---

(۱) سرو آزاد: ص ۲۹۲
(۲) سفینۂ خوشگو: ص ۲۶۹
(۳) سفینۂ ہندی: ص ۱۵

۳۔شاہ فصیح افصحؔ

شاہ فصیح نام اور تخلص افصح تھا۔ان کے آباواجداد بخارا(۱) کے رہنے والے تھے۔بعد میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے۔شاہ افصح کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تاریخ پیدائش کا ذکر تذکروں میں مفقود ہے۔ابتداء میں ان کا قیام دہلی میں رہا۔بچپن سے لے کر نوجوانی کا عرصہ انھوں نے یہیں گزارا۔شروع میں چند سال فوج میں ملازم رہے۔اس کے بعد انھوں نے عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر درویشانہ زندگی اختیار کی اور دہلی سے لکھنؤ کی جانب مراجعت کی۔

افصحؔ کی بزرگی اور نفس کشی کا ذکر بیشتر تذکروں میں ملتا ہے۔ہندیؔ لکھتے ہیں:

''لکھنؤ آمدہ تکیہ ساخت،بسیار مرد بزرگ بود و بتجرد می گزرانید،راقم بااوملاقات کردہ،درمحبت ائمہ اظہار راسخ دم بودہ است وثابت قدم''(۲)

لکھنؤ میں جہاں افصحؔ کا قیام تھا وہاں انہوں نے ایک تکیہ بنالیا تھا اس طرح بقیہ تمام عمر اسی تکیہ میں درویشوں کی طرح گزار کر ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں انتقال کیا۔(۳)

فارسی اشعار اچھے کہہ لیتے تھے اگرچہ کم کہتے تھے۔تذکروں کے مطابق انہوں نے ایک فارسی دیوان چھوڑا ہے(۴) شاعری میں مرزا بیدلؔ سے اصلاح لیتے تھے۔صاحب ''شعرای اردو'' ان کے متعلق کچھ اس طرح گویا ہیں:

''شاہ فصیح مرزا بیدل کے مرید سے ہے یہ شخص بہت دیندار نیک کردار تھا اس کا ایک تکیہ لکھنؤ میں بنام تکیہ فصیح مشہور ہے۔اس کی دینداری میں کوئی شک نہیں ••• اس کے

---

(۱) سفینۂ ہندی:ص ۱۷

(۲) ایضاً،۱۸

(۳) سخن شعراء:۴۰ویادگار شعراء:ص ۲۶

(۴) گلشن ہند:۲۷

اشعار صفحہ روزگار پر بہت یادگار ہیں''(۱)

تذکرہ گلشن سخن کے مطابق:

''شاہ فصیح از تلامذۂ مرزا بیدل بود، عمر درازی یافت، در لکھنؤ متوکلانہ می گزرانید، شعر فارسی و ریختہ ھر دو می گفت''(۲)

ان کا ایک شعر ہے:

لالہ سان ساغر داغ از غم یاری نزدیم
می خونا بہ دل آبلہ داری نزدیم (۳)

---

(۱) شعرای اردو: ص ۱۰۳

(۲) گلشن سخن: ص ۵۸

(۳) سفینۂ ہندی، ص ۱۸

۴۔انشاءاللہ خاں انشاؔ

انشاءاللہ خاں نام اور تخلص انشاؔ تھا۔ والد کا نام میر ماشاءاللہ خاں مصدرؔ تھا۔ انشاؔ کے بزرگوں کا اصلی وطن نجف اشرف تھا آزادؔ نے ''آب حیات'' میں لکھا ہے:

بعض کہتے ہیں کہ خطۂ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے ہیں، وہ کسی زمانے میں سمرقند سے آئے تھے''(۱)

تذکرہ ''گلشن ہمیشہ بہار'' میں ہے:

''مولد بزلاگانش خطۂ کشمیر ونژادش از مرشد آباد است''(۲)

انشاء کے دادا کا نام حکیم سید نوراللہ تھا۔(۳) انکی پیدائش ہندوستان میں ہوئی لیکن اس وقت ہندوستان میں انکا قیام عارضی تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے دوسری بار سید نوراللہ ۱۱۲۷ھ / ۱۷۱۵ء کے قریب فرخ سیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور دلی میں قیام کیا اس وقت ان کے لڑکے میر ماشاءاللہ خاں ان کے ہمراہ تھے۔ میر ماشاءاللہ کا شمار اپنے زمانے کے مشہور شعراء میں تھا۔ یہ ایک ماہر طبیب تھے۔ دہلی میں جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی تو میر ماشاءاللہ مصدرؔ مرشد آباد چلے گئے، انشاؔ کی ولادت وہیں ہوئی۔ لیکن انکی تاریخ پیدائش کے باب میں تذکرے خاموش ہیں۔ میر قدرت اللہ قاسمؔ لکھتے ہیں:

''در ایام حکومت سراج الدولہ وغیرہ حکام بنگالہ ھیزدہ زنجیر فیل بہ فیل خانہ میر ماشاءاللہ بود۔ تولد میر انشاء اللہ خاں سلمہ الرحمٰن در ھماں آوان بہ مرشد آباد اتفاق افتاد''(۴)

---

(۱) آب حیات:، ص ۲۶۵

(۲) گلشن ہمیشہ بہار، ص ۷۵

(۳) دیوان ہدا: ص ا

(۴) مجموعۂ نغز (جلد اول): ص ۸۱

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''سراج الدولہ کا زمانہ ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء تا ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء کا ہے۔ قریب قریب اسی زمانہ میں انشاء کی ولادت ہوئی ہوگی۔(۱)

انشاؔء اپنے مولد کے اعتبار سے مرشد آباد (بنگال) کے ہیں لیکن انکی اصل تعلیم وتربیت فیض آباد (اودھ) میں ہوئی اور یہیں سے ان کی شعروشاعری کی ابتداء ہوئی۔

انشاء کا خاندانی پیشہ طبابت کا تھا۔ اس طرح علم طب اور منطق انہیں وراثت میں ملی، لیکن سپہ گری، زبان دانی اور شعر گوئی کے فن پر بھی بہت جلد انھوں نے قدرت حاصل کی۔ سپاہیانہ زندگی کے طفیل چند سال فرخ آباد (بندیل کھنڈ) وغیرہ میں گزرے لیکن عمر کا بیشتر حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں گزارا۔ فیض آباد میں اس وقت نواب شجاع الدولہ تخت سلطنت پر متمکن تھے۔ انشاء کی مذکورہ گوناگوں صفات کی بناء پر نواب نے انہیں بہت جلد اپنے مقربین میں جگہ دی۔

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد تقریباً چھ سال لکھنؤ میں آصف الدولہ سے منسلک رہے ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء کے قریب دہلی آ گئے۔ دہلی کی حالت بھی اس وقت کچھ اچھی نہ تھی۔ دو سال گزار کر بندیل کھنڈ کی طرف چلے گئے۔ جہاں راجپوتانہ جھگڑوں اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ یہاں بھی گزرا۔ اس کے بعد انشاؔء مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے اور کم وبیش تیس (۳۰) سال قیام کے بعد پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں وہیں وفات پائی۔

انشاؔء فطرتاً زندہ دل اور شوخ طبع تھے۔ ان کے عہد میں فیض آباد اور لکھنؤ، نوابین اودھ کی سرپرستی میں علم وفضل کے گہوارے اور شعروادب کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ انشاؔء کی شاعری کے لئے یہ فضا خاصی سازگار ثابت ہوئی۔ وہ خود ہی آزاد طبیعت کے مالک تھے لہذا ہمیشہ بے فکر اور خوشحال زندگی گزاری۔ انھوں نے اودھ کے تین نوابوں کے عہد دیکھے۔ نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں ان میں بیشتر وقت نواب سعادت علی خاں کے دربار میں گزارا۔ ان کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے بیانات حسب ذیل ہیں:

---

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری: ص ۱۷۰۔۱۷۱

''مسکن لکھنؤ وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں بہادر کے مقربوں میں تھے بہت سی زبانوں سے واقف تھے اور بہت سے فنون میں دخل رکھتے تھے'' (۱)

شیفتہ لکھتے ہیں:

''نجفی الاصل تھے مرشد آباد میں متولد ہوئے وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں بہادر کے مقربین میں سے تھے، رسمی فنون میں تھوڑی بہت دستگاہ رکھتے تھے لیکن ہر فن میں یکتائی کا ڈنکا پیٹتے تھے امر و کنایہ سے اپنے ہم عصروں کا قافیہ تنگ کرتے تھے'' (۲)

تذکرۂ ہندی سے ایک مختصر عبارت:

''تحصیل کتب عربیہ وفارسیہ وطب بقدر حال ہمہ دارد'' (۳)

شوق رامپوری نے بھی اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں، لکھتے ہیں:

''درفنون عربی وفارسی وہندی مہارت تمام دارد'' (۴)

مصحفی لکھتے ہیں کہ انشاء کو ابتداء سے ہی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی:

''از ابتدائے عمر بحکم موزونی طبع شعر در ہر سہ زبان می گوید'' (۵)

غرض کہ ان کی کثرت زبان دانی کا اعتراف سبھی مقتدر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے۔

قدرت اللہ قاسم ان کی فارسی شعر گوئی کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

''شعر فارسی ہم میگوئد والفاظ عربی فراہم آوردہ موزوں میتواند کرد'' (۶)

انشاء عربی، فارسی کے علاوہ ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، مارواڑی، مراٹھی، کشمیری اور ہندی یہ سبھی زبانیں جانتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے دربار سے وابستگی سے پہلے انشاء لکھنؤ میں شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت میں رہے وہ شہزادے کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔

---

(۱) سخن شعرا: ص ۵۲

(۲) گلشن بے خار: ص ۳۳

(۳) تذکرہ ہندی: ص ۳۳

(۴) تکملۃ الشعراء: ص ۴۱

(۵) تذکرہ ہندی: ص ۳۳

(۶) مجموعۂ نغز (جلد اول): ص ۸۱

''درزمان سابق برفاقت میرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ بسر می برد، بعدازاں بملازمت نواب سعادت علی خاں وزیرالممالک ہندوستان شرف انسلاک یافت چوں درلطیفہ گوئی و بذلہ سنجی یگانۂ زماں و نادرۂ دوراں بود، نواب اورا بجاں دوست داشتی و یاران صحبت او مغتنم می پنداشتند ۔۔۔ ''(۱)

انشاؔء فارسی زبان کے شاعر تھے۔ اس کے علاوہ اردو اور عربی زبانوں میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ دواوین میں دوسری زبانوں کے علاوہ ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔

انشاؔء کی فارسی شاعری میں ان کے قصائد بہت مشہور ہوئے۔ ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں یہ قصیدہ انھوں نے الماس علی خاں (۲) کی مدح میں کہا تھا۔

اندریں عصر اگر حضرت لقمان باشد — بہر یک لقمۂ ناں تابع دوناں باشد
بدل ما تحلل چو رسد قرص جویں — آہ ازاں شخص کہ از اہل صفاہاں باشد
وقت آنست کہ از گرسنگی جاں بدھد — بادشہ زادہ کز اولاد تمر خاں باشد
شکر اللہ کہ دریں معرکۂ بعث ونشور — کاندراں بوعلی وقت ہراساں باشد
دست ہمچو من ناکارہ بگیرد شخصے — کہ مجسم ہمہ چوں ابر بہاراں باشد
عزت و حرمت انواع تفضّل بکند — وزپئے پرورشم برزدہ، داماں باشد

انشاؔء کی شاعری کا دور بارہویں صدی ہجری کے اواخر اور تیرہویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ دہلی کی بساط سخن اجڑ چکی تھی اور اودھ میں شعروشاعری کی ایک نئی بساط بچھ رہی تھی۔ اس عہد میں فارسی زبان اگرچہ زوال پذیر تھی تاہم اردو شعراء فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہی حال کم وبیش نثر کا بھی تھا یعنی مواد اور مضامین اردو کے اور زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں خود انشاؔء کی تصنیف ''دریائے لطافت'' (۳) ایک مثال ہے۔

انشاؔء کے فارسی سرمایہ میں بیشتر غزلیں ہیں یہ غزلیں زیادہ تر روایتی انداز کی ہیں۔ بیان میں شوخی

---

(۱) آفتاب عالم تاب: ص ۱۹

(۲) الماس علی خاں بہو بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ کے خواجہ سرا تھے۔

(۳) تفصیلات باب پنجم میں ملاحظہ ہو۔

اور رنگینی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صد ھزار ان عقد ھا بکشودہ است　　عشق بازی طرفہ چیزی بودہ است
بسکہ در دشت تمنا گشتہ ام　　پایم از طیٔ مراحل سودہ است
مرد باش آشنای درد باش　　سید انشاء این چنین فرمودہ است(۱)

محبوب کے رنگ حنائی کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتے ہی:

بہ پیش رنگ حنائی تو ای گل رعنا
چمن بہ بسمل در خون طپیدہ می ماند

چھوٹی بحروں کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، اس میں محبوب کی جدائی کا اظہار انشاؔء نے کس سادگی اور خوبصورتی سے کیا ہے:

با للہ کہ سخت بیقرارم　　امروز ترا نمی گذارم
تا چند کشیم از تغافل　　من ھم آخر امید وارم
یاور اگرت نباشد اینک　　چنگی زنم و برونش آرم
انشاء اللہ نامم انشاؔء　　گرھست ترابدست آرم(۲)

دوسرے نامور شعرا کی طرح انشاؔء کا فارسی دیوان الگ سے شائع نہیں ہوا بلکہ ''کلیات انشاؔء'' میں شامل ہے(۳) دیوان فارسی میں سب سے پہلے ایک حمد ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

---

(۱) کلیات انشاء

(۲) ایضاً

(۳) ''کلیات انشاء'' میں سارا اردو اور فارسی کلام یکجا تئیس سطری چار سو پچاس صفحات پر مشتمل مطبع نول کشور لکھنؤ سے دسمبر ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں شروع کے دو سو بہتر صفحات اردو کلام کے ہیں اور باقی صفحات (۱۷۸) پر فارسی کلام ہے۔ اس کا قلمی نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور پٹنہ میں ہے (بحوالہ فہرس اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ: جلد اول شمار ۱۹۳۸ و شمار ۱۹۴۱ء)

ای عشق قطع کردہ رہ سلسبیل را　　ازماسلام شوق رسان جبرئیل را
پیوستہ آھوان حرم یاد می کنند　　آن اولین زمان بنای خلیل را
درراہ عشق ھم سفران وجد می کنند　　چو بشوند نعرہ ای کوس رحیل را
نازم بقدرت تو کہ حیران نمودہ است　　عقل و قیاس ووھم و خیال و دلیل را

حمد کے بعد امام علیہ السلام کی منقبت ہے اوراس کے بعد غزلیات ہیں۔ تین مثنویاں ''شیر برنج''، ''مثنوی بے نقط'' اور ''مثنوی شکارنامہ'' بھی شامل ہیں۔ مثنوی شکارنامہ نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پراورانھیں سے متعلق ہے۔ چنداشعار ملاحظہ ہوں:

تاکہ برد خیمۂ زریں طناب　　آمد دربرج حمل آفتاب
گشت زنقارہ صدای بلند　　زندہ بمان زندہ بمان بی گزند
وزدھل نقرہ بر آمد بجوش　　تا بتوان تا بتوان ھان خروش
حلت صید است در آئین من　　دین من و دین من ودین من
واشدہ زین سان دھن کرّنا　　بادیدہ با دیدہ مادعا
دشمن این خانہ جگر خون بود　　دُون بود و دُون بود و دُون بود

۵۔ موہن لعل انیسؔ

نام موہن لعل اور تخلص ''انیسؔ'' تھا۔ یہ کایستھ (۱) قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کنور سین خیرآباد کے مضافات میں گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ یہ ''تولا رام قانون گو'' کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں یہ لکھنؤ آ گئے اور یہیں مستقل قیام کیا۔

انیسؔ کی پیدائش لکھنؤ کی ہے۔ تاریخ تولد کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔ ابتدائی فارسی کی تعلیم کریم داد خاں رونقؔ سے حاصل کی۔ شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اشعار کہنے شروع کیے۔ شروع میں ''خستہؔ'' تخلص کرتے تھے۔ بعد میں بیتابؔ اور ایک عرصہ بعد ''انیسؔ'' تخلص اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں مرزا فاخر مکینؔ سے بھی کافی استفادہ کیا۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:

> ''استفادہ شعر از میرزا فاخر مکین کردہ ... بعد ترتیب دیوان، تذکرہ مسمیٰ بہ ''انیس الاحبا'' مشعر تلامذۂ مرزا صاحب موصوف نگاشتہ کلک تالیف اوست عمرش بہ ہفتاد رسیدہ ... قد مارا دوست میدارد و پیروی آنہا میکند می گوید کہ بخدمت شیخ ہم رسیدہ ام و نور العین واقفؔ و میر شمس الدین فقیرؔ را مکرر در لکھنؤ دیدہ ام و بہ ایشان ہم طرح بودہ ام'' (۲)

مؤلف ''سفینۂ ہندی'' کے مطابق یہ صاحب دیوان ہیں (۳) ان کے اشعار میں تازہ مضامین نظر آتے ہیں۔ مناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ کلام بھی بے حد مربوط ہے۔ چند اشعار (۴) ملاحظہ ہوں:

بشوکتی کہ توئی ہیچ بادشاھی نیست — کہ شاہ را بگدای در تو راھی نیست
دلا منال کہ صحرای عشق صحرائیست — کہ غیر سبزہ حسرت درو گیاھی نیست

---

(۱) عقد ثریا، ص ۱۲

(۲) ریاض الفصحاء، ص ۳۰

(۳) سفینۂ ہندی: ص ۱۷

(۴) ریاض الفصحاء: ۳۰

خدای راز درخود مران که درد و جهان
انیسؔ را بجز آن استان پناهی نیست

گاهی تو نگاهی به من از ناز نه کردی
کردی اگر ای مه به غلط باز نه کردی

بسمل شوق توام زود بیا بسم الله
تیغ بردار و بکش دیر چرا بسم الله

گر باد سحر بودی ترا یک سحر آرد
درجان من و شده جان دگر آرد
پهلوی انیست نه انیسی نه حلیمی
بیچاره چساں این شب هجران بسر آرد

غنچه دهنها سرو قد تازه بهارا
کن خنده بخنداں دل چوں غنچهٔ مارا
گویند بدیں دیده خدارانه تواں دید
دید انکه ترا دید بدیں دیده خدارا

عکس رویت شب مهتاب چودرآب افتاد
تب و تابی عجبی دردل بیتاب افتاد
صبح برخاسته ای ماه نشستی لب بام
لرزه از بیم بخورشید جهانتاب افتاد
دیده افگند چو برناف تو اے بحر جمال
کشتی صبر دل خسته به گرداب افتاد
کرد بیتاب بتاب دگری جان مرا
تابهائے که دراں طرهٔ پرتاب افتاد
دیده تا جلوه سیمائ ساقین ترا
اضطرابی بدل سیم چو سیماب افتاد

توئی که هر دو جهاں رابه نیم تاز کشی
بعشوه زنده نمائی بغمزه باز کشی
چو تیغ نمازکشی صد هزار مومن را
چه کافری تو که در خواندن نماز کشی
مترس انیس زکشتن چو عشقبازی تو
که هست شیوهٔ معشوق عشقباز کشی

دوش دل در انتظارت گوش برآواز ماند　　چشم بردر تا سحر چوں حلقۂ درباز ماند
دید تا انداز و نازت را بآن انداز وناز　　ناز از ناز خود وانداز از انداز ماند
پیش اعجاز دم جاں بخش تو دم زد مسیح　　دم فروبست آندم و اعجازش از اعجاز ماند
صبح خورشید رخت چوں جلوہ کرد از روزنی　　در ھوایش ذرہ ساں خورشید در پرواز ماند
رفت چوں جولاں کناں صیدافگنان ناوک زناں　　حسرت تیرے مرازان ترک تیرانداز ماند(۱)

تذکرہ ''ریاض العارفین'' میں انیسؔ کے تین اشعار ملتے ہیں۔

ازروی خویش پردہ بہ یک بار وا مگیر
چون آمدی زخویش مرابی خبر مکن
دیدی انیسؔ از رخش آخر ،دوصد بلا
صد بار گفتمت : کہ بہ رویش نظر مکن
چشم من سوئے تو باشد،چشم تو،سوی دگر
من بہ رویت بنگرم، تو بنگری روی دگر (۲)

---

(۱) ریاض الفصحاء:ص ۳۰

(۲) تذکرۂ ریاض العارفین (جلد اول):ص ۸۵

۶۔ جسونت سنگھ پروانہ

نام جسونت سنگھ اور پروانہ تخلص تھا۔ یہ کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے والد راجہ بنی بہادر نواب شجاع الدولہ کے نائب تھے۔ ۷۸۔۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۴ء میں بکسر کی مشہور جنگ میں یہ شریک تھے۔ جسونت سنگھ کے سنہ پیدائش کا تذکرہ نویسوں نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی تمام زندگی لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں گزری یہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے دیوان اور لکھنؤ ضلع میں منڈیاؤں ومہونہ کے جاگیردار بھی تھے۔ یہ ''کاکا جی'' کے نام سے لکھنؤ میں بہت مشہور ہوئے۔ پروانہ کو شعروشاعری سے بڑا لگاؤ تھا فارسی کتابوں سے تحصیل علم کیا۔ اساتذہ کے دیوان کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شعروشاعری کا آغاز انھوں نے پہلے فارسی زبان میں کیا اور بعد میں اردو میں بھی کہنے لگے۔ فارسی کلام سرب سنگھ دیوانہ کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے، انھیں اپنا استاد سمجھتے تھے۔ شعرگوئی کی قوت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ فارسی اور اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ''پروانہ'' کے بارے میں لکھا ہے۔

مصحفی: ''جوان خلیق وذی شعور است پیش ازیں شعر فارسی میگفت واز نظر رائے سرب سنگھ دیوانہ می گزرانید ...'' (۱)

قاسم: ''وے مرد یست خلیق نیکو شمائل کشادہ رو فرخندہ خصائل خوش گفتار نیک کردار در فارسی گوئی شاگرد سرپ سنگھ دیوانہ است ...'' (۲)

''یکتا'' نے انھیں صاحب دیوان لکھا ہے اور ان کی خوبیوں کی صراحت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''حق این است کہ کمال خوب گفتہ ونہایت داد شاعری دادہ تلاش بسیار نمودہ معنی بیگانہ بے شمار پیدا کردہ از شعرائے حال کسی ہمتر ازوی وہم قوت او نیست'' (۳)

---

(۱) تذکرۂ ہندی: ص ۵۴

(۲) مجموعۂ نغز (جلد ۱): ص ۱۰۳

(۳) دستور الفصاحت ص ۲۱۱

خویشگی کے الفاظ میں:

''کنور جسونت سنگھ ابن راجہ بنی بہادر است ارتفاع مدارج در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر می داشت وعلم اعزار وافتخار بحضور نواب ممدوح می افراشت ۔گویند کہ جوانی بود و خوش طبع موزوں بیان و پری پیکر و نازنین زمان نجستہ خصال وحور جمال بودہ از خیالات نازک اوست ۔۔۔ ''(۱)

بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں میر حسن و مصحفی کا شاگرد بھی لکھا ہے اور بعض تذکروں نے ان کے تعلقات کو صرف دوستی کا نام دیا ہے جو کہ کسی حد تک قابل قبول ہے۔ ''مجموعہ نغز'' نے میر تقی میر سے شرف تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال اتنا ضرور سچ ہے کہ پروانہ ان تمام شعراء کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے۔ فارسی زبان سے دلچسپی تھی اس ضمن میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ شیخ علی حزیں کی ملاقات کے لئے پروانہ گئے۔ شیخ نے نازک دماغی کے ساتھ کہلا بھیجا کہ:

دریں بزم رہ نیست بیگانہ را

پروانہ نے فوراً جواب دیا کہ:

''پروانگی داد پروانہ را''

حزیں اس لطیفہ فی البدیہہ سے بہت محظوظ ہوئے اور پروانہ کو بلا کر ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔(۲) پروانہ کا فارسی کلام تقریباً دو ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ ان کے فارسی کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے مصحفی لکھتے ہیں:

دیوان فارسی قریب دوھزار بیت بر بیاض دیدہ شد زبانش عاشقانہ شستہ ورفتہ است''(۳)

ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو:

ما بمعنی بت پرستی می کنم
گرچہ در صورت مسلمانیم ما

---

(۱) گل ہمیشہ بہار: ص ۸۳۔۸۴

(۲) تذکرہ بہار سخن: ص ۸۹

(۳) عقد ثریا: ص ۱۶

پروانہ کے کلام کی امتیازی خصوصیت عاشقانہ جذبات کی عکاسی ہے، ان کی غزلیں پختہ و پر اثر ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بگو حاجب بآن شمع دل افروز — کہ امشب عاشقان را حکم یاراست

بی لعل لبت غنچہ دل و انتوان کرد — جان را زپیام تو شکیبا نتوان کرد
وصل تو زہجر است برتر زعذابم — این طرفہ کہ جز وصل تمنا نتوان کرد(۱)

پروانہ کا سنہ وفات ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء ہے(۲)

---

(۱) تذکرہ روز روشن: ص ۱۲۰

(۲) تذکرہ شعرائے ہنود: ص ۳۶۰

۷۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر

شاہ تراب علی قلندر ابن شاہ محمد کاظم قلندر کی پیدائش ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۸ء میں کاکوروی میں ہوئی۔(۱) تعلیم وتربیت والد محترم کے علاوہ ملا قدرت اللہ بلگرامی، مولوی معین الدین بنگالی، مولانا حمید الدین محدث کاکوروی، قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں بہادر ثاقب کاکوروی اور مولانا فضل اللہ ساکن نیوتنی سے پائی۔(۲)

شاہ تراب بیک وقت شاعر کے ساتھ ساتھ صوفی، عالم اور ادیب بھی تھے۔ ان کی فارسی تصنیفات میں اصول المقصود (۳)، اسناد المشخصیت (۴)، تعلیم الاسماء (۵)، شرائط الوسائط شجرات سلسلہ ثمانیہ، فتح الکنوز، کشتی التواری، مطالب رشیدی، مجاہدات الاولیاء، مقالات الصوفیہ اور مکتوبات شاہ مجا قلندر بڑی اہم ہیں۔

باوصف عالم دین اور صوفی ہونے کے شعروشاعری کا ذوق بھی آپ میں کم نہ تھا۔ آپ نہ صرف فارسی بلکہ اردو اور ہندی کے بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔۔ فارسی میں پہلے ''شہید'' تخلص کرتے تھے بعد میں ''تراب'' لکھنے لگے۔

شاہ تراب کی زندگی اور ان کی شاعری تصوف کی آغوش کی پروردہ ہے۔ انکی غزلوں میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ محبوب کے ظاہری حسن کے دلدادہ نہیں بلکہ ان کے یہاں داخلی حسن کا تصور ملتا ہے۔ بعض غزلوں میں حافظ شیرازی اور مولانا روم کا رنگ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ بریں غزلیں شعرائے متقدمین کی زمینوں میں کہی ہیں۔ دیوان میں غزلوں کی تعداد دو سو گیارہ ہے۔ جس میں

---

(۱) سخن وران کاکوروی: ص ۱۳۵

(۲) نزہۃ الخواطر، جلد ۷: ص ۱۰۲

(۳) سنہ تالیف ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء جو ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں منشی امتیاز علی کے اہتمام سے آس پریس لکھنؤ میں چھپی۔

(۴) فن تصوف سے متعلق ۱۵۱ صفحات پر مشتمل مخطوطہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ

(۵) اوراد واعمال وظائف کی تفصیلات پر مشتمل ۳۶۶ صفحات کا مخطوطہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ

تقریباً سولہ سو سے زاید اشعار ہیں۔ یہاں بطور مثال ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ غم خوارم نہ غم دارم، نہ دلدارم، نہ دل دارم
نہ درخیرم، نہ بی خیرم، زود کارم، نہ بی کارم
نہ مجبورم، نہ مختارم، نہ منصورم، نہ عطارم
نہ مخمورم، نہ سرشارم، نہ بیہوشم، نہ ھشیارم
نہ در شھرم، نہ ویرانہ، نہ در مسجد نہ بت خانہ
نہ در بزمم نہ کاشانہ، نہ در دارم نہ دیوارم
نہ شیرینم نہ فرھادم، نہ قمری ام زشمشادم
نہ پابندم نہ آزادم، نہ درد اے گرفتارم
تراب از خود ھمہ محوم، نہ درسکرم نہ درصحوم
نہ اھل منطق و لخوم نہ از علمائے اخیارم (۱)

اسی طرح چند دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں:

سنبل نہ پیچ وتاب ززلف سیاہ کیست
نرگس کشودہ چشم بہ شوق نگاہ کیست (۲)
دلاخود را بزلف مشک شامی مبتلا کردی
خطا کردی، خطا کردی، خطا کردی، خطا کردی (۳)
ھرزماں از جورو ظلم تازہ اش
بامن اورا امتحانی دیگراست (۴)

---

(۱) کلیات فارسی شاہ تراب علی قلندر، ص ۵۶
(۲) ایضاً، ص ۲۱
(۳) ایضاً، ص ۸۶
(۴) کلیات فارسی شاہ تراب علی قلندر، ص ۲۶

۱۲۷۵ھ/۱۸۶۰ء میں آپ نے وفات پائی عبدالستار کاکوروی نے تاریخ وفات کہی:

نہ رحلت کرد آں شیخ المشائخ　　جنید از دھر رفت و رفت شبلی

اگر خواھند تاریخ و صالش　　بگو سال وفاتش ذات قدس(۱)

۱۲۷۵

(۱) روض الازھر فی مأثر القلندر: ص ۶۵۵

۸۔ سید محمد اشرف حسرتؔ

سید محمد اشرف نام اور تخلص ''حسرت'' تھا۔ ان کا وطن لکھنؤ کے مضافات میں مشہور و معروف قصبہ سندیلہ ہے آپ مرزا بیدلؔ کے شاگردوں میں تھے۔ ''سفینۂ خوشگو'' نے انھیں فارسی کا صاحب دیوان شاعر گردانا ہے۔(۱) ان کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ ہندی لکھتے ہیں:

''در سپاھگری و دلاوری یکتا بودہ ۰۰۰ (۲)

نمونۂ کلام:

خون شود دستی کہ از درد ضعیفان خون نشد
بشکند رنگی کہ نتواند بروی ماشکست
چو نقش پاچہ امکانست پامال تو برخیزد
بذوق امتحان ای بیوفا از خاک برگیرش (۳)

ایک دفعہ جبکہ حسرتؔ پاؤں کے سخت درد میں مبتلا تھے چند اشعار اس وقت جو کہے وہ اس طرح ہیں:

چناں در راہ دیدار نگاری درد پادارم
کہ چشم دستگیری ھمچو نرگس از عصا دارم
توانی در کف آوردن کلید ملک گیری را
اگر چوں تیغ سازی جوھر ذاتی دلیری را

---

(۱) سفینۂ خوشگو: ۲۶۱

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۶۰

(۳) باغ معانی: ص ۸۰

چو بلبل از غزل خوانی بگلزاری وطن دارم
که کرم پیله اش داند مقامات حریری را
بی دستگیری آورد در روزگار مارا
دستی چوابله نبوددر کاروبار مارا
فرصت اگر دهد دست بندیم چوں خیالش
رنگین حکایتی هست با آن نگار مارا

افسوس کہ حسرت کے بارے میں ہمیں اطلاعات کم دستیاب ہیں ۔ تذکروں میں کہیں سال ولادت اور سال وفات نہیں ملتا۔

۹۔ بندرابن داس خوشگوؔ

بندرابن داس نام اور تخلص خوشگوؔ تھا ان کا تعلق موضوع بیسواڑہ کی راجپوت قوم سے تھا۔ سلسلہ نسب راجہ بکرماد یتہ سے ملتا ہے۔ نقش علی لکھتے ہیں:

''ازقوم بیس ست کہ فرقہ ایست از نجبای راجپوت ھنداز اولاد راجہ سالباھن کہ معاصر راجہ بکرماجیت راجہ مشہور ھندوستان بود'' (۱)

خوشگوؔ کی تاریخ پیدائش تذکروں میں درج نہیں ہے۔ ان کے والد شیورام داس حیاؔ (متوفی ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء) متھرا کے رہنے والے تھے۔ مغل بادشاہ اورنگزیب کے دربار سے وابستہ تھے اور فارسی کے صاحب کمال شاعر تھے۔ خوشگوؔ نے ابتدائی تعلیمات اپنے اساتذہ بیغمؔ بیراگی اور سدانند بی تکلفؔ سے حاصل کیں۔ اپنے استاد بی تکلفؔ کے بارے میں خوشگوؔ کا بیان ہے:

''بہ فقیر اول چاشنی تخمین معارف از صحبت وی حاصل شد'' (۲)

تلاش معاش کے سلسلہ میں خوشگوؔ کا کچھ وقت دہلی میں گزرا۔ اس کے بعد انھوں نے دنیاداری ترک کر کے فقیرانہ لباس اختیار کرلیا۔ اس کے بعد عمر کا بیشتر حصہ بنارس، الہ آباد اور عظیم آباد (پٹنہ) کے درمیان گزرا ''سفینۂ خوشگو'' کے مقدمہ میں عطا کاکوی کا صراحت کے ساتھ بیان ہے، ملاحظہ ہو:

''در ابتدا نوکر پیشہ بود۔ بعد ازاں مسلک فقیر گزیدہ در زمی فقرا آزادانہ می زیست وگاھی در بنارس، گاھی در الہ آباد وگاھی در عظیم آباد بسر می برد وآخر حال در عشرہ سابع بعد ماۃ والف در عظیم آباد جاں بہ جان آفریں سپرد'' (۳)

ان تمام حقائق اور مصروفیات سے قطع نظر خوشگوؔ کی زندگی کا ایک اہم پہلو شعر وشاعری سے متعلق

---

(۱) باغ معانی: ص ۵۹

(۲) سفینۂ خوشگو (مقدمہ)

(۳) سفینۂ خوشگو (مقدمہ)

بھی رہا ہے۔ان کا شمار فارسی کے اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ اگر چہ دیوان کا کوئی نسخہ اب کہیں نہیں ملتا۔عطاالرحمٰن کاکوی ''سفینۂ خوشگو'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''جز این سفینہ کہ در سہ دفتر است، دیگر ہیچ تصنیف خوشگو دستیاب نیست، دیوانش ہم یافتہ نمی شود'' (۱)

خوشگو نے اپنے زمانے کے مشہور شعراء سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ چودہ سال کی عمر سے اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے اور اس شعری سفر کے دوران مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا افضل سرخوشؔ، شیخ سعداللہ گلشنؔ اور سراج الدین علی خاں آرزوؔ کا بیان ہے:

''از مدت بست و پنج سال تخمیناً با این ہیچمدان ربط کلی بہم رسانیدہ و این عاجز ہم در تربیت او بہ تقصیر از خود راضی نشدہ و نیست از بسکہ اخلاص یا احقر دارد سجع نگین او این مصرع است:

''آرزو مند فضل او خوش گو'' (۲)

خوشگو کی تصانیف میں ان کا صرف ایک تذکرہ ملتا ہے، جو فارسی شعراء کے احوال و آثار پر مشتمل ہے اور تین دفتروں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول شعرائے متقدمین، حصہ دوم، شعرائے متوسطین اور حصہ سوم شعرائے معاصرین کی ایک بڑی تعداد پر محیط ہے۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ خوشگو نے اس میں اپنے احوال سے گریز کیا ہے۔جس کے باعث ان کی زندگی کے بیشتر حصے آج بھی پردۂ خفا میں ہیں۔

بہر حال ان کے اشعار نہایت عمدہ و فصیح ہیں۔ان کے استاد آرزوؔ نے انکی خوبی کو بخوبی سراہا ہے، لکھتے ہیں:

''شعر را بسیار خوب می گوید و بنفس نازکی مضمون بدست او افتادہ ... (۳)

صاحب تذکرہ ''روز روشن'' کا بیان ہے:

''از ماہران لب و لہجہ ارباب لسان است'' (۴)

مؤلف ''سفینۂ ہندی'' کے بیان کے مطابق خوشگو کا انتقال ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء میں عظیم آباد (پٹنہ)

---

(۱) سفینۂ خوشگو (مقدمہ)

(۲) مجمع النفائس: ۱۳۷

(۳) مجمع النفائس: ص ۱۳۷

(۴) تذکرۂ روز روشن: ص ۲۰۶

میں ہوا۔(۱) نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

بود زاندام کہ بسم اللہ گل دستار عنوانہا　　زبس شادی نگنجد غنچہ ساں در جلد دیوانہا

روز و شب رہ می روم اما ھمان سرگشتہ ام　　نقش پاں خورہ می اید بروں از رنگ آں لب ھا

دھلی خوش است لیک زیاراں چنیں خوش است　　یاراں چنیں خوش است و دیاراں چنیں خوش است

واعظ مطلب علم وادب ازمن بیخود　　من علم ندارم ز خود اللہ علیم است

ھر نفس می کرد صد احوال پرسی دلم　　غیر غم یادش بخوبی ھیچ غم خو ارم نبود

شیشۂ چند ازگلاب اشک دارم دربغل　　می برم تا شست و شوئی تربت مجنوں کنم

اپنے استاد سراج الدین علی خاں آرزو کے متعلق کہتے ہیں:

آرزو آں سراج دین علی　　کہ بہ طبعش بود ضیائی دگر

ھند از ذات او شدہ ایراں　　کرد مشمول لطفہائی دگر

نام از مقطعش جہاں گرد است　　قطع کردم کنوں زپائی دگر

آرزو رامحبت خوشگو　　باز دارد ز فکر ھائی دگر

آخری شعر آرزو کا ہے۔ جس پر خوشگو نے تضمین کی تھی۔ اس طرح اپنے استاد سعد اللہ گلشن کے بارے میں کہتے ہیں:

گلشن معنی جناب شیخ سعد اللہ ما　　قبلہ ما، پیرما، استاد ما و شاہ ما(۲)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۶۷

(۲) سفینۂ خوشگو (مقدمہ)

سرپ سکھ دیوانہ

سرپ سکھ نام اور دیوانہ تخلص تھا۔ بعض جگہوں پر "سرب سنگھ اور سرپ سنگھ" بھی لکھا گیا ہے۔ مثلاً

"سرپ سنگھ شمشیر زادہ راجہ مہانرائن ••• "(۱)

صحیح نام سرب سکھ ہے۔ مسرت افزا، سفینۂ عشرت، سفینۂ ہندی، گلشن ہند اور دوسرے تذکروں سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مصحفی کے دیوان قصاید (نسخۂ رامپور) میں ایک مصرعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ع

"وہی ہوں میں جسے دیوانہ سرب سکھ نام"

اس سلسلے میں "گلشن ہند" کے مؤلف "حیدر بخش حیدری" کی صراحت ہے کہ انھوں نے یورپ میں ایک قلمی کتاب پر انکی مہر ثبت دیکھی ہے جس پر "سرب سکھ" نقش تھا(۲)۔

دیوانہ راجہ مہانرائن مہندر بہادر کے بھانجے تھے جو کہ نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں دیوان تھے۔ دیوانہ کی پیدائش دہلی کی ہے۔ تذکرہ نویسوں کے یہاں سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ دہلی کے حالات بگڑنے کے بعد دیوانہ لکھنؤ آ گئے۔ یہاں جاگیر کے علاوہ عزت و شہرت سے ہمکنار ہوئے اکثر شعر و شاعری کی محفلیں منعقد کرتے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے رکھتے تھے۔ شروع میں اردو شاعری کی طرح توجہ تھی۔ کئی ایک شاگرد بھی ہوئے۔ اور اردو کا ایک دیوان بھی ترتیب دیا۔ لیکن لکھنؤ میں انھیں اردو کا کوئی اچھا استاد نظر نہ آیا۔ دھیرے دھیرے ان کا میلان طبیعت فارسی شاعری کی جانب ہوا اور انہوں نے عبدالرضا متین کی شاگردی اختیار کر لی مؤلف "عقد ثریا" کا بیان ہے:

"از ابتدائے عمر رموزوں طبع افتادہ بود بیشتر فکر شعر ہندی میکرد بصاحب کمالان دہلی مثل خواجہ میر درد وغیرہ ملاقات ماداشت وقتی کہ بسبب برہمی اوضاع شاہجاں آباد بہ لکھنؤ رسیدہ

---

(۱) سخن شعراء: ص ۱۶۳

(۲) گلشن ہند: ص ۵۹

دریں دیار از استادان ہندی گو کسی را ندید آخر خیال فارسی را در سر جاداد آنچہ دلاں روز ھا موزوں میکرد پیش شیخ عبدالرضائے متین برای اصلاح می برد تا آنکہ ھمہ راں نزدیکی مرزا محمد فاخر مکین از دھلی رخت باین دیار کشید و در مجلس مشاعرہ زمزمہ غزل عاشقانہ را بلند آوازہ گردانید خیلی دلش رجوع بہ ایشان آوردہ مرزائے مذبور را بہ استادی برداشت و ھمیشہ کلام خود را از نظرش میگزرانید"۔(۱)

بعد میں دیوانہ مرزا فاخر مکین کے شاگرد ہوئے۔ میر حسن انھیں فارسی کا زبردست شاعر مانتے ہیں:

"دیوانہ زبردست شاعر فارسی است شعر بسیار گفتہ است۔ استاد ریختہ گویان لکھنؤ است ..."(۲)

"دیوانہ" فارسی زبان وادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ اشعار کہنے میں انھیں اچھی خاصی استعداد حاصل تھی۔ میر جعفر علی حسرت اور حیدر علی حیران ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ "مجموعۂ نغز" کی عبارت کے مطابق:

"از شعرائے دیار مشرق است در بلدۂ لکھنؤ یکچند علم استادی می افراشت و کمتر کسے بود کہ نسبت تلمذ بوی نداشت جعفر علی حسرت کہ استاد قلندر بخش جرأت است نسبت تلمذ بوی دارد ..."(۳)

فارسی میں چار دیوان اور ایک اردو دیوان، دیوانہ کی یادگار ہیں۔ فارسی منظوم انکا دس ہزار بیت سے بھی زیادہ ہے۔ نقش علی کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔ اس ضمن میں خاصے متاثر نظر آتے ہیں، لکھتے ہیں:

"بحسن اخلاق واکثر خوبیہا متصف و بسیار خوش اختلاط ست بافن شعر رغبت مفرد دارد قوت گویائش بمرتبہ ایست کہ ھر روز پنج شش غزل بلکہ زیادہ میگوید ..."(۴)

"باغ معانی" میں دیوانہ کا ایک شعر ملتا ہے:

جان دو دو سینہ مجمر و دل در برآتشی　　در خرمنم قضا بود آتش در آتشی

---

(۱) عقد ثریا: ص ۲۶

(۲) تذکرہ شعرائے اردو: ص ۱۰۱

(۳) مجموعۂ نغز، جلد ۱: ص ۲۵۸

(۴) باغ معانی: ص ۶۴

بھگوان داس ہندیؔ جو دیوانہؔ کے دوست بھی تھے انھوں نے ''دیوانہ'' کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ لکھی ہے۔ چار دیوان فارسی کے مرتب کیے تھے: دیوان دردیہ، دیوان عشقیہ، دیوان شرفیہ (شرف جہاں قزوینی کے دیوان کے جواب میں) اور دیوان چہارم، حزیںؔ کے دیوان کے جواب میں۔ انہیں قوافی وردیف میں مرتب کیا تھا۔ دیوان پنجم مرتب کر رہے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ایک فارسی مثنوی ''برقصۂ رام چندر برگ فروش'' (میر شمس الدین فقیر نے بھی یہ قصہ نظم کیا ہے) بھی انکی تصنیفات میں سے ہے۔ اسکا ابتدائی حصہ بھگوان داس ہندیؔ کی نظر سے بھی گزرا تھا۔(۱)

فارسی شاعری میں دیوانہؔ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے اشعار پاکیزہ اور اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔ نمونۂ کلام:

اے خوش آں ساعت کہ خوباں بر اسیر یکدگر
سرد ھند اللہ اکبر گفتہ تیر یک دگر
طاقت رفتن بکویش طاق بود از فرط ضعف
ما و دل بودیم آنجا دستگیر یک دگر
بلبلان نو گرفتاریم و در کنج قفس
میفشانیم اشک گلگون بر صفیر یکدگر
تخت گاہ تست دل آنجا بتی را رہ مدہ
جنگ ھا دارند شاھان بر سریر یکدگر

گفتند از زبان تو بامن پیام وصل
با ور نیا یدم کہ پیام از زبان تست

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۴۷

بمن تو وعدہ نکر دی و مسادگیم بربین　　کہ عمر من بزہ انتظار می گزر

من و دل ھر دود ر راھی ضعف افتادہ در ساعت　　گہے من دست دل گیرم گہے دل دست من گیرد

از جفایت تا بکی از دیدہ خوں بارد کسی　　آخر ای جان کسی رحمی کہ جاں دارد کسی

دیوانہ کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

الٰہی نشۂ ذوق محبت دہ کلامم را　　لباب از شراب شوق وحدت ساز جامم را
بحکم عشق تو عشقیہ خواندم نام این دیوان　　خداوندا بکن مخصوص خاصان نبض عامم را
چوں مرغ معنی وحشی بدام طبع می افتد　　عطا فرما پر پرواز شہرت میدامم را
تخلص کردہ ام دیوانہ من از جذبۂ عشقت　　بفضل خود یگراں شہر وافاق نامم را(۱)

دیوانہ کے سال وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ مرزا علی لطف نے سال وفات ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء شیفتہ نے ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء اور کریم الدین نے ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء لکھا ہے لیکن ہمارے خیال میں ان کا صحیح سال وفات ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۸ء ہے، جس کی تصدیق بھگوان داس ہندی کے درج ذیل قطعۂ تاریخ سے ہوتی ہے:

بچار شنبہ ماہ صیام نوز دھم　　بررفت رای سرب سکھ سوی بہشت بریں
چو بود اوبفن شعر و شاعری ھشیار　　شدش تخلص دیوانہ اختیار ازیں
بہشت یافتہ تاریخ رحلتش باشد　　دلیل مغفرت او ھمین بود بہ یقین(۲)

---

(۱) گلچھی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے: ص ص ۴۰۔۴۱

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۴۳۷

۱۱۔ مرزا بھچو ذرہؔ

نام محمد سمیع تھا۔(۱) مرزا بھچو کہے جاتے تھے اور تخلص ''ذرہ'' تھا۔ یہ حکیم محمد شفیع اکبرآبادی کے بیٹے تھے۔ ذرہؔ کی پیدائش لکھنؤ کی ہے۔(۲) تاریخ تولد تذکروں میں درج نہیں ہے۔ ذرہؔ کا خاندان اصلاً ایرانی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے دادا بزرگوار ''یزد'' سے کشمیر آ گئے تھے اور کشمیر سے اکبرآباد میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ذرہؔ کے والد اکبرآباد کے تھے۔ اور ذرہؔ نے لکھنؤ میں آنکھیں کھولیں۔ اس سلسلہ میں مصنف ''عقد ثریا'' کا بیان ہے:

''خودش در لکھنؤ تولد و تربیت یافتہ جدش مردم کشمیر بود در عہد خلد مکاں باکبرآباد نقل کردو والدش در مستقر الخلافہ متولد شدہ خلاصہ نسب آنھا مرزا است غالب کہ اصل ایشان از ایران زمین باشد وخودش ھم میگوید کہ وطن آبائے مایزداست(۳)

جوان ہوئے تو نواب شجاع الدولہ کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی۔ ذرہؔ طبابت کے پیشہ میں ماہر تھے۔ ہندیؔ لکھتے ہیں:

''در طبابت دستگاہ کلی داشت''(۴)

فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری ''ذرہؔ'' کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اکثر اچھے اشعار کہتے فارسی اشعار میں میر شمس الدین فقیرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ سفینۂ ہندی، عقد ثریا اور دوسرے تذکروں میں ذرہؔ کو فارسی کا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندیؔ لکھتے ہیں:

''اصلاح شعر از میر شمس الدین فقیر عباسی گرفتہ اقسام شعر گفتہ وخوب گفتہ، دیوانش

---

(۱) عقد ثریا: ص ۲۸

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۸۰

(۳) عقد ثریا ص ۲۸

(۴) سفینۂ ہندی: ص ۸۰

قریب دوسہ ھزار بیت خواھد بود'' (۱)

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد ذرہ کربلای معلّٰی کی طرف چلے گئے اور وہیں پر ان کی وفات ہوئی۔ تاریخ وفات نہیں معلوم ہوسکی۔ انکے دیوان میں غزلیں، قصائد اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ غرض کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے تذکروں میں عام طور پر ان کے اشعار نہیں کے برابر ہیں۔ لیکن مؤلف تذکرہ ''ریاض العارفین'' نے ان کے نمونۂ کلام پر کئی صفحات صرف کئے ہیں۔ اشعار کے چند نمونے یہاں بھی لطف سے خالی نہ ہوں گے، ملاحظہ ہوں:

وفاز روز ازل ،نقش دل نشینم بود — نبود عالم، ونام تو درنگینم بود
ھنوز سجدۂ آدم نہ کردہ بود ملک — کہ،خاک کوی ترا،ربط باجبھم بود

از ناوک او دلم،فگار است — با آنکہ ھنوزنی سوار است
آزردہ شد اختیار دارد — درگریہ مراچہ اختیار است

تا کی دروغ این ھمہ ترک جفا وتو — سوگند ازبرای چہ ،رو! رو! وفا وتو
امروز اگربہ داد دل مانمی رسی — ما ودل شکستۂ و روز جزا وتو
شد،آن چہ شد،ولیک از،انصاف بگزری — این بود حق بندگی ما خدا وتو
این طعن واین سلامت واین جوروواین دریغ — درما چہ ماجرا است چنین ماجرا وتو

خود آھن و سنگ نسیم من — دور از تو چگونہ زیستم من
می رفتی و سوی من نہ دیدی — می دیدم و می گریستم من

قصہ کوتاہ کن،ای مرگ! کہ آن مایۂ ناز — ازدرازی نہ نہد گوش،بہ افسانہ ما

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۸۰

باز در گوشم، صدای های های! می رسد
آه تا دیگر چه پیش آمد دل زار مرا

گلشن حسن تو، گر مهر گیاهی می داشت
ذره هم رو چمن وصل تو، راهی می داشت

پندا شتیم آیهٔ رحمت نزول کرد
دیدیم چون به چشم تامل، خدنگ بود(۱)

از نظر انداخت مرا عالمی
تا تو مرا در نظر انداختهٔ

ذره !تو ودعوی مردی، خموش
طفلی دیدی سپر انداختهٔ

سرِ ما بگذاشت و این دل زار هماں
گرما بگذاشت واین دل زار هماں

القصه تمام گرم و سرد عالم
برما بگذشت واین دل زارهماں(۲)

---

(۱) تذکره ریاض العارفین: ص ۲۴۳_۲۴۴

(۲) سفینهٔ ہندی: ۸۰

۱۲۔ محمد برھان علی خاں رہینؔ

محمد برھان علی خان نام اور تخلص ''رہینؔ'' تھا۔ ان کے والد محمد معزالدین خاں بہادر ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ جس وقت احمد خاں بنگش نے راجہ نول رائے کا قتل کیا، نواب صفدر جنگ کے میر منشی راجہ رام نرائن الہ آباد میں پناہ گزیں تھے۔ احمد خاں بنگش بھی اس جانب روانہ ہوئے اور انکے بیٹے نواب محمود خاں نے لکھنؤ میں الگ لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی۔ معزالدین خاں نے بڑی بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور انھیں شہر سے دور بھگا دیا۔ دریں اثناء صفدر جنگ نے دہلی سے آکر (۱) ان سے نول رائے وفا کے قتل کا بدلہ لیا اور معزالدین خاں بہادر کا لقب اور شش ہزاری منصب عطا کیا۔ صفدر جنگ کی وفات کے بعد شجاع الدولہ کے عہد میں انھیں گورکھپور کی صوبہ داری عطا کی گئی۔ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں انکی وفات ہوئی۔ (۲) اس ضمن میں ان کے بیٹے رہینؔ نے ایک طویل نظم کہی۔ جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

معزالدین محمد خاں بہادر — کہ در غرب مقامی داشت عالی
بنامش در ازل از مصحف دین — برآمد اختری فرخند فالی
زتاب مہر آل مصطفیٰ داشت — رخ با ابرویش کو نہ الی
بحسن خلق و احسان و مروت — بعالم شد مثل در بیمثالی
زبس بود از پی بیگانہ و خویش — وجودش مایۂ آسودہ حالی
زدستش زھر خورد ندی عزیزاں — بذوق شکر از شیریں مقالی
بکنج عزلت از دہ سال میز یست — جوانمرد انہ درپیرانہ سالی

---

(۱) احمد خاں بنگش اور محمود خاں رامپور کے نواب تھے۔

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۸۲

رہینؔ کے تاریخ تولد اور وفات کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا۔ البتہ انکی خوش مزاجی اور خوش کلامی کا ذکر اکثر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ عربی و فارسی ادبیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ فن شعر و سخن میں پوری دستگاہ حاصل تھی اور اصلاح مرزا فاخر مکینؔ سے لیتے تھے۔ مصحفی نے ان کے استادوں میں مرزا فاخر مکین کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''کسب فن گرامی شعر از مرزا محمد فاخر مکین کردہ و تحصیل علم معقول و منقول از حافظ غلام مخدوم محدث شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی کردہ است'' (۱)

رہینؔ نے قصائد و غزلیات کے علاوہ کئی مثنویاں بھی کہی ہیں۔ ایک مثنوی ''مخزن اسرار'' کے طرز پر لکھنی شروع کی تھی۔ تقریباً ہزار اشعار کہے تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کا فارسی مجموعۂ کلام تقریباً دس ہزار اشعار سے زاید پر مشتمل ہے۔ بھگوان داس ہندیؔ نے بھی سراہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''کلیاتش زیادہ از دہ ہزار بیت خواہد بود راقم بر سراپای آں گذشتہ، چند سال است کہ وفات یافتہ ••• دو دیوان ترتیب دادہ ••• '' (۲)

رہینؔ اس عہد کے معروف شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار نہایت ہی سادہ و پرکار ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بڑی خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھوں نے دقیق الفاظ کے استعمال سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ ان کے اشعار کے چند نمونے حسب ذیل ہیں:

صد قیامت بیکی جلوۂ قامت کردی　　چہ قیامت کہ نکردی چہ قیامت کردی

برید برقد خود جامۂ خدای را　　بحد رساند بت شوخ کبریای را

یار عارض نہفت و من مردم　　عارضی بود زندگانی من
خاموش رہین کہ گوش عالم　　کر گشت زشور و شیون ما

---

(۱) عقد ثریا: ۲۹

(۲) سفینۂ ہندی ص ۸۴

۱۳۔ راجہ رتن سنگھ زخمی

راجہ رتن سنگھ نام اور زخمی تخلص تھا۔ ان کا تعلق سکسینہ کائستھ قوم سے تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ''راجہ بالک رام'' بھی شاعر تھے اور ''صبوری'' (۱) تخلص کرتے تھے۔ صبوری ''مہاراجہ جھاؤمل (۲)'' کے نائب تھے۔

زخمی کی پیدائش ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء کو لکھنؤ میں ہوئی (۳) فارسی، انگریزی، عربی اور ہندی زبانوں پر انہیں کامل دستگاہ تھی۔ انھوں نے ان زبانوں کے جملہ علوم وفنون کی تحصیل کی۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا اور شعر وسخن میں مرزا محمد حسین قتیل سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کو بادشاہ نصیر الدین حیدر کے اتالیق ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کچھ دنوں ''داروغگی'' کے عہدے پر بھی مامور رہے اور ترقی کر کے ''میر منشی'' کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کو بادشاہ نے ''منشی الملوک فخر الدولہ'' و ''دبیر الملک'' کا خطاب بھی دیا۔ محمد علی شاہ کے زمانے میں منشی گیری کے ساتھ ساتھ انھیں محکمۂ دیوانی کی خدمات بھی سرکار کی طرف سے تفویض کی گئیں لیکن جب امجد علی شاہ کا دور آیا تو انھوں نے زخمی کو ان دونوں عہدوں سے برطرف کر دیا۔

حالانکہ زخمی نے صوبۂ اودھ کے انتظامی معاملات میں کئی ایک تبدیلیاں کیں اور اس کام کے لئے انھوں نے ایک نیا دستور العمل بھی ترتیب دیا تھا جس میں انتظامی اعتبار سے اودھ کو چھ حصوں میں تقسیم کیا تھا، اسی عہد سے تحصیلدار ناظم کہے جانے لگے۔ (۴)

---

(۱) صبوری، نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں ''میر آتش'' کے عہدے پر فائز تھے۔

(۲) جھاومل، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں داروغۂ اصطبل تھے۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں راجہ کے خطاب سے نوازا اور عہدے میں ترقی دی۔

(۳) انیس العاشقین: (مخطوطہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ) تذکرہ ریاض العارفین میں سال تولد ۱۱۹۰ھ لکھا ہے۔ (ص ۲۸۳)

(۴) احسن التواریخ: ص ۱۲۹

ان تمام مصروفیات سے قطع نظر اگر زخمی کے علمی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو اس کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہوگا۔ اس کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جس کا بین ثبوت اس کا مکمل فارسی دیوان ہے(۱) دیوان کے علاوہ ان کی نثری خدمات بھی کچھ کم نہیں جو انھیں اعلیٰ درجہ کا نثر نگار قرار دیتی ہیں۔ ان میں حدائق النجوم، سلطان التواریخ، انیس العاشقین جام گیتی نما، معیار الزماں، شرح گل کشتی(۲) ایسی تصنیفات ہیں جو فارسی علم وادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

زخمی کا انتقال ۶۵ سال کی عمر میں ہوا۔ افسوس کہ ان کے تفصیلی حالات زیادہ نہ مل سکے۔ اس نے اپنی زندگی کے اخیر میں اسلام قبول کرلیا تھا(۳) زخمی کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ای غازہ ز نام تو برخ شاهد من را — پیرانہ ز وصف تو عروسان سخن را
از دیدن تو کافر عجمی نیست کہ در حشر — صد بار زنم پیش خدا چاک کفن را
تا دل شد آوارہ در آن لطف پریشان — اشک است بشام سفرم صبح وطن را
زان بادہ کز و مستی منصور تراداد — ساقی قدح ای لطف کن این تشنہ دھن را
پسند مرا وا ینہمہ چو فاختہ نالاں — ای از تو سرفرازی تو سرو چمن را
بخشد اگر جان ودمی بسمل عجمی نیست — آبی است دگر خنجر آن عہد شکن را
زخمی فکرت چشم سفید است کہ داری — نسبت بکنی پای کسی برگ سمن را

رباعی کا نمونہ:

در ماندہ ام وھم نفس نیست مرا — می نالم و فریاد رسی نیست مرا
یارب بنظر بحال زارم از رحم — جز مسلم و جز تو کسی نیست مرا

غزل اور رباعی کے علاوہ اس نے مخمس بھی کہے، یہاں مخمس کے چند بند نمونے کے طور پر دیے جاتے ہیں:

---

(۱) دیوان زخمی ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں مطبع محمدی لکھنؤ سے چھپا۔

(۲) قلمی نسخہ مولانا آزاد، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، شمارۂ نمبر Poem Per 2 94

(۳) احسن التواریخ: ۱۲۹

کجا خواب و خورش و کو چشم صبح واکردن　　من وهر شب زدرد دل بکویش نالها کردن
شود تا درره معشوق روزی جان فدا کردن　　چه باشد عاشقی خود را بغمها مبتلا کردن
بصد خون جگر بیگانه ای راآشنا کردن

گرفتم جانمن جاکر دازبیداد او برلب　　کشیدم صد جفاهر روز ودیدن صد بلاهر شب
بصد تقریب کردم بیش او اظهار بر مطلب　　چه حاصل زینهمه افسانهٔ مهر وو فا یا رب
که نتوان در دل بی مهر او یکذره جان کردن

عجب نه بود گر باینهمه بیرحمی جانان　　کند زخمی فدا درراه او جان و دل وایمان
همین بوداست طرز عاشقان گشتهٔ هجران　　ففانی کمترین بازیست در عشق مگوادیان
جفا از بیوفا دیدن و نامش را وفا کردن

غزل کے چند اشعار:

باشد آن ترک پری چهره دلی شاد کند　　برمن زدل بگذارید که بیداد کند
بخت آن کو که شبی یار زمن یاد کند　　بفریبی،دل غمگین مراشاد کند
بوئی گل آمد و دل نیز تپیدن سرکرد　　بینم امروز جنون بی توچه ارشادکند
نالهام ازغم جان نیست ،ولی میترسم　　بیندم صید زبون رنجد و آباد کند

سخت تنگ آمدهام ازدل وازز اری دل　　وقت آن ست که آئی پی غمخواری دل
چه جفا ازتو کشید و بچه حسرت جان داد　　می خلد در جگرم یاد وفاداری دل
تا کجا نالهٔ ،فغان چند،ملامت تا کی　　نشود روزی کس درد گرفتاری دل
جز لب روح فزایت که نشد روزی من　　چیست قربان شومت چارهٔ بیماری دل
جان زخمی تو کجائی که درین حالت یاس　　اجل آمد بسرم بهر پرستاری دل(۱)

---

(۱) تذکرهٔ ریاض العارفین: ص ص ۲۸۳_۲۸۴

۱۴۔ میر عنایت بیگ ساکنؔ

عنایت بیگ نام، اور تخلص ساکنؔ تھا۔ ان کی جائے پیدائش دہلی ہے(۱)۔ تذکرہ نویسوں نے تاریخ تولد کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ساکنؔ نے ابتدائی تعلیمات دہلی کے زمانۂ قیام میں حاصل کیں۔ احمد شاہ ابدالی کے پیہم حملوں نے جب دہلی کی حالت دگرگوں کردی تو ساکنؔ بھی اوروں کی طرح دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ کا رُخ کیا۔

اس وقت اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی حکمرانی تھی۔ ساکنؔ نے بھی نواب موصوف کی سرکار میں قسمت آزمائی کہ اور باعزت عہدے پر سرفراز ہوئے لیکن ساکنؔ کا دل لکھنؤ میں زیادہ عرصہ تک نہ لگا اور وہ بنارس کی جانب چل دیئے۔ بنارس میں ''شاہ نذر علی قلندر'' کے مرید ہوگئے۔ لیکن بنارس میں بھی ساکنؔ کو وہ سکون اور اطمینان میسر نہ ہوا جس کے وہ خواہاں تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کی طرف چلے گئے۔

یہاں آکر ساکنؔ نے سادہ طریقہ سے درویشانہ زندگی اختیار کرلی اور کچھ سال بعد ۲۵ محرم سنہ ۱۲۱۱ھ / ۱۷۸۶ء میں مرض استسقا میں وفات پائی۔(۲) چونکہ تذکروں میں ان کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں لہذا اس بات کا اندازہ لگانا کہ یہ کن کن جگہوں پر کتنی مدت تک رہے یا انتقال کے وقت ان کی عمر کتنی تھی ناممکن ہے۔

ساکنؔ کو فارسی شعر و شاعری سے شغف تھا۔ بھگوان داس ہندیؔ کی شہادت کے مطابق ساکنؔ نے اپنا دیوان ترتیب دیا تھا لیکن بیشتر کلام مفقود ہے دیوان کے متعلق بھی دوسری کوئی شہادت نہیں ملتی تذکرہ ''سفینۂ ہندی'' اور تذکرہ ''ریاض العارفین'' سے ان کے چند اشعار بمشکل حاصل ہو سکے ہیں

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۰۳

(۲) ایضاً

جس کی بناء پران کی شاعری کا جائزہ نامکمل سارہ جاتا ہے۔

بہر حال اس بات کی تصدیق ضرور ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے کلام پر مرزا فاخر مکیںؔ سے اصلاح لی۔ ہندیؔ کا بیان ملاحظہ ہو:

''درفن شعر شاگرد جناب ارشاد مآب (۱) است۔ دیوانی ترتیب دادہ وارستہ مزاج وآزاد منش بود'' (۲)

اشعار کے نمونے ملاحظہ ہوں:

هر چند که جیب تار تار است
بر گردن من هنوز باراست

عاقبت شام غم من سحری پیدا کرد
نالۂ بی اثر من اثری پیدا کرد
لاله در باغ جهان نیست که درباغ قضا
خون من ریخته خونیں جگری پیدا کرد
مجنون چو بآهوگفت افسانۂ چشم تو
آهو شده چون مجنوں دیوانۂ چشم تو (۳)

چون آمدی به نعشم دود از کفن برآمد
رفتی چو دامن افشاں آتش زتن برآمد (۴)

---

(۱) بھگوان داس ہندیؔ نے اپنے تذکرہ سفینۂ ہندی میں مرزا فاخر مکیںؔ کو ''ارشاد مآب'' سے مخاطب کیا ہے۔

(۲) سفینہ ہندی: ص ۱۰۳

(۳) ایضاً

(۴) تذکرہ ریاض العارفین: ص ۲۹۵

۱۵۔ محمد صدیق سخنورؔ

نام محمد صدیق اور تخلص سخنورؔ تھا۔ یہ اودھ کے مشہور قصبہ بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی احسان اللہ تھا۔ تاریخ پیدائش و وفات کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ مؤلف ''سفینۂ ہندی'' نے صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کی ہے کہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں ان کی ملاقات سخنورؔ سے ہوئی تھی۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ سخنورؔ کی زمین جائیداد کسی سرکاری کارروائی کے تحت ضبط ہوگئی تھی۔ اسی سلسلہ میں سخنورؔ ہندیؔ سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ ہندیؔ کے بیان سے اس واقعہ کی وضاحت ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

''در سنہ یکہزار و دویست پیش مولف آمد، ظاہر ساخت کہ دیہہ معاش من از مدتی در سرکار ضبط است اگر معاف شود زندگانی بخوبی بسر برم مولف اورا بملازمت رای میکو لعل واصل باقی نویس صوبۂ اودھ والہ آباد کہ پیش کار مہاراج ادھراج مہاراجہ تکیت رای نراندر بہادر بود و با بندہ کمال دوستی داشت رسانیدم رای قدر شناس پروانہ معافی دیہہ مذکور نویسانید داد ،مولف پروانہ را بسخنور مذکور دادم ••• ''(۱)

سخنورؔ نے ابتدائی درسی کتابیں میر سید محمد بن میر عبدالجلیل بلگرامی اور دوسرے مشہور اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد دہلی آئے اور اس عہد کے مشہور و معروف شاعر سراج الدین علی خاں آرزوؔ کی شاگردی حاصل کی۔ اس سلسلہ میں ''قدرت اللہ'' کا بیان ملاحظہ ہو:

''بعد سن شعور کتب درسی بخدمت میر سید محمد خلف ارشد میر عبدالجلیل بلگرامی و دیگر اساتذہ نامی گزرانید ••• تن بمشق سخن دارد ••• بسیاحت شاہجہاں آباد در افتاد و بانکتہ سنجان آنجا ملا ••• گشت و بخدمت سراج الدین علی خاں آرزوؔ کہ سرآمد شعرای عصر بودہ اصلاح شعر بر گرفت'' (۲)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ص ۱۰۴۔۱۰۵

(۲) نتائج الافکار: ص ص ۳۵۴۔۳۵۵

علاوہ بریں سخنورؔ ایک حاذق طبیب بھی تھے اور اس فن میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ مصحفیؔ کی ان سے اکثر لکھنو میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی سخنورؔ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے، لکھتے ہیں:

''ودر طالب علمی وفن طبابت تمیز بقدر حال مہارتش ست واین چیز ھا از دیگر اساتذہ یاد گرفتہ ودرفن شعر شاگرد خان آرزو خود رامی گوید فقیر رادر لکھنو ملاقات باوافتادہ''(۱)

ذیل میں سخنورؔ کے چند اشعار بطور نمونہ قلمبند کیے جاتے ہیں:

تا بہ گلگشت چمن آن سرو قامت می رود — بر سری قمری چہ آشوب قیامت می رود
می شود سرمایۂ ناز آن سپاھی پیشہ را — آنچہ از جنبش نیاز من بغاوت می رود

بی دماغان جنون از فکر صحرا فارغ اند — از خراب آباد دل طرح بیابان ریختند

در چمن آید اگر آن غنچہ لب بلبل زشرم — زیر بال خود کند چون بیضہ پنہا غنچہ را

بہ شہر حسن ندانم چہ فتنہ ھا برپاست — کہ قاصد آمد و آھی کشید و ھیچ نگفت
نیافتم کہ بگوشش چہ گفت باد صبا — کہ گل بباغ گریبان درید و ھیچ نگفت

گر دل بشکارت کشد ای میر شکاری — صید دل ما کن کہ شکاری بہ ازین نیست

آتش عشق ترا نازم کہ بعد از سوختن — از ھوا خاکستر من شعلہ پیدا می کند

سخنور کے دیوان کا قلمی نسخہ مولانا آزاد، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں موجود ہے۔(۲)

---

(۱) عقد ثریا: ص ۳۲

(۲) دیوان سخنور: نسخہ خطی: Poem(U.Per 227

۱۶۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ

مرزا رفیع نام اور تخلص سوداؔ تھا۔ ان کے والد محمد شفیع مرزا ایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا شفیع تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے اور یہیں قیام کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ سوداؔ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شروع میں ''سلیمان قلی خان وداد'' کے شاگرد ہوئے، بعد میں شاہ حاتمؔ کی شاگردی میں آئے۔ مصحفیؔ کے الفاظ میں:

> ''در ابتدائے شوق شعر ہندی شاگرد سلیمان قلی خاں وداد بود و نیز بہ شاہ حاتم رجوعی داشت ... اگرچہ مردکم علم بود اما ذکاوت و روانی طبعش از کلامش پیداست۔ در زبان ریختہ علم یکتائی برافراشتہ و ہمیشہ با امراء صحبت داشتہ قصائد و غزلی در جواب بعض قصائد عرفی تصنیف نمود، و ماسوائے این گفتن ہجو ہا قدرت شاعری خود را نمود ...''(۱)

سوداؔ کی طبیعت شعر و سخن کے لئے موزوں تھی۔ کثرت مشق نے اسے اور بھی بڑھایا، نکھارا اور سنوارا۔ فارسی کلام پر سراج الدین علی خاں آرزوؔ سے اصلاح لیتے تھے اور ان کی صحبت سے سوداؔ کو کافی فیض بھی حاصل ہوا۔ بعد میں آرزوؔ کی ہدایت پر ہی فارسی چھوڑ کر ریختہ گوئی کی طرف قدم بڑھایا لیکن فارسی شعر گوئی کا شوق اس قدر سرایت کر چکا تھا کہ اس سے مفر اور گریز ممکن نہ تھا۔ اس لئے فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

غرضیکہ استاد کی زندگی میں ہی سوداؔ کی استادی ہر خاص و عام نے تسلیم کرلی تھی۔ حتیٰ کہ شاہ عالم بادشاہ خود اپنا کلام سوداؔ کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے مختصر یہ کہ دہلی جیسے شہر میں سوداؔ کے مسلم الثبوت ہونے کو تسلیم کیا گیا۔

دہلی کی بربادی کے بعد اوروں کی طرح سوداؔ کو بھی بادل ناخواستہ دہلی چھوڑنی پڑی۔

---

(۱) عقد ثریا: ص ۳۲

دہلی چھوڑنے کے بعد سوداؔ کی پہلی منزل فرخ آباد تھی۔ جہاں نواب احمد خان غالب جنگ برسر اقتدار تھے۔ مہربان خان رندؔان کے دیوان تھے۔ جوخود شاعر تھے اور شعراء کے بڑے قدردان بھی تھے۔ چنانچہ مہربان خان کی مہربانی سے سوداؔ کے چند سال فرخ آباد میں بڑے سکون وفراغت سے گزرے۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ نواب احمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ سوداؔ وہاں مزید ٹھہر نہ سکے اور دل برداشتہ ہوکر فیض آباد چلے آئے۔

سنہ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں سوداؔ فیض آباد پہنچے تو اس وقت وہ عمر کی ساٹھ منزلیں طے کر چکے تھے۔ فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی حکومت تھی سوداؔ نے نواب موصوف کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کر ان کا قرب حاصل کیا، اور دو سو روپے ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر ہوا۔ نواب جب تک زندہ رہے، یہ ان کی ملازمت سے وابستہ رہے۔ ''کلیات سودا'' (۱) میں نواب کی شان میں ان کے متعدد قصائد موجود ہیں۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:

> ''ہر جا کہ می رفت عزت وحرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز بودن اورا درسرکار خود بسیار غنیمت می دانستند'' (۲)

''کلیات سودا'' میں فارسی کا ایک دیوان بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں سوداؔ کا ایک رسالہ ''عبرۃ الغافلین'' کے نام سے ہے، جس میں انھوں نے مرزا فاخر مکینؔ کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ مرزا فاخر مکینؔ نے فارسی کے شعرائے سلف پر اعتراضات کیے تھے جس کا سوداؔ نے نہ صرف جواب دیا بلکہ مرزا فاخر کے کلام پر اعتراضات کر کے اسے ناقص قرار دیا۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں سوداؔ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ چونکہ یہ نواب آصف الدولہ کے مقربین خاص میں سے تھے لہذا زندگی بھر نواب اور اہل لکھنؤ کی قدردانی سے فارغ البال رہے۔ تقریباً ستر (۷۰) سال کی عمر میں ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء میں وفات پائی اور قبا قر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

---

(۱) ''کلیات سوداؔ'' میں فارسی کا ایک مختصر دیوان ہے، اس میں باسٹھ (۶۲) غزلیں ایک قصیدہ چند قطعات ومخمسات شامل ہیں۔ یہ دیوان سودا کے کلیات اردو میں منسلک ہے جس کا پہلا ایڈیشن مطبع مصطفائی، دہلی سے سنہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں طبع ہوا تھا۔ دوسری بار مطبع نامی نول کشور کانپور سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

(۲) تذکرۃ الشعراء: ص ۱۶۴

مصحفی نے تاریخ وفات کہی:

سودا کجا وآن سخن دلفریب او

۱۱۹۵ھ

سوداؔ ایک بلند پایہ شاعر اور مکمل استاد تھے۔ فنون شاعری میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کے کلام میں جدت ان کا خاص حصہ ہے۔ حلاوت و چاشنی بھر پور ہے۔ کلام کے مضامین اعلیٰ درجہ اور بلند خیالات کے حامل ہیں۔ ان کے قصائد زیادہ مشہور ہیں اور غزل کے مقابلے میں زیادہ سراہے گئے ہیں۔ مصنف ''سخن شعرا'' لکھتے ہیں:

''نواب آصف الدولہ بہادر کے مقربوں میں منسلک ہو کر ملک الشعراء کا خطاب پایا تھا'' (۱)

''عقد ثریا'' کے الفاظ یہ ہیں:

''غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنؤ گفتہ داخل دیوان ریختہ بقیہ ردیف ساختہ'' (۲)

مؤلف ''گلشن ہند'' لکھتا ہے:

''فخر شعرائے ھندوستان'' (۳)

ان کی فارسی شاعری کی عظمت کے سلسلے میں مصنف ''طبقات الشعراء'' کے الفاظ ہیں:

در مضمار قصیدہ گوئی گوئے سبقت از عرفی و خاقانی ربود، و در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد۔ بسیار خوشگو و پر گو است'' (۴)

غرض کہ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی خوشگوئی اور مسلم الثبوتی کو خوب خوب سراہا ہے۔ ان کے مختصر فارسی دیوان کے بارے میں مولانا محمد حسین آزادؔ یوں رقم طراز ہیں:

''فارسی کے مختصر دیوان میں سب ردیفیں پوری ہیں۔ زور طبع اور اصول شاعرانہ سب

---

(۱) سخن شعراء: ص ۲۲۲

(۲) عقد ثریا: ۳۲

(۳) گلشن ہند: ص ۶۵

(۴) طبقات الشعراء: ص ۶۱

قائم ہیں (۱)

سوداؔ کا فارسی کلام زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں میں جذبات کی ترجمانی کے لئے الفاظ کا حسن انتخاب عمدہ ہے۔ زبان کی سلاست، شستگی اور شیریں بیانی ہمہ جا نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، ان میں عشق کی مختلف کیفیات کا اظہار و بیان شاعر نے کس خوبی سے کیا ہے:

از دلم چون آہ آتش ناک می آید برون
دود از ہر یک خس و خاشاک می آید برون

می بر آید آن چنان از کلبۂ احزان من
چون ز چشم خستہ جان پاک می آید برون

طاقت صبر و تحمل را تغافل می برد
جان ز تن زان غمزۂ فتراک می آید برون

اشک را نسبت نہ باشد ہیچ با چشم صدف
این گہر از دیدۂ نم ناک می آید برون (۲)

شوخی و شفتگی کے ایک دو نمونے:

وای بر زاہد کہ صائم ماند در فصل بہار
ای خوشا رندی کہ او ساغر بزیر تاک

گہ کعبہ راز کوی تو بہتر نگفتہ ام
ای بت! بخاک او کہ برابر نگفتہ ام

نامحرم است خضر بجای کہ می روم
نام مقام دوست بہ رہبر نگفتہ ام

صوفیانہ طرز کے چند نمونے:

در کعبہ یہودیم و مسلمان بدردیر
آرام بجز خانۂ خمار نداریم

مابندۂ عشقیم و مبر از مذاہب
با شیخ و برہمن سر پیکار نداریم

ہرگز نمی رود ز تنش تا کہ جان رود
عاشق کجا زکوی تو اے مہرباں رود

آزادگی بامن اسیری نمی رسد
در گوشۂ قفس خطرہ و خوف دلم نیست

نام و نشان مخواہ بعالم کہ گشتہ اند
چندی نشان بہ خاک برابر کہ نام نیست

بیا دل در تمنای محبت شاہد یکتا
کزین دریای پرشور و شعب بگذر بآسانی (۳)

---

(۱) آب حیات: ص ۱۸۷

(۲) کلیات سوداؔ: ص ۳۷۶

(۳) دیوان سوداؔ (نسخہ خطی کتابخانہ راجہ محمود آباد، لکھنؤ۔ ردیف نمبر: ۲/۵۷۷ و ۲/۲۲)

۱۷۔ کنور دولت سنگھ شکریؔ لکھنوی

نام کنور دولت سنگھ اور تخلص شکریؔ تھا۔ یہ مشہور شاعر اور مؤلف راجہ رتن سنگھ زخمیؔ کے بیٹے تھے۔ تذکرہ ''روز روشن'' کے مطابق ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''شکریؔ کنور دولت سنگھ لکھنوی فرزند راجہ رتن سنگھ زخمی، ولادتش در شہر لکھنؤ سنہ الف و مائتین اتفاق افتاد، مردی خلیق و مہذب و ادیب و مؤدب و نکتہ سنج و نکتہ رس و دقیقہ رس در علم ریاضی، خلف الصدق پدر خود بودہ'' (۱)

لیکن تذکرہ ''ریاض العارفین'' میں سال تولد ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء درج ہے (۲) بہر حال ان کی عمر کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے سے تولد اور سال وفات کا متعین کرنا ایک مشکل امر ہے۔

وضاحت طلب بات یہ ہے کہ شکریؔ کو فارسی شعر و ادب سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو ہر طرف شعر و شاعری کا بازار گرم دیکھا، خود ان کے گھر میں ان کے دادا بالک رام صبوریؔ فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ان کے والد زخمیؔ نے بھی اپنے کلام کی بناء پر بے پناہ شہرت حاصل کی۔ شکریؔ نے فارسی زبان و ادب کی مکمل تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ زخمیؔ نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے دوران ایک کتاب بعنوان ''شرح گل کشتی'' لکھی۔ اس کتاب کا خاص مقصد بھی یہی تھا۔ چنانچہ شکریؔ بھی اپنی علمی صلاحیت و قابلیت میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ رہے۔ اپنے علمی ورثہ میں انھوں نے ایک دیوان (۳) یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

---

(۱) تذکرہ روز روشن: ۴۲۸

(۲) تذکرہ ریاض العارفین: ص ۳۵۷

(۳) دیوان شکری (قلمی)

دارم از عشق بتان حال خرابی کہ مپرس
عمر خود میگذارم بعذابی کہ مپرس

در نظر جلوہ نما برق تجلی گر دید
چون برافگندرخ طرف نقابی کہ مپرس

دوش سرمست می از خانہ غیر آمدہ بود
رفت از پیش نگاھم بشتابی کہ مپرس

شب کہ دربزم او عرض تمنا کردم
خشم آلود بمن داد جوابیکہ مپرس

التفاتش نہ بحالم نہ مرا تاب نگاہ
درمیان من ویاراست حجابی کہ مپرس

انتظار خط آنشوخ کشیدم عمری
عاقبت نالہ بر آورد جوابیکہ مپرس

گامی بطواف خواندی مارا
گاھی بدر دیر فشاندی مارا

خواندی مارا و باز راندی مارا
ای عشق کجا رساندی مارا

حضرت حسینؓ کی شہادت کے سلسلے میں ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خنجر چو برگلوی شہ انس وجان زدند
سر بر زمین ملائک ھفت آسمان زدند

ھردم از درد جگر بانوی مضطر میگریست
چون برای شیر در گہوارہ اصغر میگریست

نثر میں ''مکاتیب تہذیب'' نام کی کتاب ۱۲۴۴ھ میں لکھی۔(۱) یہ کتاب اخلاقیات پر ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ شکرؔی کا سال وفات کہیں نہیں ملتا۔

---

(۱) ''مکاتیب تہذیب'' کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

۱۸۔ شیخ نظام الدین احمد صانعؔ بلگرامی

شیخ نظام الدین احمد نام اور تخلص ''صانعؔ'' تھا۔ اودھ کے مشہور قصبہ بلگرام کے باشندہ تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۳۹ھ /۱۷۲۶ء میں ہوئی۔ (۱) ان کا تعلق عثمانی خاندان سے تھا۔ (۲) معاصر تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک مدت تک فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے نائب ''مہربان خاں'' کی خدمت میں رہے۔ جب احمد خاں کی وفات ہوئی تو صانعؔ لکھنؤ آ گئے اور نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ان کی زندگی کے یہ چند سال بڑے سکون و عافیت سے گزرے۔ اس کے بعد صانعؔ نے عظیم آباد (پٹنہ) کا رخ کیا اور وہاں جا کر ایک انگریز کے یہاں منشی گری کے عہدہ پر فائز ہو گئے لیکن یہاں بھی وہ مستقل طور پر نہ رہے بلکہ کچھ ہی عرصہ بعد کلکتہ کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وطن کی طرف واپسی کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ وطن پہنچتے ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہیں انتقال کر گئے۔ تذکروں سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان کے ملازموں میں سے کسی نے ان کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا جس سے انکی موت واقع ہوئی۔

مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے بعد صانعؔ نے شعر و شاعری کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں آزادؔ بلگرامی کی صراحت ہے کہ وہ میر نوازش علی بلگرامی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔

آزادؔ بلگرامی چونکہ صانعؔ کے ہم وطن تھے اور انھیں اچھی طرح جانتے تھے لہذا جہاں ان کا ذکر کیا ہے چند دعائیہ کلمات بھی ان کے (صانعؔ) بارے میں لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

''درخدمت میر نوازش علی ••• تربیت یافتہ ••• مشق سخن از خدمت میری کندہ طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد ••• ایزد سبحانہ عمرش بیفزاید و پایۂ سخنش را ترقی ہا کرامت نماید'' (۳)

---

(۱) بلگرام کے فارسی شعراء: ص ۱۵۷

(۲) نتائج الافکار: ص ۴۳۰

(۳) سرو آزاد: ص ۳۴۸

مؤلف ''سفینۂ ہندی'' نے وضاحت کی ہے کہ صانعؔ فارسی زبان کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ (۱) انھوں نے تقریباً دو تین ہزار اشعار کہے تھے۔ ''سفینۂ ہندی'' کی عبارت ہے:

''دیوان خود را بہ راقم دادہ بود تخمیناً دو سہ ہزار بیت خواھد بود'' (۲)

صاحب ''گلشن سخن'' لکھتے ہیں:

''در سخن سنجی صنعتہا می نماید صاحب دیوان فارسی است'' (۳)

مؤلف ''مجموعۂ نغز'' نے صانعؔ کی فارسی گوئی کو سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''از سادات بلگرام و واسطی الاصل بود بیشتر شعر فارسی میگفت دیوان فارسی مردف دارد سرامد شعرائے وضاحت امامرزا محمد رفیع سوداؔ در ایامی کہ شوق فارسی گوئی بہم رسانیدہ بود از یشان اصلاح سخن میگرفت ... '' (۴)

عبدالغفور نساخؔ، صانعؔ کے فارسی کلام پر رائے زنی فرماتے ہیں:

'' ... فارسی شعر نہایت شیریں و نمکین کہے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں کلکتہ اور مرشد آباد میں آئے تھے۔ دیوان فارسی ان کا نظر سے گزرا،، (۵)

''باغ معانی'' میں ہے:

''مرد اھل خلیق صاحب ھنر و کمال است در فنون شعر ماھر و زبانش بگفتن ھر گونہ اشعار خصوصاً غزل قادر تتبع کلام اساتذہ بسیار ورزیدہ خود ھم اشعار بسیار گفتہ دیوانش بنظر مؤلف رسیدہ تلاش مضامین تازہ دارد ... '' (۶)

مختصر یہ کہ صانعؔ کے فارسی کلام کو بیشتر تذکرہ نگاروں نے قابل تحسین نگاہوں سے دیکھا ہے اور

---

(۱) فارسی دیوان کا خطی نسخہ کتابخانہ خدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۱۲۴

(۳) گلشن سخن: ص ۱۶۷

(۴) مجموعۂ نغز: ص ۳۵۷

(۵) سخن شعراء: ۲۷۵

(۶) باغ معانی: ص ۱۲۱

سراہا ہے۔تذکروں میں ان کے اشعار کے نمونے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں،لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ صانعؔ کے حالات زندگی بیشتر تذکروں میں دستیاب نہیں ہیں ورنہ ان کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی۔

مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے لکھا ہے کہ صانعؔ کا کلام بیحد قابل تعریف ہے اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ معاصر شعراء مثلاً شیخ علی حزیںؔ اور ''علی قلی والہ داغستانی'' سے ان کی صحبت رہتی تھی۔(۱) یہی بیان ''گلشن ہمیشۂ بہار'' میں بھی ملتا ہے(۲) صانعؔ کے کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

تانگرد دکفی ظاہر غم پنہان ما — چون شکست رنگ باشد بی صدا افغان ما
یادم آمد ستارہ ریزئی صبح — از جبین تا عرق چکید ترا
نبود خطر از حادثہ خونین جگران را — رہزن نزند قافلۂ اشک روان را
نہ تبسمی نہ لطفی نہ تکلمی نہ حرفی — بچہ سال کنم تسلی دل بیقرار خودرا
نہ بکعبہ اش تسلی نہ بطوف دیر تسکین — بدرش مگر شکیبد دل ناصبور مارا
ناتوان کرد زبس فرقت یاران مارا — برد چون اشک زجا جنبش مژگان مارا
بسکہ رفتیم بفکر دھن او صانعؔ — شد نہان غنچہ صفت سر بگریبان مارا

ھمین نہ لخت جگر ھمعنان گریۂ ماست — کہ نالہ ھمسفر کاروان گریۂ ماست
بد ھر قصۂ طوفان نوح گشت کہن — زبسکہ در ھمہ جا داستان گریۂ ماست

یکدم ز آہ ونالہ نیاسودہ ایم ما — تا بودہ ایم با تو چنین بودہ ایم ما(۳)

''سفینۂ ہندی'' میں ان کے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں:

---

(۱) گلشن بے خار: ص ص ۱۷۰۔۱۷۱

(۲) گلشن ہمیشہ بہا: ص ۲۰۸

(۳) باغ معانی، ص ۱۲۱

نقش روی یاررا مانی بہ پرکاری کشید　　چون نظر بر چشم او افگند بیماری کشید

با سپاہ نیاز و لشکر ناز　　یکطرف یار و یکطرف مائیم

داد از دل درد کیش مارا　　نگذاشت بحال خویش مارا(۱)
توان زائل نمود از بخت عاشق تیرہ رنگی را　　کند گر صفت مشاطر زیبا روی زنگی را
بحرفی کشتگان را زندہ سازد کافر حشمت　　مگر دادند اعجاز مسیحا این فرنگی را

داغ احسان برنتا بد همت والای ما　　از حنا رنگی نگیرد دست استغنای ما
هرگز از دور فلک عشرت نصیب باشد　　سرکہ شد از شور بختی بادہ در مینای ما

در جہان امروز از بس قدر اہل زر بود　　می زند پہلو بہ عیسیٰ هر کہ صاحب خر بود
گرد کین از جانب ما بسکہ در دل ها نشست　　درمیان ما و یاران سد اسکندر بود(۲)

''باغ معانی'' کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ صانع نے تقریباً چالیس سال کی عمر میں وفات پائی (۳)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ۱۲۵

(۲) نتائج الافکار: ص ۴۳۰

(۳) باغ معانی: ۱۲۱

۱۹۔ طالب علی خاں عیشی

علی خاں نام اور تخلص عیشی تھا۔ ان کے والد علی بخش خاں، الماس علی خاں (۱) کے مقربین میں سے تھے۔ عیشی لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ان کی پیدائش تقریباً ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ (۲) عیشی کا زمانہ نواب سعادت علی خاں اور بادشاہ غازی الدین حیدر کا عہد تھا۔ چنانچہ انکے بہت سے مدحیہ قصائد نوابین وامراء کی شان میں ملتے ہیں۔

عیشی کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں کمال حاصل تھا۔ یہ دونوں ہی زبانوں کے پُرگو اور معروف شاعر تھے۔ پہلے اردو میں اشعار کہنے شروع کیے، جب اشعار مقبول ہونے لگے تو بتدریج فارسی میں شعروشاعری کی ابتدا کی۔

تذکرہ نگاروں نے اردو میں انہیں مصحفی کا شاگرد بتایا ہے اور فارسی شعروسخن میں مرزا قتیل کا شاگرد لکھا ہے۔ ''طبقات شعرائے ہند'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

'' ... فارسی کا شعر مرزا قتیل سے کہنا سیکھا اور ریختہ میں مصحفی کا شاگرد ہے ... ''(۳)

اسی طرح تذکرہ ''ریاض الفصحاء'' نے انہیں مرزا قتیل اور میر انشاء اللہ خاں انشاء سے ''خوشہ چینی'' کرنے والوں اور ''فیض'' اٹھانے والوں میں شامل کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

''خوشہ چینی از فیض صحبت انشاء اللہ خاں و مرزا قتیل وغیرہ ھمہ کردہ''(۴)

لیکن عیشی نے اپنی کلیات میں بڑی صراحت کے ساتھ انشاء کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔(۵)

---

(۱) الماس علی خاں، بہو بیگم زوجہ نواب شجاع الدولہ کے مشہور داروغہ تھے۔

(۲) طالب علی خاں عیشی: ص ۴۴۵

(۳) طبقات شعرائے ہند: ص ۳۷۶

(۴) ریاض الفصحاء: ص ۲۲۸

(۵) کلیات فارسی کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء رامپور رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔

عیشی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ لطف سخن خداداد تھا۔ ابتداء سے ہی سخن سنج اور پر گو طبیعت کے مالک تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دونوں زبانوں میں پر زور طبع آزمائی کی اور ذوالسانی شعراء کی فہرست میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف تذکرہ ''بہار بے خزاں'' لکھتے ہیں:

'' ... چہرہ شاھد نظم ونثر بہ مشاطگی طبع معنی آفریں ھر ھفت کردہ وخم و پیچ طرّہ مضامین رنگین پر عذار دل فریب اشعار آراستۂ اوست بہ فارسی وزبان ریختہ شعری گفت وھر دو دل پذیر ومطبوع زبان دانان بودہ۔ در عہدش جملہ شعرا فصیح اللسان اورا می گفتند دیوان مشہور دارد شایقان معنی حرز جانش کردہ اند۔''(۱)

عیشی کی شعر گوئی ''نشتر عشق'' کی عبارت میں:

'' ... ھر چند احوالش معلوم نیست لیکن مضمون عاشقانہ اش از نظر گذشتہ ... ''(۲)

شاعری میں عیشی بنیادی طور پر غزل گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ غزل میں بھی عشقیہ شاعری کو ترجیح دی۔ ان کے اشعار میں حزن ویاس اور غمگینی وافسردگی کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے مثال کے لئے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

حزن ویاس کا منظر:

بسکہ از دل نالہ ھای آتش افشاں میکنم
صبح محشر کردہ ام شب ھای نا ز خویش را

چشم کاھیدۂ من رشک رگ یاقوت است
بسکہ جوشید ز نوک مژۂ خوناب مرا

اس شعر میں کس طرح اپنی حسرتوں کی ناکامی کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

---

(۱) بہار بے خزاں: ص ص ۷۳۔۷۴

(۲) تذکرۂ نشتر عشق (جلد ۳) ص ۱۷۱

داغ حسرت گل از گلشن ما　　آرزو خار سر دامن ما

سیاہ بختی من بین کہ چشم سیر فلک　　خیال سرمہ کند خاک جسم زار مرا

اسی طرح کے دیگر بے شمار اشعار ہیں جن میں رنج وغم، دکھ، افسردگی وتنہائی کا ذکر عیشی نے اپنے عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ میں کیا ہے۔ کہیں کہیں ان کی خوددار اور وضع دار طبیعت کا رنگ بھی جھلکتا ہے:

آشفتہ مزاجم طرب از غم نشناسم
سو زندہ سرم زخم زمرھم نشناسم

عیشی کا کلام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے مسلم الثبوت شعرا مثلاً ابو طالب کلیم، عرفی شیرازی اور امیر خسرو جیسی شخصیات سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے:

دوش کز داغ تو در آتش نشیمن داشتم
از سر سنگ گرم صد دوزخ برامن داشتم
محرم در دم گلی گر باغبان چید از چمن
من زحسرت ماتم مرغاں گلشن داشتم
عیشیا فکرم کجا و نطق اعجاز کلیم
من زبان خامہ در پیش وی الکن داشتم

قصائد میں ایک قصیدہ ''نواب سعادت علی خاں'' کی مدح میں اور پانچ قصائد انکے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی شاہ کی مدح میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیشتر قصائد، مرثیہ اور فارسی رباعیات حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ نیز ائمہ دین کی مدح میں ہیں۔ اس سے اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عیشی مذہباً اثنا عشری تھے کیونکہ سو سے زائد رباعیات صرف حضرت علیؑ کی منقبت میں ہیں۔

عیشی کی مثنویوں کی تعداد پچیس ہے(۱) جس میں اہم ترین ''بہ حقیقت ومجاز'' ''بوصل وھجر'' ''در مذمت دنیا'' وغیرہ ہیں۔ جو فلسفیانہ رنگ میں ہیں۔

---

(۱) طالب علی خاں عیشی، ص ۴۴۵

اسی طرح عیشؔی نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا فارسی دیوان کوئی سولہ ہزار اشعار پر محیط ہے۔کلیات فارسی میں قصائد،غزلیات،مثنویات،رباعیات،قطعات،مقطعات تاریخھای فارسی،ترکیب بنداور تضمینات گویا سبھی اصناف سخن شامل ہیں۔(۱)

عیشؔی نے شعروشاعری کی دنیا میں نہ صرف اپنا نام روشن کیا بلکہ بہت سے شاگرد بھی پیدا کیے۔ مشہور تذکرہ نگار مصحفؔی نے افضح،سرفراز علی بیگ قادرؔ اور مرزا سید علی بیگ گوھرؔ کو ان کا شاگرد لکھا ہے۔(۲)

عیشؔی نے جواں سالی میں بعمر تینتالیس سال ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں شہر لکھنؤ میں وفات پائی۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نصیب من بجز اندوہ جاودانی نیست — بکشوریکہ منم رسم شادمانی نیست

پائے جنوں ز دامن صحرا گذشتہ است — سیلاب جوش گریہ ز دریا گذشتہ است
دریا گریست حسرت وحرماں نخوں طپید — در خاطر یکہ حرف تمنا گذشتہ است

سوختن گرمئی ھنگامہ آواز من است — رقص بسمل اثر زمزمۂ ساز من است
ابر می بارد و گل تازہ بہاری دارد — آہ امروز اگر رہ بہ گلستاں نہ دھند(۳)

---

(۱) تذکرہ ہندی:ص ۱۹۹ اور لکھنؤ کا دبستان شاعری:ص ۸۵۳

(۲) ریاض الفصحاء:ص ۲۲۹

(۳) ریاض الفصحاء:ص ص ۲۲۹۔۲۳۰

۲۰۔ کرتا کرشن فیضؔ

کرتا کرشن نام اور تخلص فیضؔ تھا۔ یہ اپنے عہدے کے مشہور صاحب دیوان شاعر تھے۔ لیکن افسوس کہ ان کے حالات زندگی نہ ملنے کے برابر ہیں۔ فیضؔ کا دیوان ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ سے چھپا تھا۔ لہذا دیوان کی تاریخ طباعت یہ بتاتی ہے کہ فیضؔ شاہان اودھ کے آخری عہد سے وابستہ تھے۔ ان کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس سے چند اشعار یہاں بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں:

خدا وندا! بدہ رحمی بآن سرخیل قاتلہا
کہ رنگین مینکند دست از حنائی خون بسملہا

از خاک درش نور فزودیم جبین را
دادیم جلا ی دگر امروز نگین را

ای فیض بیاد گل رخسار کہ کردی
یک لخت گل از اشک ہمہ روی زمین را

آز مودم گرچہ سنگ کعبہ و تبخانہ را
یافتم دلکش ولی خاک در میخانہ را

شعلہ زن در کوی جانان بوددیشب آشتی
سوخت زآہ آتش افشان فیض شاید خانہ را

رباعی کا ایک نمونہ:

عید رمضان رسید دلہا زطرب
بشگفت برنگ غنچہ از فیض صبا

ہر روز روز ہای عمر تو بود
رونقی دہ روز عید از فضل خدا(۱)

مخمس:

بہار آمد بگلشن رخت غم در ساغر اندازیم
زبرگ گل بروے سبزہ طرح بستر اندازیم

زجور چرخ تا کی خون زمژگان تر اندازیم
بیا ساقی گل افشانیم ومی در ساغر اندازیم

فلک را سقف بشگافیم وطرح دیگر اندازیم(۲)

---

(۱) دیوان فیض: کرتا کرشن فیض، مطبوعہ بیت السلطنت لکھنؤ، محلہ رام نگر لکھنؤ ۱۲۶۱ھ

(۲) ایضاً

۲۱۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی

میرزا کاظم نام، تخلص مبتلا اور ''مردان علی خاں'' خطاب تھا۔ باپ کا نام محمد علی خاں بہادر تھا۔ مبتلا کا اصل وطن مشہد ہے لیکن بقول مؤلف تذکرہ ''روز روشن'' ان کی پیدائش لکھنؤ میں ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۱ء میں ہوئی۔ (۱)

''مرزا کاظم علی نام مشہدی است۔ اصلاً لکھنوی است وطناً درسرکار والی نامدار انجا داد کامرانی میداد'' (۲)

مبتلا کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی چنانچہ ان کی تمام تر علمی صلاحیتوں کی نشو ونما بھی دہلی میں ہوئی لیکن عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً عظیم آباد، مرشد آباد، غازی پور اور بنارس جیسی مشہور جگہوں پر بھی جاتے، آتے رہے۔

مبتلا اس عہد کے ممتاز فارسی شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے بیس سال کی عمر میں اپنے فارسی کلام کو جمع کر کے دیوان کی شکل دی۔ دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار تھے۔ اس کے بعد فارسی شعراء کا ایک تذکرہ بعنوان ''گلدستہ معانی'' بھی ترتیب دیا۔ اس سلسلہ میں ان کے الفاظ ہیں:

''ھنگامی کہ سنین عمر از بست تجاوز کردہ نو بادہ ھائے معنی از گلزار فکر چیدہ دیوانی منظم ساخت ھم درآن ایام تذکرہ مسمی بہ گلدستہ معانی کہ مشتمل بر انتخاب اشعار فارسی سخن پرداز ان قدیم وجدید واختصار بیان احوال آنہاست ترتیب داد'' (۳)

اس کے علاوہ مبتلا نے اردو دیوان اور اردو شعراء کا تذکرہ بعنوان ''گلشن سخن'' بھی فارسی زبان میں ترتیب دیا۔ غرض یہ کہ ان کے انہیں علمی وفکری کارناموں سے ان کے ذوق علم اور فارسی واردو شعر وسخن کا

(۱) تذکرہ روز روشن: ص ۴۵۸۔ ونشتر عشق (جلد ۵) ص ۱۵۰۹

(۲) گلشن ہمیشہ بہار: ص ۲۷۴

(۳) گلشن سخن: ص ص ۳۶۔۳۷

بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''شاہان اودھ'' کے زمانے میں بیشتر شعراء ذولسانی شعرا کی حیثیت رکھتے تھے۔

نواب صفدر کے دربار میں مبتلا کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ نواب نے انہیں پنج ہزاری منصب اور خطاب دونوں سے نوازا، علاوہ ازیں الہ آباد کا نائب السلطنت بھی بنادیا تھا۔

مبتلا نے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں وفات پائی۔(۱) ذیل میں اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

آگاہ تا شوی زغم انتظار ما — نرگس و حد بجائے گیاہ از فرار ما

با آنکہ شد غبار من از آسمان بلند — آگاہ نیستم کہ دلم خاک راہ کیست

تا بہ دشواری دہد بیچارہ جان خویش را — نیم جان بگذاشت جانان ناتواں خویش را
گرکنم گستاخی و نام تو آرم برزبان — شویم از آب حیات ازل دھان خویش را

چرا خجل ز سرکوی یار می گشتم — نمی گداخت غم او گراستخوان مرا

نالہ گر چنین سازد مضطرب غبارم را — دمبدم بہ جنباند تختۂ مزارم را

حیف کہ رفت یار من بی سبب از کنار من — دست نمی توان گرفت عمر گریز پای را
گربا ورت نیاید از تیغ امتحان کن — درتن نماند خونی این صید ناتوا ں را

ناقہ لیلی گزر میکرد گاھی سوی قیس — بخت بدبینم ز آواز درآی بی نصیب

---

(۱) اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء: ص ۳۵

حال مرغ دل نمیدانم چه شد — در قفس مشت پری صیاد داشت
باز فریاد کدامین دل شیدا برخاست — که قیامت بی تعظیم وی از جا برخاست
جزی از دل سرکشته من پرسیدش — هر غباری که به بیند ز صحرا برخاست
بجز درستی مهر از دلم نشد ظاهر — اگرچه سنگ جفایت هزار بار شکست
در آرزوی اینکه به بینیم روی دوست — مردیم و ماند در دل ما آرزوی دوست

دل گم گشته جویم رفته در کوی دل آزاری
ولی ترسم نیا بم دل کنم گم خویش راجایی
زبس آوازه حسنت گرفت اقصای عالم را
بهر دشتی است بجنونی بر شهر زلیخایی

۲۲۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی نام اور مصحفی تخلص تھا۔ باپ کا نام ولی محمد تھا، ان کا تعلق راجپوتوں کے کلال خاندان سے تھا مصحفی کی پیدائش امروہہ کے پاس اکبر پور گاؤں میں ہوئی۔ سال پیدائش کے سلسلے میں مختلف بیانات ہیں۔ پیش نظر شہادتوں کی بنیاد پر ان کا سال ولادت ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء ہے۔ تعلیم و تربیت کے بارے میں خود مصحفی کا بیان ہے:

"اگر از تحصیل علمی من پرسی گویم بتوکہ تکمیل و نظم و نثر آن بہ شاہجہاں آباد درسی سالگی بخوبی میسر آمدہ بود درایامے کہ جلائے وطن کردہ دریں دیار تازہ آمدہ قیام ورزیدم علم عربی یعنی طبیعی و الٰہی و ریاضی از مولوی مستقیم سکنۂ گوپامؤ شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء خواندہ ام ... وقانونچہ را از مولوی مظہر علی کہ در صرف و نحو ثانی ایشان کم پیدا می شود در یافتہ غرض آخر عمر از فضل الٰہی بہ عربیت و تفاسیر قرآن مجید مایہ بہم رسانیدم ..."(۱)

مصحفی اپنی ابتدائی تعلیمات حاصل کرنے کے بعد امروہہ سے دہلی آ گئے تھے اور جیسا کہ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی و فارسی علوم کی تکمیل دہلی کے زمانۂ قیام میں ہوئی۔ جو کچھ کمی یا خامی باقی رہ گئی وہ لکھنؤ پہنچ کر دور ہو گئی۔

مصحفی ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء کے قریب لکھنؤ پہنچے۔ یہاں نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور دہلی سے آنے والے شعراء فیض آباد اور لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی نے یہاں تقریباً ایک سال کا عرصہ گزارا اور دوبارہ دہلی کا رخ کیا۔

دس سال بعد تقریباً ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں مصحفی دوبارہ لکھنؤ آئے۔ کیونکہ دہلی کے حالات اچھے نہیں تھے۔ لکھنؤ میں میر نعیم خاں سے ملازمت کے سلسلہ میں مصحفی وابستہ ہو گئے، نعیم خاں اس وقت لکھنؤ کے ایک امیر تھے۔

---

(۱) تذکرۂ ریاض الفصحاء: ص ص ۳۰۰۔۳۰۱

شگفتہ پیشانی باتمکین و پاکیزہ زندگانی واقع شدہ بر کتب متداولہ نظم ونثر نظری خوب دارد و بہر دو زبان سخن سازی بر روی کار می آرد دیوانی معروف فارسی و سہ دیوان ریختہ مشحون اقسام سخن تا الیوم سرانجام داد و بیرون ازیں دو تذکرہ فارسی و ریختہ ہم نگاشتہ ... "(۱)

چند اشعار بطور نمونہ کلام پیش کئے جاتے ہیں:

من بخو دھم نہ پسندم سخن ناز ترا — کہ مبادا دگرے بشنود آواز ترا
درلگن بال و پرے میزنی اے پروانہ — امتحاں ساختہ ام طاقت پرواز ترا

نمی دانم بسو رائے کہ دریا چشم تر دارد — کہ درویشانہ سیاح است و کشتی بر کمر دارد

بوقت گریہ آید بوی تاثیری زھر اشکم — کہ من می گریم واین گریہ اختر درگز ردارد
نظر کردہ برویت چو رسد زریشم — لذت حسن تو از دیدۂ قاصد گیرم
وہ کہ با ضعف تن افتادہ کنوں کار مرا — ھم چو آئینہ بود پشت بدیوار مرا
شد فرا موش تو شاید غم شادی مرگم — اے کہ در خواب دھی بوسہ رخسار مرا
یاد عہد یکہ بہ تقریب گدائی گاھی — گزری بود بکوی تو شب تار مرا
ھرگز نہ آسماں نہ زمیں می کشد مرا — از من تو رخ نہفتۂ ایں می کشد مرا
صیاد من مرابہ قفس دید مضطرب — اما ترجمے بہ گرفتار یم نہ کرد
از دیگراں چہ شکوہ کنم درفراق او — ھمسایہ ھم عبادت بیاریم نہ کرد
دردا کہ دو چارم شدہ یار آفت جانی — گل چہرہ بتے کم نگہے جان جہانی
صاحب نظرے آئینۂ ناز بدستے — خود بیں صنے کافر زناز میانے
درآرزوئے ھم چو خودی رفتہ زخویشی — سرمست مئے عشق وزکف دادہ عنانی (۲)

---

(۱) مجموعۂ نغز (جلد۲) ص ۱۸۹

(۲) ریاض الفصحاء: ص ص ۳۰۲_۳۰۶

۲۳۔ مرزا فاخر مکیںؔ

مرزا محمد فاخر نام اور تخلص ''مکیںؔ'' تھا۔ بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرہ میں فاخر مکیںؔ کو بڑے عمدہ خطابات دیے ہیں اور تمام تذکرے میں ''جناب ارشاد مآب'' کہہ کر مخاطب کیا ہے، لکھتے ہیں:

> مہر برج فضل وکمال، ماہ سپہر عز وجلال، شمع انجمن، خلوت نشینان، اورنگ نشین محفل خلوت گزینان، فخر زمان وزمین میرزا ... ''(۱)

مکیںؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے تاریخ تولد ''صاحبزادہ بابخت وجاہ'' سے نکلتی ہے۔ ان کا خاندانی سلسلہ چند واسطوں سے ہوتا ہوا ''ملا قاسم کاہی'' تک پہنچتا ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تقریباً بیس سال کی عمر میں شعر وشاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس فن میں ان کے استاد مرزا عظیما اکسیرؔ تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء میں مکیںؔ لکھنؤ آئے اور پھر یہیں مقیم ہو گئے۔ حسین قلی خاں لکھتے ہیں:

> ''بعد تخریب دہلی از ورود موکب احمد شاہ درّانی خرامیدہ بہ لکھنور سیدہ بود و باش گرفت واز ہمت عالی واستغنای مزاج خانہ نشین شد'' (۲)

مولانا آزادؔ لکھتے ہیں:

> مرزا فاخر مکیںؔ اصل میں کشمیری تھے اول، فتوت حسین خاں کشمیری سے اصلاح لیتے تھے پھر عظیمائے کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ ان کے کمال میں کلام کی جگہ نہیں صحت الفاظ اور تحقیق لغت میں بڑی کوشش کی تھی ... سینکڑوں شاگرد غریب اور تونگر لکھنؤ اور اطراف میں ہو گئے (۳)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۸۱

(۲) تذکرہ نشتر عشق (جلد ۵) حسین قلی خاں عظیم آبادی، ص ۱۵۱۲

(۳) آب حیات: ص ۱۶۰

لکھنؤ میں آئے تو نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اس وقت دربار میں ان کیہم عصر مرزا رفیع سوداؔ تھے۔ جن سے مکینؔ کی کبھی نہیں بنتی تھی اکثر جھگڑوں کی نوبت دربار تک جا پہنچتی اور پھر نواب موصوف فیصلہ کرتے تھے۔

مکینؔ کا شمار فارسی زبان کے اول درجہ کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔ ان کا کلام نہایت بلند پائے کا ہے۔ شہرت کا حال یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور دوسرے ملکوں میں بھی ان کی شہرت کے چرچے ہوئے۔ ہندی لکھتے ہیں:

''آوازۂ فضل و کمال آنجناب از ھند تا با ایران رسیدہ و خلقی از دور و نزدیک آرزومند ملازمت آنحضرت گردیدہ صفات ذات بابرکات در دفترھا گنجائش ندارد، دیوان بلاغت ترجمان قریب دوازدہ ھزار بیست خواہد بود'' (۱)

اسی طرح ''تذکرۂ نشترِ عشق'' میں مؤلف کی رائے ہے کہ:

''کلام نمکین از آن فاخر مکان و مکین خاطر نشان و دل نشین عالی قیاسان دقیقہ چین و رنگین خیالان باریک بین است ...'' (۲)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

کیفیت صبح و خبر شام چہ پرسی — آگاہ نیم بی تو ز پیشین و پسین ھم
ھم یار سفر کردہ و ھم صبر نماندہ — افسوس کہ از دست من آن رفتہ واین ھم

رباعی:

از بزم زمانہ سوز و سازی دارم — روزی کو تہ شبی درازی دارم
پروانہ اگرچہ نیستم می سوزم — ھر چند نیم شمع گدازی دارم

بگذر از خود کہ نباشد سفری بہتر ازیں — بی خبر باش کہ نبود خبری بہتر ازیں
از در دوست بدروازۂ جنت نہ روم — دردو عالم نبود ھیچ دری بہتر ازیں

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۸۲

(۲) تذکرۂ نشترِ عشق (جلد ۵): ص ۱۵۱۶

لخت دل می خورم و خون جگری نوشم
نیست درخوان فلک ماحضری بهتر ازیں

هر قدر خوبی و نیکیست تو داری با من
قدری بهتر ازیں شو قدری بهتر ازیں

ای روی تو آئینه جمال بشریرا
حیران رخت دیده چه حور و چه پریرا

بر خاک نشانیده قدت سر و صنوبر
افگنده خرام تو زپا کبک دریرا

گشتم زبد و نیک خبردار و خرابم
از من برسانید خبربی خبریرا

مکین گوشه نشیں را در گرچه پیش آید
که یک نفس نه نشیند درون خانهٔ خویش

نالهٔ تا کی چو جرس متصل آید بیرون
کاش از سینهٔ صد چاک دل آید بیرون

۲۴۔ میر قمر الدین منتؔ

میر قمر الدین نام اور تخلص منتؔ تھا۔ اصلاً سیّد تھے۔ سلسلہ نسب ماں کی طرف سے سید جلال الدین بخاری تک پہنچتا ہے۔ ان کی ولادت قصبہ سونی پت میں ہوئی۔ دہلی میں پرورش و پرداخت ہوئی۔ مؤلف 'تذکرہ نشتر عشق'' لکھتا ہے:

''میر قمر الدین سید مشہدی نژاد و از اولاد ناصر الدین بود کہ مزارش در قصبہ سونی پت مرجع خلایق خاص و عام است نسب شریفش بہ چہاردہ واسطہ بسید جلال بن سید عضد یزدی کہ احوالش مفصل در تذکرۂ کاشی مرقوم است۔ میر سید قصبۂ سونی پت بودہ و در خطّہ پک دہلی نشو و نما یافتہ بتقریب قرابت و پیوندھا تربیت در خاندان شاہ ولی اللہ محدث گرفتہ و تحصیل علوم و سند حدیث از خدمت مولوی شاہ عبد العزیز ولد ارشد شاہ ولی اللہ موحوم کہ امروز بکمال مستعدی و تحقیقات کوس یکتایی می زند ساختہ'' (۱)

چنانچہ علوم و فنون کی تمام درسی کتابیں شاہ ولی اللہ موصوف سے پڑھیں اور ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے۔ جب تک دہلی میں رہے سنّی مذہب کے پابند رہے۔ طریقۂ چشتیہ میں مولانا فخر الدین سے بیعت تھی لیکن جب لکھنؤ پہنچے تو شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔

فارسی زبان میں میر شمس الدین فقیرؔ سے اصلاح لی اور اردو میں شیخ قیام الدین قائمؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں لکھنؤ آئے اور نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں بہت سے قصائد کہے اور خاطر خواہ صلے بھی حاصل کئے۔ بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں یہ لکھنؤ سے کلکتہ روانہ ہوئے وہاں پر عماد الدولہ لارڈ ہیسٹنگز کی تعریف میں قصائد لکھے اور پیش کیے۔ ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں گورنر جنرل نے انہیں آصف جاہ ثانی کی خدمت میں حیدر آباد روانہ کیا وہاں پہنچ کر منتؔ نے نواب مذکور کی مدح میں قصیدہ پیش کیا جس کے صلہ میں دس ہزار روپیہ نقد اور دو سو ماہوار کا منصب

(۱) تذکرۂ نشتر عشق (جلد ۵) ص ۱۵۱۴

پایا۔ حیدر آباد سے فائز المرام ہوکر پھر لکھنؤ آئے اور کچھ عرصہ مہاراجہ ٹکیت رائے کی مصاحبت میں گزار کر دوبارہ کلکتہ روانہ ہوگئے اور وہیں پر ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء میں انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر مختلف تذکروں کے مطابق انچاس (۴۹) سال تھی۔

''بعمر چہل ونہ سالگی ازیں جہاں درگذشت واشعار آبدار بسیار ودیگر تصانیف او بے شمار است''(۱)

فارسی زبان پر ان کو قدرت کمال حاصل تھا۔ تصانیف میں ضخیم دیوان فارسی (۲) اور مجموعۂ مثنویات کے علاوہ نثر میں ایک کتاب ''گلستان سعدی'' کے جواب میں لکھی تھی جس کا نام ''شکرستان'' رکھا۔ ان کی ایک مثنوی سے جسکا عنوان ''چمنستان'' ہے، دو تین شعر نقل کیے جاتے ہیں جس میں انھوں نے اپنی تصنیفات کی شرح بیان کی ہے۔

ابیات دریں عم در مثنوی گفتہ ام — بہ آئین و طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عدد میرسد — شمار قصائد بصد میر سد
بود شعر من در غزل سی ھزار — زپا نصد رباعی گرفتم شمار (۳)

ان کے کل اشعار کی تعداد تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار کے قریب ہے۔ اشعار نہایت عمدہ فصیح اور انداز بیان نہایت ہی سادہ و سلیس ہے جس کا اعتراف بیشتر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ مثلاً مصحفی کہتے ہیں:

''تصانیف بسیار از و بر صفحۂ روزگار است ... شاعر مسلم الثبوت فارسی است''(۴)

ایک دوسرے تذکرہ کے مطابق:

''مرد صاحب رتبت سخن سنج شیریں گفتار شاعر عذوبت شعار نکتہ پرداز فصاحت نشان معنی طراز بلاغت توامان بود بر کتب متداولہ نظم ونثر نظر مستوفی داشت ودر شعر گوئی بیشتر ھمت بہ صنائع بدائع می گماشت بیرون از دیوان مردف فارسی کہ مشتمل انواع سخن است''(۵)

---

(۱) گلشن ہمیشۂ بہار: ص ۳۰۰

(۲) دیوان کا قلمی نسخہ ایوان غالب دہلی میں موجود ہے، نمبر: ف 51021ء 091۔م 41دی

(۳) گلشن بے خار: ص ۲۷۴

(۴) تذکرۂ ہندی: ص ۲۷۶

(۵) مجموعۂ نغز (جلد ۲) ص ۲۱۵

مرزا علی لطفؔ کی رائے میں:

''صفائی بندش وحسن بیان میں فی الحقیقت استاد اور موشگافی معنی میں قلم اس کا رشک خامۂ بہزاد زبان فارسی میں کلک عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے ... ''(۱)

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

باز خواھم مد داز طالع خود تا شب وصل — سر خود برقدمت بینم و برسر قدمت

سر خود برقدمت نہم سورم و از شرم ھنوز — آب گردم کہ شد از گریۂ من تر قدمت

بگفتمش کہ دلم را بجان نگہداری — بخندہ گفت کہ منت خدا نگہدار است

زھر غم ھجر کار خود کرد — دردا کہ امید زیستن نیست

رنگ وصلش امشب ای مشاطہ بہر من بہ بند — دست و پایش را بتعریب (۲) حنا بستن بہ بند

آہ گرم و دم سردی داری — میتوان یافت کہ دردی داری

بیوفا درد تو دارد منت — تو بخاطرز کہ دردی داری

---

(۱) گلشن ہند: ص ۱۷۱

(۲) اصل لفظ تقریب ہے (سفینۂ ہندی: ص ۱۹۳)

۲۵۔موجی رام موجی لکھنوی

نام موجی رام اور تخلص موجی تھا۔ان کے والد دیوان چھتر پت رائے کا تعلق کائیستھ سریواستو قوم سے تھا۔یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور نواب حسین علی خاں خلف نواب سعادت علی خاں کے یہاں ملازم تھے۔

موجی کے تاریخ تولد کا ذکر تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا ہے۔انکی ابتدائی تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی۔بڑے ہونے پر موجی نے قانون گوئی کا پیشہ اختیار کیا لکھنؤ کے قصبہ سانڈی میں یہ قانون گو ہوئے۔

موجی شعروادب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے،خود بھی عالم تھے اور علماء وشعراء کے قدردان بھی تھے۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔شاعری کے میدان میں غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔(۱) مصحفی نے منشی موجی رام کے بارے میں لکھا ہے:

''لالہ موجی رام موجی تخلص قوم کائیستھ سری باسیۃ ساکن سانڈی جوان غریب ومہذب الاخلاق است معرفت شیخ محمد عیسیٰ تہا بحلقۂ شاگردی این عاصی درآمدۂ شعرزبان ہندی و فارسی ہر دو میگوید۔اگر لطافت اصلاح بہ فہمش درآمد بجائے خواہد رسید عمرش سی و چہار سالہ خواھد بود''(۲)

گپت سہائے سریواستو نے انہیں فارسی کا صاحب دیوان شاعر کہا ہے۔ان کا کلام بیشتر عشق وعاشقی کے جذبات پر مبنی نظر آتا ہے اور اس میں کہیں کہیں تصوفانہ جھلک بھی نمایاں ہے۔طرز بیان اچھا ہے،وجہ یہ ہے کہ انھیں زبان پر خاصی قدرت حاصل تھی:

کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

ای صبا سوی قفس گاھی گزر می کردہ باش　　بلبل شوریدہ را از گل خبر می کردہ باش

---

(۱) اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ:ص ۱۵۰

(۲) ریاض الفصحاء:ص ۳۰۴

درھوایت گفتمش چوں باد سرگرداں شدم　　گفت تا خاکت خورد خاک کی بسرمی کردہ باش
منت ساقی مکش از بھریک جام شراب　　جام دل لبریز از خون جگری کردہ باش
گرم جوشی ھائے مجبوریاں بود نقشی برآں　　موجیا زیں سرد مہراں الحذر می کردہ باش

شد دل دیوانۂ من رام ھند و زادۂ
کافری آتش پرست دیں بدنیا دادۂ
ست عہدی سخت گوئی پیش چشمی کم نگاہ
شوخ پرکاری بمعنی و بصورت سادۂ

نسیم صبح شاید از سر کوئی تو می آید　　زھر گل در مشام جان من بوئی تو می آید
ازاں بر طالع زلف رسایت رشکہا دارم　　کہ تا از شانہ می افتد بہ پہلوی تو می آید
فغاں کم کن خمش موجی قیامت می شود برپا　　صدائے صور اسرافیل ازسوئے تو می آید(۱)

سریواستوان کی شاعری کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں:

''تشبیہ واستعارہ کی نزاکت اور مضمون آفرینی کی لطافت سے کلام خالی نہیں ہے سب سے بڑا وصف ان کے کلام کا یہ ہے کہ وہ اس دور کے لکھنؤ کی شاعری کے عام معائب سے پاک ہے ان کے کلام میں ابتذال کا شائبہ نہیں ملتا''(۲)

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۳۱۸

(۲) اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ: ص ۱۵۲

۲۶۔ میر تقی میرؔ

محمد تقی نام اور تخلص ''میرؔ'' تھا۔ تذکروں کے مطابق ان کے والد میر عبداللہ کا شمار اکبر آباد کے شرفا میں ہوتا تھا۔ میرؔ کی پیدائش آگرہ کی تھی۔ سنہ ولادت اواخر ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۳ء ہے۔(۱) دہلی میں میرؔ کا مستقل قیام نادر شاہ کی واپسی (۲) کے بعد ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد دہلی آ گئے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے رکھتے تھے۔ چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزوؔ کی جانب رجوع ہوئے، جو اس وقت استاد زمانہ تھے اور میرؔ سے آرزوؔ کا دور کا رشتہ بھی تھا۔(۳)

دہلی میں میرؔ نے اپنی زندگی کے تقریباً چوالیس سال گزارے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں میرؔ کو چین سے بیٹھنے کا موقع کم ہی ملا۔ بیشتر اوقات تنگی و ترشی میں گزارے۔ اچھی نوکریوں کی تلاش کے سلسلے میں دہلی سے اکثر باہر جاتے۔ سرہند، فرخ آباد، راجپوتانہ، اجمیر، برسانہ، کھمبیر، آگرہ اور سکرتال وغیرہ جیسے مقامات کی مسافتوں میں برسوں سرگرداں رہے۔ معاشی الجھنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ دہلی کی سیاسی حالت بھی ان دنوں کچھ اچھی نہ تھی۔ مغلیہ سلطنت انحطاط پذیر تھی۔ ۶۱ سال کی عمر ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں میرؔ نے لکھنؤ کے سفر کا ارادہ کیا۔

لکھنؤ آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا نواب موصوف کی شاہانہ فیاضیوں کی بدولت میرؔ کو لکھنؤ میں وہ سب کچھ ملا جس کے لئے دہلی میں تمام عمر پریشان رہے۔

نواب نے میرؔ کو ان کے مرتبہ کے شایان شان عزت دی۔ لکھنؤ میں میرؔ نے اپنی زندگی کے

---

(۱) کلیات میر (مقدمہ)

(۲) نادری لشکر کی واپسی ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہوئی تھی۔

(۳) رشتہ میں سراج الدین خاں آرزوؔ، میرؔ کے سوتیلے ماموں تھے۔ دراصل میر، میر عبداللہ کی پہلی بیوی سے تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد میر عبداللہ نے سراج الدین آرزوؔ کی بہن سے عقد کر لیا تھا۔ (آب حیات: ص ۱۹۴)

انتیس سال گزار کر نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ سنہ وفات ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء ہے اور لکھنؤ کے محلّہ ''اکھاڑا بھیم'' کے قبرستان میں دفن کئے گئے

اگر چہ میرؔ اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد اور شاعر ہیں لیکن ان کا فارسی کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی فارسی شاعری زبان و بیان، تخیل کی بلند پروازی، معنی آفرینی اور نازک خیالی کے اعتبار سے اپنا ایک خاص اسلوب رکھتی ہے۔ اکثر مضامین عاشقانہ اور جذباتی ہیں جنہیں سادہ اور سلیس زبان میں ادا کیا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان میں سب سے نمایاں یاس وحسرت کے مضامین ہیں۔ اس کے بعد تصوف اور عام عاشقانہ مضامین، جن میں اکثر و بیشتر جگہوں پر دنیا کی بے ثباتی و ناپائداری کا ذکر کیا ہے اور بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کا مضمون اردو میں بھی ادا کیا گیا ہے۔

دراصل اس عہد میں چونکہ فارسی شعر گوئی کا رواج بتدریج کم ہوتا جارہا تھا اس لئے میرؔ کی توجہ فارسی کے بجائے اردو کی طرف زیادہ ہوتی گئی۔ ان کا فارسی کلام، اردو کلام کے مقابلے میں کم ہے۔ ان کے فارسی دیوان (۱) میں کوئی تین ہزار اشعار ہیں جبکہ اردو کے چھ دواوین ہیں۔

میرؔ کو اپنی استادی پر بڑا ناز تھا اور شاعری میں وہ کسی کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ انہیں اپنی کمزوریوں کا بھی اعتراف ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ اشعار کتنے جالب ہیں۔

میرؔ بر شعر تو خود مکن ایں ہمہ ناز
دیگراں نیز غزل را بصفا می گویند

ایک دوسرا شعر:

خود ستائی خود سری معیوب میدانیم ما ورنہ طرز شعر گفتن خوب می دانیم ما

میرؔ کی ایک خصوصیت جوان کے کلام میں نمایاں ہے وہ ان کی نازک مزاجی ہے جسے اکثر جگہوں پر بد دماغی کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرؔ کے یہ اشعار دیکھئے۔

---

(۱) مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں سبحان اللہ کلکشن میں ایک پرانی قلمی بیاض ہے جو اکیس اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر اوسطاً ستر شعر تحریر ہیں۔ اس حساب سے کل اشعار کی تعداد تقریباً دو ہزار نو سو چالیس ہوتی ہے۔ اس میں بیشتر غزلیات ہیں جنکی تعداد ۱۸۴ ہے چند رباعیات اور ایک ناتمام مثنوی ہے۔ کتاب آخر سے ناقص ہے۔

میر بابا آشنائی مشکل است　　در نزاکت چوں مزاج دلبریم

ایک دوسرا شعر:

طرز گفتار میؔر را دیدم　　بے دماغانہ گفتگوئے داشت

میؔر کے کلام کی ایک خصوصیت، تصوف کا وہ رنگ ہے جو ہمیں نمایاں طور پر ملتا ہے، ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جلوہ ھا داریم و ازھر جلوہ بیخود گشتہ ایم　　خود تماشائیم و خود محو تماشا گشتہ ایم

بیا اے میر در راہ محبت خویش را گم کن　　اگر خواھی کہ در یابی نشان بے نشاناں را

رفتۂ شوق و شود دیر وحرم راہگزار　　طوف کن میؔر بہ ہر در بسجود آمدہ را

اسی مضمون میں ایک رباعی ملاحظہ ہو:

مرا از دیر وحرم مطلبی نہ بود اے شوخ　　ز فرط شوق تلاش تو در بدر بودم

خیال دیر و حرم را زسر بدر کردم　　بسجدہ عمر دریں خانہ سر بسر کردم

صحبت شیخ ومن رند چساں درگیرد　　عشق راہ دگر وعقل طریق دگر است

بجویم ترا ھر کجا تا کجا　　بجائے رساں جستجوئے مرا

ریاکاری اور ظاہر پرستی کو میؔر نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے ظاہری عبادت کو عشق حقیقی کی طرف پہلا قدم بتایا ہے ان کا یہ شعر دیکھیے:

مقصد از طوف حرم کے حاصل است
کعبہ از راھش نخستیں منزل است

از بس شنوم هر شب افسانۂ چشم تو
دانند مرا مردم دیوانۂ چشم تو
بیخود شود از مستی بیند چو کسی سویش
یارب چہ اثر دارد پیمانۂ چشم تو
بیخود فتد و خیزد ،پیش تو زبیتابی
گردید زبس والی مستانۂ چشم تو

والی کا سال وفات ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء ہے۔

۲۸۔ بھگوان داس ہندیؔ

نام بھگوان داس اور تخلص ہندیؔ تھا۔ ابتدا میں ''بسمل'' تخلص تھا۔ بعد میں ہندیؔ کہلائے۔ ان کا تاریخی نام ''صبی جوان بخت'' (۱) تھا، یعنی تاریخ پیدائش ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء نکلتی ہے۔ ان کا تعلق کایستھ قوم سے تھا۔ ان کے بزرگوں کا اصلی وطن صوبہ کالپی تھا جو مگدھ کی ریاست تھی۔ ہندیؔ کی پیدائش صدر پور نامی ایک گاؤں میں ہوئی۔ اس زمانے میں نواب برہان الملک اودھ کے حکمراں تھے۔ نواب موصوف نے ہندیؔ کے چچا بلاقی داس کو اودھ بلا کر اپنی سرکار سے منسلک کر لیا۔ اس درمیان ہندی اپنے باپ دلپد داس کے ہمراہ اودھ کی جانب روانہ ہوئے۔ ہندیؔ کی تعلیم و تربیت اودھ میں ہوئی ''سفینۂ ہندی'' میں اپنے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بعد رسیدن بسن تمیز از خدمت افضل الفضلاء مولوی سید یوسف سہارنپوری تحصیل صرف ونحو و کتب متداولہ فارسی و دیگر رسائل علوم نمودہ مایل بانتخاب دواوین اساتذہ و مطالعۂ کتب تاریخ و تذکرہ ھا گذشتہ بگفتن شعر زبان کشودہ ۔۔۔ ''(۲)

ہندیؔ عہد آصفی میں خیر آباد کے علاقہ میں تھے اور وہیں جاگیر وغیرہ کے انتظامی امور سے منسلک تھے۔ پہلے راجہ ندی سنگھ کے دیوان تھے، ان کی وفات کے بعد راجہ پڑچند کی مصاحبت میں رہے جب پڑچند کی وفات ہوگئی تو معتمد الدولہ مہاراجہ ٹکیت رائے کی ملازمت میں آ گئے۔

ہندیؔ کو شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہ ''عہد آصفی'' کے مشہور و معروف شعراء میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے استاد مرزا فاخر مکینؔ تھے۔ ہندیؔ کے آثار و باقیات میں تین مثنوی ایک ''سلسلہ المحبت'' بروزن ''سلسلۃ الذھب'' دوسری ''مظہر الانوار'' بروزن ''مخزن الاسرار'' و تیسری ''بھاگوت'' مسمّٰی بہ ''مہر ضیا'' بروزن ''یوسف زلیخا'' لکھی۔ اور دو دیوان ایک ''شوقیہ'' دوسرے ''ذوقیہ'' مع قصائد و

---

(۱) سفینۂ ہندی (مقدمہ)

(۲) ایضاً، ص ۲۴۲

ترجیع بند واقسام شعر ترتیب دیا۔

ان کے دواوین غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ہیں۔ان کی رباعی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے نواب آصف الدولہ کی تعریف کی ہے:

ای آنکہ ببوست مہ از عجز رکاب　　خوشید زبیم تیغ تو درتب و تاب

دریا ھمہ آب گشتہ از بخشش تو　　آوردہ بہانہ درمیاں از در ناب(۱)

نثر میں ایک ضخیم تذکرہ ''حدیقہ ہندی'' ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں لکھا۔جس میں تمام ماضی وحال کے فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے لیکن اب وہ تذکرہ مفقود ہے۔اس کے بعد ایک دوسرا تذکرہ ''سفینۂ ہندی'' تالیف کیا۔یہ ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تک کے تمام فارسی شعراء کا احاطہ کرتا ہے۔تاریخی نقطۂ نظر سے یہ تذکرہ بڑا اہم اور مستند ہے۔اس میں نہ صرف شعراء کے احوال کا جائزہ ہے بلکہ ان کے علمی، سیاسی اور ملکی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔تذکرے کے علاوہ سوانح رسول اکرمؐ اور بارہ اماموں کے حالات بھی ہندیؔ نے بزبان فارسی قلمبند کئے۔

ہندیؔ کے فارسی کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

رفتی و سوخت دل از داغ جدائی باز آ
آتش افتاد بجاں بی تو کجائی باز آ

ھر نفس نور ازبنا گوش تو گیرد وام صبح
پرتو روی ترا کردند خلقی نام صبح
جلوۂ حسن ترا نازم کہ شب وقت خرام
مید مد از عکس رخسار تو در ھر گام صبح

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۲۵۹

بالم شکستہ از قفس آزاد می کند
صیاد سنگدل ستم ایجاد می کند
چوں لالہ ام بدل گل داغی شگفتہ است
از خار خار عشق تو باغی شگفتہ است

غزل کے چند اشعار:

یکجا شدن بدر و ھلال امر محال است — جز ابروی وروی تو کہ بدر است وھلال است
ای کاش کہ ھر خار وخسی را نہ گزارند — در گلشن کوی تو کہ فردوس مثال است
ترسابچہ دوش چہ خوش گفت بہ مستی — کاندر رمضاں بادۂ گلرنگ حلال است
تا گشتہ جدا دست من از گردن ساقی — برگردن من زندگی خویش و بال است

قطعہ:

خصم دلت کہ خار درخت شقاوت است — در باغ رزم تو چو کشد مثل خار تیغ
آں قدرت خدای توی ای ابر مکرمت — کہ افتد ز آسماں بسرش برق وار تیغ

قصیدہ کے دو اشعار:

یک صبحدم جمال تو بیند گر آفتاب
از جیب صبح سر نکشد دیگر آفتاب
تا خطبۂ ثنائی خجالت بیاں کند
ھر صبح می رود بسر منبر آفتاب

ان کے اشعار سے انداز ہوتا ہے کہ کیا قصیدہ، کیا غزل اور کیا رباعی ہر صنف سخن میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

(حصہ دوم) مشہور و معروف شعراء

۱۔ قاضی محمد صادق اخترؔ
۲۔ واجد علی شاہ اخترؔ
۳۔ گوربخش ادیبؔ
۴۔ منشی گردھاری لال اسدؔ
۵۔ مظفر علی خاں اسیرؔ
۶۔ راجہ الفت رای الفتؔ
۷۔ شیخ شرف الدین ملولؔ، الھامؔ
۸۔ منشی لال چند انسؔ
۹۔ شیر افگن باسطیؔ
۱۰۔ سعادت خاں برہانؔ الملک
۱۱۔ خواجہ عبدالعزیز بسملؔ
۱۲۔ شیخ بقاء اللہ بقاءؔ
۱۳۔ منشی جوگل کشور بہارؔ
۱۴۔ منشی مکھن لال بہجتؔ
۱۵۔ پنڈت سومناتھ مبعیٰ بیخودؔ
۱۶۔ رای سناتھ سنگھ بیدارؔ
۱۷۔ میدی لعل بیمارؔ
۱۸۔ نصیر الدین حیدر پادشہ
۱۹۔ عبدالعلی تحسینؔ
۲۰۔ مرزا محمد تقی ترقیؔ
۲۱۔ ٹیکا رام تسلیؔ
۲۲۔ سلام اللہ خاں تسلیمؔ
۲۳۔ راجہ جے گوپال سنگھ بہادر ثاقبؔ
۲۴۔ پرشادی لال جواہرؔ
۲۵۔ جواہر سنگھ جوہرؔ
۲۶۔ حاجبؔ
۲۷۔ لالہ چنی لال حریفؔ
۲۸۔ جعفر علی حسرتؔ
۲۹۔ خواجہ محمد حسن، حسنؔ
۳۰۔ میر غلام حسن، حسنؔ
۳۱۔ مرزا باقر حقیرؔ
۳۲۔ مولوی محمد عوض حکمتؔ
۳۳۔ میر حیدر علی حیرانؔ
۳۴۔ منشی خیالی رام خیالیؔ
۳۵۔ مکھن لال رایؔ
۳۶۔ رای کھیم نرائن رندؔ

۳۷۔ میر جعفر روحی
۳۸۔ روشن لال روشن
۳۹۔ کریم داد خاں رونق
۴۰۔ لالہ شتاب رای زار
۴۱۔ میر اولاد علی زایر
۴۲۔ شیخ فضل حق ساحر
۴۳۔ لالہ سکھراج سبقت
۴۴۔ شیخ رضی الدین سروری
۴۵۔ رای بال گوبند شاد
۴۶۔ دیبی پرشاد شاد
۴۷۔ میر سید محمد شاعر بلگرامی
۴۸۔ پیہم ناتھ شیدا
۴۹۔ میر سید عبدالعلی طالع
۵۰۔ مرزا رمضان بیگ طپاں
۵۱۔ عارف علی شاہ عارف
۵۲۔ شیخ محمد عاشق، عاشق
۵۳۔ منشی رائے طوطا رام عاصی
۵۴۔ شاہ عالم خاں، عالم
۵۵۔ شیخ محمد فاخر
۵۶۔ شیخ فیض محمد فایض
۵۷۔ مرزا محمد حسن قتیل
۵۸۔ کشن چند قریب
۵۹۔ میر نثار علی قرین
۶۰۔ حکیم حیات اللہ قلاش
۶۱۔ سید مدد علی مائل
۶۲۔ شیخ دوندی مایل
۶۳۔ نواب محبت خاں، محبت
۶۴۔ ستیل داس مختار
۶۵۔ لالہ رام بخش مطبع
۶۶۔ کاظم بیگ خاں ممکن
۶۷۔ کنور درگا پرشاد مہر
۶۸۔ شیخ امام بخش ناسخ
۶۹۔ شیخ غلام نبی بلگرامی
۷۰۔ شیخ بہادر علی وامق
۷۱۔ نول رائے وفا
۷۲۔ مرزا ابوعلی ہاتف

۱۔ قاضی محمد صادق اخترؔ

قاضی محمد صادق نام اور تخلص ''اخترؔ'' تھا۔ انکے والد قاضی محمد لعل ہوگلی کے رہنے والے تھے۔ خود اخترؔ کی پیدائش بھی ہوگلی میں ہوئی۔ ''خوش معرکۂ زیبا'' میں ناصرؔ کا بیان ہے کہ اخترؔ کا سلسلہ نسب خواجہ عبد اللہ احرار تک پہنچتا ہے اور ان کے بزرگ ترکستان سے دہلی اور دہلی سے بنگال گئے تھے۔ (۱)

ان کا سال ولادت لفظ ''اختر'' سے ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء نکلتا ہے۔ اخترؔ کے بزرگ قاضی اودھ اور صدر الصدور کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اختر خود بھی اکثر علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ نثر و نظم میں خاص مہارت حاصل تھی۔ شاعری میں مرزا قتیلؔ سے شاگردی حاصل کی۔ تذکروں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس سنہ میں ان کا لکھنؤ آنا ہوا البتہ یہ بات ضرور واضح ہے کہ یہ دو بار لکھنؤ آئے۔ پہلی مرتبہ جب آئے تو اودھ کے رزیڈینٹ کے منشی بھی رہے اور پھر وطن واپس چلے گئے۔ (۲)

غازی الدین حیدر نے انہیں دوبارہ طلب کیا اور تصنیف و تالیف کی خدمت پر رکھا اور ہزار روپیہ تنخواہ بھی مقرر کردی۔ ساتھ ہی بادشاہ نے ''ملک الشعراء'' کے خطاب سے بھی نوازا۔ (۳)

ان کی تصنیفات میں تذکرۂ آفتاب عالمتاب، بہار اقبال، مفید المستفید، محامد حیدریہ، بہار بے خزاں اور لوامع النور مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دو دیوان اردو اور فارسی کے ہیں۔

غازی الدین حیدر کے انتقال ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء کے بعد اختر ۱۹ سال کانپور میں تحصیل دار رہے، اس کے بعد لکھنؤ واپس آگئے۔ اخیر زمانے تک لکھنؤ میں ہی رہے اور اسے ہی اپنا وطن بنالیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں بھی اخترؔ نے خوشحالی کے ساتھ بسر کی۔ غدر کے بعد ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا۔

---

(۱) خوش معرکۂ زیبا: (جلد ۱) ص ۳۰۱

(۲) لکھنویات ادیب: ص ۴۷

(۳) شمع انجمن: ص ۶۳

اختؔر نے اپنے سرپرست بادشاہ غازی الدین حیدر کی مدح میں ''محامد حیدری'' نام کی ایک کتاب فارسی نثر میں تصنیف کی جو کہ نہایت شگفتہ اور فصیح زبان میں ہے۔ بعد میں واجد علی شاہ نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ اختؔر نے اپنی سوانح عمری ''صبح صادق'' کے نام سے فارسی زبان میں لکھی۔ فارسی شعراء کا ایک تذکرہ بنام ''ہفت اختؔر'' بھی انکی تالیفات میں شامل ہے۔ ایک تذکرہ نویس کے الفاظ میں:

''اختؔر صاحب دیوان وتذکرہ ودیگر تصانیف کثیرہ نظم وفارسی واردو ۔۔۔ ''(۱)

طوفانؔ لکھتے ہیں:

''فارسی وہندی ہر دو زبان بہتر میداند''(۲)

صاحب ''سخن شعراء کا بیان ہے:

''شاگرد مرزا قتیل لکھنؤ میں ہمیشہ عہدۂ عمدہ پر مامور رہے تذکرہ آفتاب عالمتاب ومحامد حیدری ودیوان فارسی وریختہ وگنج برنج وغیرہ بہت سی تالیفات مشہور ہیں۔ زبان فارسی خوب جانتے تھے۔''(۳)

---

(۱) تذکرۂ نادر: ص ۲۱

(۲) تذکرۂ شعراء: ص ۱۶

(۳) سخن شعراء: ص ص ۱۶۔۱۷

۲۔ واجد علی شاہ اختؔر

مرزا واجد علی خاں نام، تخلص اختؔر اور لقب ''سلطان عالم'' تھا۔ سال پیدائش ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء ہے(۱)

واجد علی شاہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وزیر السلطان نواب سید محمد امیر علی خاں امیر کے مطابق ایک خاص عرصے تک درسی کتابیں پڑھنے میں مصروف رہے۔(۲) اور کامل اتالیقوں اور فاضل استادوں کی صحبت میں رہ کر اپنی فطری ذہانت و ذکاوت سے بہت کچھ سیکھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سے متعلق واجد علی شاہ کے الفاظ یہ ہیں:

''جب عمر کے پانچ برس گزرے تو باپ نے مکتب کے حوالے کر دیا۔''(۳)

نواب امین الدولہ امداد حسین خاں ان کے خاص اتالیق تھے۔ اختؔر نے ان سے علم طب کی دو کتابیں ''میزان الطب'' اور شرح اسباب'' پڑھی تھیں۔

سولہ سال کی عمر میں جب اختؔر کے دادا نصیر الدولہ محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنے بیٹے ''ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں'' کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور پوتے مرزا واجد علی کو پہلے ''ناظم الدولہ'' اور اس کے بعد ''خورشید حشمت'' کا خطاب دیا۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں جب ان کے والد سلطنت اودھ پر متمکن ہوئے تو اختؔر کو امور سلطنت سے وابستہ کر لیا۔ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں باپ کی وفات کے بعد واجد علی خود تخت نشین ہوئے۔ اس وقت انکی عمر پچیس سال تھی۔

سیاسی سرگرمیوں سے قطع نظر اختؔر ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی تھے شعر و ادب کے میدان میں انکے استاد فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ تھے۔ اگرچہ اختؔر کا شمار درجۂ اول کے شعراء کی فہرست میں نہیں آتا لیکن ان کی شاعری نہایت صاف و سادہ اور معیاری ہے اور طرز کلام بھی ایسا عمدہ ہے کہ جو اس زمانے میں

---

(۱) سلطان التواریخ (قلمی نسخہ، ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ)

(۲) وزیر نامہ: ص ۹۷

(۳) حزن اختر (مقدمہ)

لکھنؤ کے عام فارسی شعراء کا ہوا کرتا تھا۔

راجہ درگا پرشاد سندیلوی بادشاہ کی شعر و شاعری، شاعروں کی قدر دانی اور اس عہد کے لکھنؤ میں شعراء کے اجتماع کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''بادشاہ المتخلص بہ اختر در سخن سرائی و معنی آفرینی از ابلغ البلغاء و افصح الفصحاء بودہ اند در عہد دولتش شعرائے نازک خیال و سخن وران معنی شناس بہ پائے تخت او جمع آمدہ از پایہ شناس و قدر دانی آن حضرت دامن آرزو پر از گل ہائے مراد کردند و بیش از وہم و خیال از القاب و خطاب و زر و جواہر بہرۂ وافر بودند'' (۱)

فارسی نظم کے مقابلے میں نثر میں اختر کا کام زیادہ ہے۔ اردو میں ان کے متعدد دیوان ہیں لیکن فارسی میں کسی مکمل دیوان کا ذکر نہیں ملتا۔ فارسی کلام میں ان کی مثنوی ''عشق نامہ'' بڑی مشہور ہوئی جواب نایاب ہے اس کے علاوہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن انہیں نہ شاعری کا دعوی رہا نہ نثر نگاری کا، اپنے طبعی انکسار کی بناء پر فرماتے ہیں:

منم آں کہ از نظم گویاں نیم — زسہم تفکر مشبک تنم

نہ از نثر گویان ذی اعتبار — نہ از کاتبان ثریا نگار (۲)

۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں اختر نے کلکتہ کے محلہ مٹیا برج میں وفات پائی (۳) ان کی ایک غزل کے چند اشعار نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

پرچم حسن بتاں جلوہ کنان آمدہ اند — نو عروسان بسر لشکریان آمدہ اند

بنشین لحہ تو درنیستی ایں خانہ خراب — بہر نابود شدن پائے دوان آمدہ اند

حلقۂ درگوش کن و چلہ بکش بیرخ باش — خبر خوش بشنو زاغ کمان آمدہ اند

کشتہ کوئے صنم خواب مکن چشم کشا — الستخوان نذر کن ایمردہ سگان آمدہ اند

---

(۱) بوستان اودھ: ص ۱۸۳

(۲) مباحثہ بین النفس والعقل: ص ۴۸

(۳) حالات زندگی کا مفصل جائزہ باب دوم میں ملاحظہ ہو۔

۳۔ گوربخش ادیبؔ

گوربخش نام (۱) اور تخلص ادیبؔ تھا۔ یہ لکھنؤ کے محلّہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے (۲)۔ ان کے والد ''امکنی داس'' کا تعلق کہاروں کی قوم سے تھا۔ ادیبؔ کی تاریخ پیدائش کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مصحفیؔ نے ''ریاض الفصحاء'' میں ان کی عمر تیس سال کے قریب بتائی ہے۔ لیکن کسی خاص سنہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ادیبؔ جب سن شعور کو پہنچے تو اپنے آبائی پیشہ کے برخلاف انہیں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ لالہ بنی پرشاد ظریفؔ کے مکتب میں جانے لگے۔ فطری طور پر طبیعت موزوں پائی تھی اور شوق بھی بیحد رکھتے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے اندر فارسی اور اردو میں اشعار کہنے لگے۔ ظریفؔ نے ان کی قابلیت کو سراہتے ہوئے انہیں مصحفیؔ کے حوالے کر دیا کچھ وقت مصحفیؔ کی شاگردی میں گزرا۔ ابھی مصحفیؔ نے ان کی چند ہی غزلوں پر اصلاح دی تھی کہ مصحفیؔ کے ایک شاگرد ''محمد عیسیٰ تنہاؔ'' نے استاد اور شاگرد کے اس رشتہ کو ناپسند کیا ان کا اعتراض تھا کہ ایک کہار کے لڑکے کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا نامناسب ہے۔

ادیبؔ وہاں سے مایوس ہو کر آ گئے اور اپنے آبائی پیشے کی طرف متوجہ ہوئے اس درمیان نواب سعادت علی خاں کی ادیبؔ پر نظر عنایت ہوئی اور انہوں نے ادیبؔ کو اپنے تامجان اٹھانے والوں میں شامل کر لیا۔ فرصت کے اوقات میں نواب موصوف ادیبؔ سے شعر پڑھوا کر سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔

نواب کی وفات کے بعد غازی الدین حیدر کے عہد میں بھی ادیبؔ اپنی ملازمت پر برقرار رہے۔ نواب کی مدح میں قصائد بھی کہے اور انعامات بھی حاصل کئے۔ اس کے بعد سے نواب غازی الدین نے ادیبؔ کو کہاری کی خدمت سے آزاد کر دیا اور امتیازی عہدہ بخشا ساتھ ہی تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ تذکرۂ ریاض الفصحاء میں اس کی وضاحت اس طرح ہے:

---

(۱) تذکروں میں گوربخش اور گربخش دونوں طرح لکھا گیا ہے۔

(۲) ریاض الفصحاء: ص ۳۶

''رحلت نواب وزیر بعہدۂ خود بجناب فیض مآب نواب رفعت الدولہ رفع الملک غازی الدین حیدر خاں بہادر شہامت جنگ قائم گردیدہ وقصیدہ آبدار گفتہ بہ نظر مبارک گزرانید وبعطائے دوشالہ و پنج عدد اشرفی سرفرازی یافت نواب صاحب ھماں روز رنج حمالی سبکدوش ساختہ بخدمت محرری کوھنہ خزانہ عامرہ مامور کردند بعد گزرانیدن عرض بہ اضافۂ مشاھرہ سرفراز گردید''(۱)

ادیبؔ کے بیشتر اشعار حسن وعشق کے موضوعات سے متعلق ہیں۔زبان عمدہ اور فصیح ہے۔الفاظ کے حسن انتخاب پر انہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

حاصل شود مرا بجہان آرزوئے دل — گر یک نگاہ ناز تو افتد بہ سوئے دل

کردم خموش گرلب ظاھر چہ فائدہ — بیرون فتاد راز من ازھای موئے دل

ھر چند ریخت خون جہانی ولی ھنوز — آسودہ نیست غمزہ اش از جستجوئے دل

از گریۂ سحاب چمن سبز می شود — آرے بود ز گریۂ من آبروئے دل

ازمی کشاں کسی کہ دریں دھر می رسد — پر میکند ببادۂ حسرت سبوئے دل

ایک دوسری غزل کے چند اشعار:

درد دل غمزدہ از عشق شرارے دارم — ھمچو گلریز زبندہ بہارے دارم

باعث روشنی چشم بصارت مشتاق — سرمۂ خاک کف پائے نگارے دارم

مئ عیش دوجہاں رفع ملالم نہ کند — کن کہ ازمستیٔ چشم تو خمارے دارم

سویم ازناز اگر ناوک مژگان افگند — آھوئے دل پے بہرام شکارے دارم

گرطوافی کنوآن شوخ چہ دوراست ادیبؔ — برسرراہ کسی تازہ مزارے دارم

ایک اور غزل سے چند اشعار جس میں موسم بہار کی تعریف کی گئی ہے ان اشعار میں شاعر نے کس خوبصورتی سے بسنت کا نقشہ کھینچا ہے:

---

(۱) ریاض الفصحاء:ص ۳۷

شوری فگندہ است بہ اہل جہان بسنت
آمد برنگ جعفری وزعفران بسنت
گلہائی اشرفی ھمہ آورد بہر نذر
مانند آفتاب بریں آستان بسنت
مردم ھمہ لباس بسنتی نمودہ اند
یعنی نوید داد بہ پیر و جوان بسنت
نواب ما کہ غازی دین است نام او
آمد از و بہ کشور ہندوستان بسنت

۴۔ منشی گردھاری لال اسدؔ

گردھاری لال نام اور اسدؔ تخلص تھا۔ اودھ کے قصبہ ہنڈیہہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق انگریز سرکار سے تھا۔ تاریخ گوئی میں حد درجہ کا کمال حاصل تھا۔ کتب بینی سے خاص شغف تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

خط سیرت بود سبزہ چہ سبزۂ ریحان
دور خار تو چوں صفحہ قرآن

زسودائے دوگیسو چہ بت سر موکم نشد پیچش
چہ پیچش پیچش سنبل ، سنبل پیچان

صنم چوزلف وکمر راشکست وبست وکشاد
در امید تمنا شکست و بست و کشاد (۱)

---

(۱) بہارستان اودھ: ص ۱۳۴

۵۔ مظفر علی خاں اسیرؔ

سید مظفر علی خاں نام، ''اسیرؔ'' تخلص، تدبیر الدولہ، مدبر الملک بہادر جنگ خطاب تھا۔ اسیرؔ کی پیدائش ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں امیٹھی میں ہوئی۔ (۱) سلسلۂ نسب حضرت عباس علمدار تک پہنچتا ہے۔ دس برس کی عمر میں اپنے والد میر مدد علی کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور پھر یہیں پر مستقل قیام رہا۔

اسیرؔ نے عربی و فارسی علوم وفنون کی تعلیمات علمائے فرہنگی محل سے حاصل کیں۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں سرکار شاہی سے متوسل ہوئے۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں کچہری سلطانی کے سرشتہ دار اور داروغہ زنداں اودھ مقرر ہوئے۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں عہدہ اور تنخواہ دونوں میں اضافہ ہوا۔ ''تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ'' کا خطاب نواب موصوف کا عنایت کردہ تھا۔

۷۲۔۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اسیرؔ رامپور چلے گئے۔ وہاں نواب یوسف علی خاں برسر حکومت تھے۔ جس وقت اسیرؔ لکھنؤ میں تھے۔ نواب یوسف ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ اسیرؔ یہیں رہ گئے اور اپنی زندگی کے بقیہ دن آرام سے گزارے۔ یوسف علی خاں کی اس درمیان وفات ہوئی۔ ان کے جانشین نواب کلب علی خاں نے بھی اسیرؔ کی قدردانی میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دی۔ کچھ دن فراغت کے گزار کر ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات لکھنؤ آکر واقع ہوئی۔

اسیرؔ کا شمار اس عہد کے مشہور و معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ غلام مصحفیؔ کے شاگردوں میں تھے۔ ''تذکرۂ نادر'' نے انہیں ''ملک الشعراء'' لکھا ہے۔ (۲) ''گل رعنا'' میں بیان ہے کہ ایک فارسی دیوان کے علاوہ ان کے کچھ دیوان اردو کے ہیں (۳)

---

(۱) سخن شعراء: عبد الغفور نساخ، ص ۲۵

(۲) تذکرہ نادر: ص ۲۶

(۳) گل رعنا: ص ۳۹۴

ان کے بارے میں ایک دوسرے تذکرہ نویس کے الفاظ ہیں:

''اردو فارسی اور منقبت میں چار دیوان کہ چار دانگ ہندوستان میں ان کا شہرہ ہے''(۱)

ایک اور بیان کے مطابق:

''انہیں جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی مرثیے اور سلام بھی لکھے ہیں لیکن یہ مجموعہ غدر میں تلف ہوگیا۔ واجد علی شاہ کے استاد تھے۔ امیر مینائی، احمد علی شوق، جرار، فضل علی خاں واسطی ان کے شاگرد تھے''(۲)

اس سلسلے میں تذکرہ ''سراپا سخن'' میں ہے:

''ایک دیوان فارسی، دو دیوان اردو اور عشق نامہ ان کے یادگار ہیں''(۳)

مختصر یہ کہ اسیرؔ ایک پرگو شاعر تھے اور تمام اصناف سخن پر قدرت کمال رکھتے تھے لیکن افسوس کہ تذکروں میں ان کا فارسی کلام مفقود ہے۔

---

(۱) خوش معرکۂ زیبا: (جلد ۱) ص ۱۶۴

(۲) خمخانۂ جاوید (جلد اول) ص ۲۹۹

(۳) سراپا سخن: ص ۳۸

۶۔ راجہ الفت رای الفتؔ

الفت رای نام اور تخلص ''الفتؔ'' تھا۔ ان کا تعلق کایستھ قوم سے تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد لال جی شاہان اودھ کے زمانے میں فوج کے بخشی تھے۔ الفتؔ مولوی احسان اللہ نامیؔ کے شاگرد تھے۔(۱) فارسی کے شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ عربی صرف ونحو سے کافی واقفیت تھی۔ اصناف شعر میں مرثیہ گوئی سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ اور شہرت بھی مرثیہ نگار کی حیثیت سے ہی حاصل ہوئی۔ اگرچہ انکا تعلق ہندو مذہب سے تھا لیکن میلان طبع شیعہ فرقہ کی جانب تھا باقاعدہ تعزیہ داری کا اہتمام کرتے اور مجلس کرتے۔ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا(۲) ان کے کلام کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

السلام ای مدحِ تو آیات قرآن مبین — السلام ای ذات پاکت کعبہ علم ویقین
السلام ای پایہ ات تاج سرِ عرشِ برین — السلام ای سایہ ات خورشید رب العالمین
آسمان عزّ وتمکین آفتاب داد و دین

مہبطِ نور الٰہی مصدر آثار غیب — مخزنِ سرسلونی مطرح انظارِ غیب
معدنِ علم لدنّی مشرق انوار غیب — مقصد تنزیل بلّغ مظہر اسرار غیب
مطلع تیلوہ شاہد مقطع حبل المتین

قائم از فیض قیام ذاتِ تو بنیاد خلق — شادمان از ذکر خلق تو دل ناشاد خلق
ساختی پیش از ظہور ذاتِ خود امداد خلق — صورت معنی فطرت بالت امداد خلق
بہترین نسل آدم نفس خیر المرسلین

---

(۱) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ص ۱۰۵

(۲) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے: ص ۳۶

۷۔ شیخ شرف الدین ملول الہامؔ

شیخ شرف الدین نام اور ''الہامؔ'' تخلص تھا۔ پہلے ''ملولؔ'' تخلص کرتے تھے بعد میں ''الہامؔ'' اختیار کرلیا۔ یہ لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے تھے۔ پیدائش لکھنؤ میں ہوئی لیکن تاریخ پیدائش تذکروں میں مفقود ہے۔ مزاج میں حد درجہ سادگی تھی تمام عمر درویشانہ زندگی بسر کی۔ بچپن سے ہی انہیں دنیاوی اسباب عیش وعشرت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ صاحب معرفت درویش تھے۔

شعروشاعری کی جانب بچپن ہی سے رجحان تھا۔ فارسی زبان کے مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ فارسی گویان لکھنؤ کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔ فارسی میں دو دیوان یادگار ہیں چند تذکرہ نویسوں کے بیانات کے مطابق:

> ''درویش است نیک سرانجام شیخ شرف الدین نام کہ در بلدہ لکھنؤ بہ شاہ ملول اشتہار دارد و سخن بعض از نومشقاں باصلاح میرساند مردمان آنجا بنابر دلق پوشی و بیرابغائت محترم دارند و صاحب باطن می انگارند بیشتر شعر فارسی میگوئد ... ''(۱)

''تذکرہ عشقی'' میں ان کے دو فارسی دواوین کا ذکر ہے (۲) ''تذکرۂ گلشن ہند'' میں ہے:

> ''صاحب دیوان فارسی اور کبھی کبھی تفنن طبع کے لئے ریختہ بھی کہتے تھے پہلے ملول تخلص رکھتے تھے اب الہام اور سروپا برہنہ لنگ باندھے لکھنؤ میں پھرتے ہیں۔ اور شاگرد بہت سے ان کے ہیں''(۳)

غلام ہمدانی مصحفیؔ نے الہامؔ کے بارے میں کافی تفصیلات بیان کی ہیں لیکن نمونہ کلام نہیں دیا ہے یہی حال کم وبیش دوسرے تذکروں کا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی اشعار کے نمونے مفقود ہیں

---

(۱) مجموعہ نغز (جلد ۱): ص ۷۰

(۲) تذکرۂ عشقی، ص ۵۱

(۳) گلشن ہند: ص ۲۹

جسکی بنا پر ان کے کلام کا صحیح جائزہ ممکن نہیں بہر حال تذکرہ نویسوں نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا ہے۔

مرزا علی لطف کا بیان ہے:

''زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزود ہے یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جا چکتا کہ دوسرا موجود ہے اس طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے ... دو دیوان فارسی زبان میں رکھتے ہیں اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں'' (۱)

مصحفی لکھتے ہیں:

''شاعر فارسی گو است طبعش چون بحر مواج رواں رواں افتادہ کم کم بطرف ریختہ ہم متوجہ میشود بعضی از موزونان لکھنؤ چہ در فارسی و چہ در ہندی شاگردیش را فخر خود می شمارند و او را استاد مسلم الثبوت می دانند والحق کہ در درویشی و شاعریش دوش بدوش راہ می رود و بہ سبب نام درویش اعالے وادانی شہر توقیر و تعظیمش را موجب افتخار می پندارند وطن اجدادش ہمین شہر لکھنؤ ... (۲)

''سخن شعراء'' جو کہ اردو شعراء کا تذکرہ ہے اس نے بھی الہام کے فارسی کلام کو اولیت بخشی ہے (۳)

الہام کی پیدائش کا کہیں حوالہ نہیں مل سکا تذکرۂ ہندی نے صرف اتنا لکھا ہے:

''عمرش از شصت متجاوز باشد'' (۴)

لیکن ''تذکرہ گلشن بے خار'' میں تاریخ وفات ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ لکھی ہے (۵)

---

(۱) گلشن ہند: ص ۲۹۔۳۰

(۲) تذکرۂ ہندی: ص ۳۸

(۳) سخن شعراء: ص ۴۴

(۴) تذکرۂ ہندی: ص ۳۸

(۵) گلشن بے خار: ص ۲۶

۸۔ منشی لال چند انسؔ

لال چند نام اور ''انسؔ'' تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شعر گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ قابل تعجب بات یہ ہے کہ یہ صاحب دیوان تھے، ان کا مطبوعہ کلام دیوان کی صورت میں موجود ہے۔(۱) اس کے باوجود حالات زندگی کہیں نہیں ملتے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بود یارب کجا شائستہ حمدت زبان ما — چساں مطبوع ارباب سخن گردو بیان ما
اگر گوئیم حرفی روز و شب شکرترا گوئیم — وگرنہ از خموشی مہر بادا بر دھان ما
تو از ملک عدم سوی وجود آوردہ ای مارا — نبودہ پیش ازین اندر جہان نام ونشان ما
نباشد روح تا درین نیاید ھیچ کا راز وی — توئی روح و روان ماتوئی تاب وتوان ما

امید مغفرت ھا انسؔ دارد ھرنفس از تو
گناھش گرچہ افزون است یارب ازبیان ما (۲)

ایک دوسری غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

آہ یک روز نشد وعدۂ وصل تو وفا — تا کند کا رکسی صبر و شکیبائی را
دل بیاد تو کنم شاد تو انم لیکن — چون تسلّی کنم این چشم تماشائی را
دل بدستش نتوان داد نمیدانی انسؔ — چہ بود قد رمسلمان بت ترسائی را

انسؔ کو نہ صرف غزل گوئی پر ملکہ حاصل تھا بلکہ وہ قصیدہ گوئی پر بھی عبور کامل رکھتے تھے۔ انھوں نے سلطان عالم واجد علی شاہ کی شان میں کئی ایک قصائد کہے ہیں ایک قصیدے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

---

(۱) دیوان منشی لال چند انسؔ

(۲) ایضاً

قصیده در مدحت حضرت سلطان عالم (خلّد الله ملکه) درزمان ولیعهدی

چیست امروز که شاداست دل عالمیان چیست امروز که مادهٔ عیش است جهان

از چه آراست جهان انجمن عیش وطرب از چه در پیرهن خویش نگنجند دوران

نگهت گل پی تعطیر دماغ عالم هرطرف نافه فروش است بگلزار جهان

مطلع دیگر:

این سخاوت که تو داری نبود در نیسان بحر وکان از کف جودتو در آید بفغان

گشت معدوم وجود طلب از دهر امروز ازنوال تو غنی شد لقب محتا جان

حکم تقویم کهن بضعت کسریٰ دارد پیش انصاف توای دادگر خلق جهان(۱)

---

(۱) دیوان انس

۹۔ شیر افگن باسطی

بندعلی خاں نام، خطاب شیر افگن خان اور ''باسطی'' تخلص تھا۔ یہ نواب عزت خان صلابت جنگ کے بیٹے تھے۔ نواب امیر خان کی وساطت سے جاگیر وغیرہ کے ساتھ پنج ہزاری منصب پر فائز ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے آخری دور میں باسطی بھی اوروں کی طرح لکھنؤ گئے اور خواجہ باسط علیہ الرحمۃ کے مرید ہو گئے بعد میں دامادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اور اس طرح مرشد کا تخلص بھی اختیار کر لیا۔

صاحب ''عقد ثریا'' کا بیان ہے:

''بندعلی خاں نام دارد مخاطب بشیر افگن نبیرۂ دختری نواب شیر افگن خاں پانی پتی و پسر نواب عزت خاں و داماد روشن الدولہ کہ سلسلۂ ایشان منتہی مشہور بہ سید نعت اللہ دلی'' (۱)

باسطی نے نوے سال کی عمر پائی ان کی وفات ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء میں ہوئی۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تذکروں کے مطالع سے پتہ چلتا ہے کہ ہر صنف سخن میں شعر کہے ہیں۔ مرزا افضل ثابتؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رباعی کا ایک نمونہ:

هر کس ز علی بغض درون میدارد
خود راز در گرم برون میدارد
دانی که چرا کاخ شریعت برپاست
این خانه دو ازده ستون میدارد (۲)

مرزا افضل ثابتؔ کے سلسلے میں باسطی کا یہ مصرعہ بڑا مشہور ہے:

''شیر افگن خاں مرید ثابت است'' (۳)

---

(۱) عقد ثریا: ص ص ۱۴۔۱۵

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۳۳

(۳) عقد ثریا: ص ۱۴

۱۰۔نواب سعادت خاں برہان الملک برہانؔ

نام سید محمد امین سعادت خاں، تخلص ''برہانؔ'' اور لقب برہان لملک کبھی کبھی ''امین'' تخلص بھی کرتے تھے۔ یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔(۱) بہادر شاہ اول کے عہد سلطنت ۱۹۔۱۱۲۴ھ/۷۔۱۷۱۲ء میں ہندوستان آئے اور نواب سربلند خاں کی سرکار میں ملازمت اختیار کرلی۔اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ فرخ سیر کے یہاں ملازم ہوئے،اور ہندول و بیانہ کی فوجداری پر مامور کیا گیا۔۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں صوبہ اکبرآباد کے ناظم بنائے گئے۔۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں اودھ کے صوبہ دار ''راجہ گردھر بہادر ناگر'' کی جگہ ان کا تقرر ہوا،اور ۱۱۳۶ھ میں اودھ کے فرمانروا ہوئے۔ اودھ کے مضافات میں الہ آباد، جونپور بنارس، غازی پور، کڑہ، مانک پور، کوڑہ جہاں آباد وغیرہ پر اپنے زور بازو اور حکمت عملی سے قابض ہوئے۔

۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا لیکن نواب برہانؔ نے اس سے صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی۔۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء) میں نواب برہانؔ بیمار ہوئے اور وفات پائی۔(۲)

شعر و شاعری سے برہانؔ کو خاص تعلق تھا۔ان کے دربار سے بہت سے اہل کمال وابسطہ تھے۔ نواب خود بھی اچھے اور عمدہ فارسی اشعار کہہ لیتے تھے۔لیکن افسوس، تذکروں میں ان کے اشعار نہیں ملتے۔ ان کے متعلق غلام علی خاں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ نواب والا قدر ممدوح مقدم الذکر مرد سپاھی بود لیکن چوں طبعش از ازل موزوں بود گاھی فکر شعر ھم می فرمود و امین تخلص میکرد چوں اسم شریفش میر محمد امین بود تخلص ھم ازنا تجویز نمود میر عبدالعلی طالع تخلص در مقطع غزل گوید شعرع
>
> طالع ایں مصرع نواب دل از دستم کرد
>
> دل غمگین بہ کسی دادہ ام و یا دم نیست

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۳۳

(۲) ایضاً، ص ۳۶

مصرع ثانی فرمودۂ نواب است (۱)

برہان الملک سپاہی آدمی تھے۔ان کے اشعار بھی سپاہیانہ طرز کے ہیں تھے ان کا یہ شعر علی قلی والہ داغستانی نے ''ریاض الشعراء'' میں نقل کیا ہے:

زکدام رہ پیایم کہ بچشم تودر آیم
کہ بگرد چشم مستت ھمہ نیزۂ سپاھیست

درج ذیل شعر ''ریاض العارفین'' میں ہے۔

تا چند بہ دل ، ضبط کنم آہ وفغاں را
وقت است کہ، بیرون فگنم ،راز نہان را (۲)

---

(۱) عماد السعادت: ص ۳۰

(۲) تذکرہ ریاض العارفین: ص ۷۷

۱۱۔ خواجہ عبدالعزیز بسملؔ

خواجہ عبدالعزیز نام اور ''بسملؔ'' تخلص تھا۔ خواجہ ابوالفتح خاں جنونؔ کے بیٹے تھے۔ شیخ افضل الہ آبادی کی خدمت میں رہ کر انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور ساتھ ہی ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ پہلے ''عزیز'' کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن بعد میں بسملؔ تخلص اختیار کیا۔ گورکھپور میں رہتے تھے صاحب سفینۂ خوشگو کا بیان ہے کہ آپ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ لیکن تذکروں میں ان کا تفصیلی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ بطور نمونہ کلام کے صرف دو شعر مل سکے:

گرفتم دامن آں نی سوار از جوش بیتابی
ازیں مشت غبار ناتواں دیگر چہ می آید

باید حکایت از لب دریا دلاں شنید
گوش حباب جانب دریا کشادہ است (۱)

---

(۱) سفینۂ خوشگو، ص ۲۹۶

۱۲۔ شیخ بقا اللہ بقاؔ

بقا اللہ نام اور بقاؔ تخلص تھا۔ ان کے باپ حافظ لطف اللہ ایک شہور و معروف خوش نویس تھے۔ یہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ بقاؔ کی پیدائش دلی میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کا ذکر تذکروں میں نہیں ہے۔ آگے چل کر یہ لوگ لکھنؤ میں جا بسے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

''بقاؔ'' کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ نہایت شوخ طبع اور ظریف تھے۔ شعر و شاعری میں مرزا فاخر مکینؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ''غمگینؔ'' تخلص کرتے تھے۔ بعض تذکروں میں ''غمینؔ'' بھی لکھا ہے مثلاً ''تذکرہ ہندی'' میں ہے:

''بیشتر غمین تخلص میکرد و شعر فارسی میگفت و از نظر مرزا فاخر مکین می گزرانید۔۔۔ ''(۱)

اسی طرح ''شعرای اردو'' میں بھی ''غمینؔ'' ہی لکھا ہوا ہے(۲)۔ ''گلشن ہند'' مؤلفہ حیدر بخش حیدری اور بیشتر تذکروں میں بھی ''غمین'' ہی ملتا ہے۔

''غمگین'' کا لفظ ''گل رعنا'' (مولانا عبدالحیؒ) میں ہے۔(۳)

فارسی شاعری سے جب ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے تو شاہ حاتم کی خدمت میں پہنچے۔ شاہ حاتم نے انہیں اپنے شاگردوں میں جگہ دی اور بقاؔ تخلص اپنانے کو کہا۔ اس کے بعد تخلص ''بقاؔ'' ہی سے مشہور ہوئے۔

بقاؔ کا طرز بیان عمدہ و شیریں تھا لیکن انکی بیشتر توجہ ہجو گوئی کی طرف تھی۔ جسکی وجہ سے میرؔ و سوداؔ سے اکثر الجھ پڑتے تھے۔ انکی آپسی چپقلش کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ مثلاً مصحفیؔ جو کہ بقاؔ کے دوست تھے، لکھتے ہیں:

''جوان سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع دیدمش طبع شوخش بطرف ہجو بسیار مائل افتادہ در

---

(۱) تذکرۂ ہندی، ص ۵۱

(۲) شعرای اردو، ص ۲۰۰

(۳) گل رعنا، ص ۲۱۲

شاھجہاں آباد بامیر، ودر لکھنؤ با مرزا معرکہ گیریہا کردہ ودقت طبع خود را ظاھر نمودہ''(۱)

انہیں فارسی سے زیادہ اردو زبان میں شہرت ہوئی بیشتر تذکروں میں ان کا فارسی کلام نہیں ملتا۔ جس سے انکے طرز بیان وخیالات کا صحیح صحیح اندازہ کیا جاسکتا۔ صاحب ''سخن شعراء'' لکھتا ہے:

''فارسی میں مرزا فاخر مکین سے شعر نمکین کہتے تھے ...''(۲)

اسی طرح ''گلستاں بے خزاں'' میں ہے کہ:

''نمک چشی فارسی میں ذائقہ شور انگیز ... ''(۳)

جس طرح انکی زندگی کے بیشتر حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ اسی طرح انکی وفات کا بھی صحیح سنہ نہیں ملتا۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء کی ترتیب کے وقت وہ زندہ تھے۔ ''گلشن ہند'' میں مرزا علی لطف نے سال وفات ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء لکھا ہے ''سفینۂ ہندی'' جسکا سال تالیف ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۴ء ہے لکھا ہے کہ:

''چند سال است کہ وفات یافتہ''(۴)

صحیح سنہ کا پتہ اس لئے بھی نہیں چلتا کہ وہ ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء میں حج کے ارادے سے کربلائے معلیٰ کے سفر پر روانہ ہوئے اور جیسا کہ بیشتر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے، راستے میں ہی وفات پا گئے۔

---

(۱) تذکرۂ ہندی، ص ۵۱

(۲) سخن شعراء، ص ۶۸

(۳) گلستان بیخزاں، ص ۳۷

(۴) سفینۂ ہندی، ص ۲۷

۱۳۔ منشی جوگل کشور بہارؔ

جوگل کشور نام اور تخلص ''بہارؔ'' تھا ان کے والد منشی کنول رام نزاکتؔ الہ آبادی بھی شاعر تھے اور غلام قطب الدین مصیبتؔ سے شرف تلمذ تھا۔ نظم ونثر میں مہارت حاصل تھی۔ بہارؔ نے اپنے والد سے وراثت میں یہی کچھ پایا چنانچہ تذکرہ روز روشن میں بہارؔ کا ایک شعر ملتا ہے، شعر یہ ہے:

از رشکِ آن دھان شکر باربار
خون میگریست غنچہ بگلوار، زار (۱)

بہارؔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کی تمام عمر یہیں گزری۔ تاریخ پیدائش ووفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ ضرور وضاحت ملتی ہے کہ بہارؔ لکھنؤ میں نواب مدار الدولہ کے کارخانے میں منشی کے عہدے پر فائز تھے۔

---

(۱) تذکرۂ روز روشن: ص ۱۰۴

۱۴۔ منشی مکھن لال بہجتؔ

مکھن لال نام اور بہجتؔ تخلص تھا۔ ان کی پیدائش اودھ کے مردم خیز قصبہ بلگرام میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے متعلق تذکرے خاموش ہیں۔ ان کا خاندانی تعلق کایستھ قوم سے تھا۔ یہ فارسی کے شاعر تھے ان کی زندگی سے اور کارناموں نیز دیگر احوال سے متعلق ہمیں کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ تذکرہ ''نتائج الافکار'' کے مطابق ان کا انتقال ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء کی ابتدا میں ہوا۔ لکھتے ہیں:

''سخن طراز فوش فکرت مکھن لال بہجت کہ از قوم کایست است و اصلش از خطۂ بلگرام در مشق سخن از شاگردان عوض رائے مسرت شاھجہانپوری بود۔ شاعر صاف گو و کلامش درد انگیز است اوائل مآۃ ثالث عشر (۱۳۰۰) در گذشت'' (۱)

تذکرۂ مصحفی میں بھی اسی طرح کی عبارت ملتی ہے، مختصراً تحریر فرماتے ہیں:

''قوم کایستھ ... زادو بوش خطۂ بلگرام شاگرد عوض رائے مسرت شاھجہنپوری کسری گوش بحدے دارد کہ جواب وسوالش بر لوح کاغذ میتوان کرد در لکھنؤ ملاقات این بیچارہ شد'' (۲)

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہجتؔ نے عوض رائے مسرتؔ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ ان کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

زدست بہجت مسکین دگر چہ می آید — جزا اینکہ نقد دل و جان نثار یا رکند
وفای وعدہ ازاں بیوفا امیدم نیست — ھزار بار مرا گرامید وار کند

بتعظیم رقیبان تا بکی ھربار بر خیزم — ھمان بہتر کہ من از بزم او زین عار بر خیزم (۳)
گر بود صبر رسد درد بدرمان روزی — حیف صد حیف کہ من صبر ندارم چہ کنم
غم دوری ترا، چارہ ندارم چہ کنم — جان من! گر بہ غمت جان نہ سپارم چہ کنم (۴)

---

(۱) تذکرۂ نتائج الافکار: ص ۱۲۱

(۲) عقد ثریا: ص ۱۳

(۳) قلمی دیوان ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے۔

(۴) تذکرۂ ریاض العارفین: ص ۱۱۸

۱۵۔ پنڈت سوم ناتھ مبعی بیخود

سوم ناتھ نام اور تخلص ''بیخود'' تھا۔ تاریخ پیدائش اور وفات کا ذکر کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے ان کے کسی خاص عہد کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ عہد نوابین سے وابستہ تھے اور پنڈت سنگم لال مبعیؔ کے بیٹے تھے۔

بیخود کو فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر ملکہ حاصل تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھیں فرنگی محل کی سرپرستی حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی تمام تعلیم فرنگی محل کے علماء سے حاصل کی اس سلسلہ میں نریندر بہادر لکھتے ہیں:

> ''جناب بیخود فارسی کے عالم متبحر تھے نیز عربی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ فرنگی محل کے عالم فاضل تھے۔ جب وہ وہاں کے امتحان میں شریک ہوئے تو مسلم ممتحنوں نے آپکی قابلیت کا اندازہ کر کے کہا کہ اگر آپ مسلمان ہوتے تو دستار فضیلت آپ کے سر ہوتی''(۱)

ایک عرصہ تک ''بیخود'' اودھ کے مختلف اضلاع میں بحیثیت تحصیلدار ملازمت کرتے رہے۔ ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔(۲)

بیخود اپنی تمام مصروفیات اور دیگر مشاغل کے باوجود شعر و شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے یہ کہنا تو مشکل ہوگا کہ اس میدان میں ان کے استاد کون تھے، بہرحال خود ان کے کہے ہوئے اشعار کسی استاد سے کم نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بجوف ھجر و امید وصال جان زتنم ھزار بار برفت و ھزار بار آمد

بسکہ حسرت میچکد از نالۂ آوای من بزم محشر صحن خاموشاں شد از غوغای من

---

(۱) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ص ۱۰۹

(۲) تذکرۂ بہار گلشن کشمیر (جلد ۱) ص ۱۵۳

همت والایم ازکون مکان بگذشته است　　برفضای لامکان پر می زند عنقای من
در بیابان جنون از بسکه باشم گرم خیز　　شعله می خیزد بجای گرد از صحرای من

بیخود کی مخمس کا نمونہ:

ساز میراث رخی دیدۂ حیرانی را　　مطرح نور جمالی بنما جانی را
عشرت بتکده کن کعبه ایمانی را　　ساز آباد خدایا دل ویرانی را
با مده مهر تبان هیچ مسلمانی را

ای زلطف تو برامید هم آغوش حصول　　پر گهر از کرم وجود تو حسب معمول
چون صدف لب چه کشایم پی اظهار وصول　　میتوانی که دهی اشک مرا رنگ قبول
تو که در ساخته ای قطرۂ بارانی را

ای پاک است ز ترکیب وجود آلات　　وحدت ذات تو کثرت نگزیند ز صفات
چون فصیحی چه رسول آمده عاجز به ثبات　　آصفی کیست که توحید تو گوید هیهات
حد و صف نبود هیچ سخندانی را

۱۶۔ رای سناتھ سنگھ بیدارؔ

رای سناتھ سنگھ نام اور تخلص ''بیدارؔ'' تھا۔ ان کی پیدائش گورکھپور میں ہوئی۔ ان کے والد بھوک چند پیشکار تھے بیدارؔ کی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ فارسی کے شاعر تھے لیکن ان کے کلام سے متعلق کسی تذکرہ میں کچھ نہیں ملتا۔ تاریخ گوئی میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ بھگوان داس ہندیؔ لکھتے ہیں:

''در تاریخ گوئی نظیر نداشت بار اقم آشنا بود تاریخ اتمام حدیقۂ ہندی او گفتہ'' (۱)

نواب شجاع الدولہ کے تولد کی تاریخ بیدارؔ نے کہی تھی:

بدولت خانۂ نواب منصور

برآمد آفتاب از مطلع نور (۲)

اس کے عوض نواب صفدر جنگ نے ایک بڑی رقم مرحمت فرمائی جسے بیدارؔ نے قبول نہ کیا۔ اتفاقاً نواب شجاع الدولہ بہادر کی تاریخ وفات بھی بیدارؔ نے کہی:

ھاتف از روی الم سالش گفت

مہر پنہاں بزمین شد ھیہات (۳)

اس کے چند سال بعد خود بھی وفات پا گئے۔

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۲۳

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

۱۷۔ میدی لعل بیمار

میدی لعل نام اور تخلص ''بیمار'' تھا۔ ان سے متعلق تذکروں میں وافر معلومات نہیں ملتیں۔ ان کے تاریخ تولد اور تاریخ وفات کا ذکر بھی تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا ہے۔ بھگوان داس ہندی کے تذکرہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق لکھنؤ کی رستوگی قوم سے تھا۔(۱) ان کا عہد اودھ میں نواب شجاع الدولہ کا تھا

''بیمار'' صوفیانہ طبیعت کے حامل تھے۔ ان کی طبیعت کا میلان تصوف کی طرف زیادہ تھا۔ مولانا روم کی ''مثنوی معنوی'' سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اسکا بڑی گہرائی سے مطالعہ کرتے اور بڑی پُرسوز آواز میں پڑھتے ''سفینۂ ہندی'' میں صراحت ہے:

''ابیات مثنوی را با سوز و درد می خواند راقم یک دو مرتبہ او را دیدہ است کہ ابیات می خواند و اشک از دو چشمش روان می شد''(۲)

فارسی شعر و شاعری میں انہیں اچھی استعداد تھی۔ ان کا کلام عمدہ ہے۔ اصلاح سخن ''سرب سکھ دیوانہ'' سے لیتے تھے۔

۱۱۸۲ھ میں (۱۷۶۸ء) سب سے ترک تعلق کر کے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور دنیاوی عیش و آرام ترک کر کے قلندرانہ لباس پہن لیا۔ اشعار کے چند ایک نمونے درج کیے جاتے ہیں:

کاش یک لحظہ دگر زیستی یا قسمت — بعد مرگ آمد و پرسید کہ بیمار کجاست

نمی بینیم ما از کوری خود حسن شوخت را — تو حسن خویش را در صورت ما کردہ پیدا

ان کی رباعی کا ایک نمونہ:

ای عشق بیا کہ دین و ایمان منی — ای درد بیا کہ راحت جان منی

گہ داغ نہی دل مرا گہ مرہم — ہم درد منی تو ہم تو درمان منی

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۳۰

(۲) ایضاً

۱۸۔ نصیرالدین حیدر پادشہؔ

صوبۂ اودھ کے دوسرے بادشاہ یعنی آٹھویں حکمراں بادشاہ سلیمان جاہ نواب نصیرالدین حیدر(۱) فنون لطیفہ سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعری میں کبھی ''جاں نثار'' کبھی ''علی حیدر'' اور کبھی ''پادشہؔ'' تخلص کرتے تھے۔(۲) بیشتر اردو میں کہتے تھے کبھی کبھی فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ مؤلف تذکرہ روز روشن کا بیان ہے:

''طبع موزوں داشت۔ احیاناً توجہ بہ انشائے اشعار اردو و فارسی می گماشت''(۳)

انھوں نے اپنے اردو کلام میں بھی بیشتر جگہوں پر فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اردو و فارسی غزلیات کے چند ہی اشعار تذکروں میں ملتے ہیں البتہ مذہبی عقائد پر مبنی ان کی نظموں کا ایک مکمل مجموعہ ضرور دستیاب ہوا ہے جو'' کلام نصیرالدین حیدر'' کے نام سے معروف ہے۔(۴)

پادشہؔ نے اپنی شاعری میں سادہ و رواں فارسی کا استعمال کیا ہے۔ ان کے اشعار میں مذہبی جذبات کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے یہ نعتیہ اشعار کتنے پیارے ہیں، ملاحظہ ہوں:

مرحبا اے سیدی عالم علم دھی — ماہ برج عجمی شاہ سریر عربی
چوں نشایند جبیں بردرتو جن وملک — سرور جملہ رسولان شد و جملہ نبی
اصل نور تو بود فرع زا نوار خدا — بعد ایزد ز تو زیباست حوائج طلبی
بوے نطع برساں پادشاھم را بد ماغ — اے گلی تازہ رنگی چمن مطلبی

---

(۱) نصیرالدین حیدر کے مفصل حالات باب دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) زبدہ الکوائف (قلمی)

(۳) تذکرہ روز روشن: ص ۱۲۰

(۴) ''کلام نصیرالدین حیدر پادشہ'' کی تصحیح و ترتیب ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، لکھنؤ یونیورسٹی نے ۱۹۸۳ء میں کی تھی۔

۱۹۔عبدالعلی تحسینؔ

عبدالعلی نام اور تخلص ''تحسین'' تھا۔ان کا آبائی وطن شہر ''ری'' تھا۔نواب برہان الملک کے زمانے میں ''ری'' (ایران) سے اودھ آئے۔اور اودھ میں ان کا ایک زمانے تک قیام رہا۔

تحسینؔ مرزا دارب بیگ جویاؔ کے نواسے تھے۔اور آگے چل کر جویاؔ سے شرف تلمذ بھی حاصل کیا۔(۱) تحسینؔ نواب سعادت خاں کے یہاں ملازمت کرتے تھے اور ساتھ ہی نواب کی شان میں عمدہ قصائد بھی پیش کرتے۔صاحب ''سفینہ ہندی'' کا بیان ہے:

موطن آبائش بلدۂ ری بود خودش بحسن خلق مشہور عصر بودہ ہرگاہ کہ سید عالی جاہ نواب برہان الملک سعادت خاں بہادر مرحوم ناظم اودھ شدہ، در سلک ملازمانش انخراط یافت''(۲)

''سفینۂ خوشگو'' اور ''عقد ثریا'' کا بیان یہ بھی ہے کہ تحسینؔ پہلے کشمیر میں تھے اس کے بعد لکھنؤ آنا ہوا لیکن ان کے علاوہ دوسرے تذکرہ نویسوں نے انہیں کشمیر سے نہیں بلکہ ''ری'' سے متعلق بتایا ہے اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

تحسینؔ کی وفات اودھ میں واقع ہوئی۔سنہ وفات کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔یہ خوش مزاج اور با اخلاق تھے ان کے یہ دو شعر دیکھیے:

بخود ہر کس کہ پیچد در سخن خواہد سخنور شد　　کہ شمشیر زباں را پیچ و تاب فکر جوہر شد(۳)

باشد مکاں زگرم روی لامکاں مرا　　در زیر پا چو آبلہ است آسماں مرا(۴)

---

(۱) لکھنویات ادیب: ص ۴۵

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۴۱

(۳) سفینۂ خوشگو: ص ۲۶۷

(۴) سفینۂ ہندی: ص ۴۲

۲۰۔ مرزا محمد تقی ترقی

مرزا محمد تقی نام، اسد الدولہ رسم الملک خان بہادر خطاب عرف آغا صاحب اور ترقی تخلص تھا۔ یہ میرزا محمد امین کے صاحبزادے تھے جو نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ترقی نواب شجاع الدولہ کے عزیز بھی تھے۔ ان کی بود و باش شہر فیض آباد میں تھی۔ اور نواب بہو بیگم کی سرکار سے منسلک تھے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے ترقی بڑے وضع دار، ہنر پرور اور علم دوست امیر تھے۔ فیض آباد کی جگہ جب لکھنؤ دار الامان ہوا تو لکھنؤ اکثر آنا ہوتا تھا لیکن بہو بیگم کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر کے عہد میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ شعر و شاعری کا شوق رکھتے تھے اور اپنے کلام پر میر سوز سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

فیض آباد میں نواب کی سرکار سے بہت سے شعراء وابستہ تھے۔ خود ترقی بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر ہوئے ترقی کی سخاوت شرح و بیان سے باہر ہے۔ اہل کمال اور شعراء کے قدر دان تھے۔ فیض آباد میں مجلس مشاعرہ کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی۔ ان سے متعلق مختلف تذکرہ نویسوں کی رائیں درج ذیل ہیں:

خویشگی:

''مرزا تقی خاں بہادر است از امرائے لکھنؤ است اکثر فیض آباد را رونق بخشید، امیر کبیر بودہ، ازاں ترقی بخش است ... (۱)

لالہ سری رام:

''نہایت خوش کلام اور رنگین طبع امیر تھے اور ان کا شمار اساتذہ قدیم میں کیا جاتا ہے کلام میں درد اور دلکشی ہے زبان صاف اور شیریں اور لطف محاورہ بھی اس میں موجود ہے'' (۲)

---

(۱) گلشن ہمیشہ بہار: ص ۹۵

(۲) خمخانۂ جاوید (جلد ۲) ص ۵۲

مصحفی:

''از ابتدائے شوق موزونی طبع تا الان رجوع از تہ دل بہ اہل کمال و صاحبان سخن از عطیۂ دست اوزر بدست'' (۱)

قدرت اللہ قاسم:

''ترقی تخلص بزرگی است در فیض آباد خوش باش صاحب تمکین و عمدہ معاش با جاہ و ثروت تمام مرزا محمد تقی خاں نام سخنش ورد آلود و رنگین فکرش بغایت خوب و دلنشین گویند کہ در فیض آباد طرح مراختہ بخانہ می انداخت و بہر کس بزرگانہ می ساخت'' (۲)

ترقی کے فارسی اشعار نہایت عمدہ ہیں جن سے ان کے ذوق کی اعلیٰ نمائندگی ہوتی ہے ان کا انتقال ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں ہوا۔ مرزا نظر علی نظر جو مصحفی کے شاگرد تھے تاریخ وفات کہی:

محمد تقی خاں بہادر کہ بود — بجود و شجاعت عدیم المثال
بحکم خدا زیں سرائے سپنج — سوئے باغ فردوس کرد انتقال
پے سال تاریخ آں ذی شکوہ — چو کردم نظر از دل خود سوال
ہماندم خود از سر حلم گفت — برفت از زماں قدر دان کمال (۳)

ترقی کا نمونۂ کلام یہ ہے:

نہ در شب ہائے تارم کہکشانست
پرشاں گشت روزم ایں نشانست
گلوں گاں گیسوئے عنبر مشامست
سواد اعظم ہندوستان نیست
زتاثیر سموم آہ جاں سوز
نسیم صبحدم آتش فشانست

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۵۴

(۲) مجموعۂ نغز (جلد ۱): ص ۱۳۸

(۳) دیوان نظر (قلمی)

۲۱۔ ٹیکارام تسلّی

ٹیکارام نام اور تخلص ''تسلّی'' تھا۔ ان کے باپ گوپال رائے نواب آصف الدولہ کے یہاں بخشی گری کے عہدے پر فائز تھے۔ اصل وطن اٹاوہ کے پاس قصبہ ''کرہل'' تھا۔ تسلّی کی پیدائش لکھنؤ کی ہے(۱) لیکن افسوس تلاش بسیار کے باوجود کہیں کسی تذکرے سے تاریخ پیدائش کا حوالہ نہیں ملتا۔

تسلّی کی پرورش اور تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ فطری طور پر یہ نہایت مہذب اور بااخلاق تھے۔ شعروسخن سے خاص دلچسپی تھی۔ شعراء کی محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام سناتے۔ تسلّی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی اشعار پر مرزا فاخر مکین سے اصلاح لیتے تھے۔

تسلّی شعروشاعری کے علاوہ دوسری بہت سی خوبیوں کے مالک بھی تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فنکار کاتب بھی تھے۔ اساتذہ سخن کے دواوین کا خصوصیت سے مطالعہ کرتے اور اچھے اشعار جمع کرتے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ان کی خوبیوں کو کئی جگہ سراہا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> چوں از ابتدای عمر ذوق موزونی شعر دلنشین خاطرش بود حالا کہ بفضل الٰہی سن عمرش از بست وپنج متجاوز خواھد بود شعر ھندی وفارسی را بہ سلیقہ تمام می گوید ... اکثر از مثنویہا ی ودواوین اساتذہ جمع ساختہ وانتخاب زدہ نویسانیدہ چنانچہ فقیر ھم (دیوان فارسی و دیوان ھندی) خود مع تذکرہ فارسی حسب الارشاد نوشتہ دادہ''(۲)

انکے سلسلہ میں ''مجموعۂ نغز'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

> ''ٹیکارام نہایت خوش اختلاط وگرم ارتباط است بہر دو زبان سخن میگوید در فارسی از خدمت مرزا محمد فاخر مکین استفادہ نمود و در ریختہ از میاں غلام ھمدانی مصحفی فیض سخن و بودہ مرد خوش فکر صاحب شعور معلوم میشود''(۳)

مختصر یہ کہ تسلّی اس عہد کے مشہور معروف شعراء کی فہرست میں آتے ہیں، فارسی کے شاعر تھے لیکن تذکروں میں ان کے اشعار نہیں ملتے۔

---

(۱) تذکرۂ ہندی، ص ۸۷

(۲) ایضاً

(۳) مجموعہ نغز (جلد ۱) ص ۱۴۰

۲۲۔ سلام اللہ خاں تسلیم

سلام اللہ خاں نام اور تسلیم تخلص تھا۔ ان کے والد شاہ کلیم اللہ دہلی میں رہتے تھے لیکن دہلی کی تباہی کے بعد ان لوگوں نے اودھ کر راہ لی، اور نواب شیر جنگ نثار محمد خان کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ نواب کی وفات کے بعد تسلیم نے نواب میرزا علی خان بہادر کی وساطت سے نواب آصف الدولہ بہادر تک رسائی حاصل کی۔ مصحفی نے ان کے سلسلے میں لکھا ہے:

''وضع خواندان شعرش بر گفتنش غالب افتادہ سرے با عمامہ وعصا ھم دارد وطرز مشائخانہ رااز وھم آبروست''(۱)

ان کا ایک شعر ملتا ہے:

بجز حب علی ایمان نباشد
کسی را این نباشد آن نباشد (۲)

باغ معانی میں مذکور ہے:

''ودر شیوۂ ندیمی وخوش اختلاطی وتازہ روی وسخن سنجی وبذلہ گوئی معروف درفن شعر شاگرد ملانسیم است''(۳)

(۱) عقد ثریا: ص ۱۸

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۴۳

(۳) باغ معانی: ص ۸۷

۲۳۔ راجہ جے گوپال سنگھ بہادر ثاقبؔ

شیو بیر دھان راجہ جے گوپال سنگھ نام اور تخلص ''ثاقبؔ'' تھا۔ یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے باپ سلاطین اودھ کے زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ ثاقبؔ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پڑھ لکھ کر جوان ہوئے۔ یہ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، جب ثاقبؔ ان کے دربار میں بخشی گیری کے عہدے پر فائز ہوئے۔(۱)

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں جب نواب موصوف کی سلطنت ختم ہوگئی اور وہ کلکتہ چلے گئے تو ثاقب بھی نواب سے غایت درجہ خلوص ومحبت کے سبب ترک وطن کر کے ان کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں بھی اپنے بخشی گیری کے عہدے پر مامور رہے۔

ثاقبؔ کو نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی وہ فارسی کے عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ایک اچھے مصنف بھی تھے۔ تاریخ ''زبدۃ الکوائف'' ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء اس بات کی گواہ ہے۔

شعر وشاعری کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مثال کے طور پر ان کی ایک مثنوی سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، یہ مثنوی واجد علی شاہ (جان عالم) کی تعریف میں ہے:

زھے جسم معانی جان عالم — جہاں را امن وسلطان عالم
فروغ دیدۂ کشور ستانی — فروزاں اختر اوج معانی
سخن سنج وسخن بین وسخن داں — سخن فہم وسخن ساز وسخن داں

اسی طرح ان کے غزلیہ اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ایک غزل سے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

صبح عید عاشقان نظارۂ رخسار او
حلقۂ محراب طاعات ابروئے خمدار او

---

(۱) بہارستان اودھ: ص ۱۳۳

تا بکوئے عاشقان شد مکن و ماوائے من
ھمچو مردم گشت درچشم ھزاراں جائے من

ایک دوسری غزل کے چند اشعار:

بتی داریم نادانی عزیز ھردل وجانی
بخوبی ماہ کنعانی بملک حسن سلطانی
عجب عیار و خاموش بجام حسن مدھوش
جفا کوش ستم جوش عدو ے عہد پیمانے
چہ محبوب است مرغوبے عجب خوبی خوش اسلوبی
فروغ چشم یعقوبی چہ یوسف پاکدامانی
زمژگان ناوک اندازی ز غمزہ سحر پر دازی
بابروترک جبازی بکف شمشیر برانی

تذکروں میں تاریخ وفات کہیں درج نہیں ۔ البتہ اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء تک زندہ رہے۔

۲۴۔ پرشادی لال جواہر

پرشادی لال نام اور تخلص ''جواہر'' تھا۔ان کے بارے میں بیشتر تذکرے خاموش ہیں جبکہ ان کے صاحب دیوان ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ان کا کلام کافی ملتا ہے مگر اس سے بھی ان کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔دیوان کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔قصیدہ گوئی میں قدرت کمال حاصل تھا۔ان کے قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ندارد طاقت لب ازکلام تازہ سامانی — کہ گلزار سخن رنگین کنم رشک گلستانی
ولی جای عجب دارم کہ در وصف کرامتھا — زبان خامہ چوں زلف پری رویان پریشانی
دلی دارم کہ اوصاف وثنایت درد جان دارد — اگر باد فتد شاھاز ھی اکرام و احسانی
علیم عا دل عالی نگاھی عالم آرای — زبان دان جہاں با رتبہ و شان سلیمانی
ارسطوی بفطرت ای شہ اسکندر ھمت — بمیدان وفا نام تو شمشیر برّانی
دعا فیض واکرام تو درد عالم امکان — شدہ ای دست احسان تو رشک ابر نیسانی
بتوصیف وثنایت جواھر دلخستہ می گوید — کلام تازہ شاھا بازبان گوھر افشانی

۲۵۔ جواہر سنگھ جوہرؔ

نام جواہر سنگھ اور تخلص ''جوہرؔ'' تھا۔ یہ کایستھ تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سنہ پیدائش ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء ہے۔ جوہرؔ کے خاندان کے اکثر بزرگ شاہان اودھ کے دربار میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ مثال کے طور پر رتن سنگھ زخمیؔ جوان کے ماموں تھے یا منولال فلسفیؔ جوان کے جدامجد کے بھائی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد دفتر شاہی کے محکمۂ دیوانی میں جوہرؔ کی تقرری ہوگئی۔ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں جب اودھ کا الحاق انگریزی حکومت میں ہوا۔ اس وقت بھی جوہرؔ تحصیلداری کے عہدہ پر کام کر رہے تھے۔

جوہرؔ کو شعر و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے خواجہ وزیر لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ تذکرہ ''بہار سخن'' نے انہیں فارسی کا صاحب دیوان شاعر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''آپکا فارسی دیوان ''مطلع خورشید'' و ''ارمغان ہندوستان'' کے نام سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ جواہر افلاک، جواہر ادراک نام کی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں'' (۱)

جوہرؔ کا انتقال ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں ہوا۔ ان کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

حرف سوخت ای ماہ چو در انجمن افتد — چو شمع زبان ہمہ در سوختن افتد
آید بنظر ہر رگ گل رشتۂ شمع — از روی تو گر پردہ بصحن چمن افتد (۲)

کار زمانہ غیر حبابی نیافتم — دنیا سوای نقش بر آبی نیافتم
بر ہفت ستارگان مدار است — ہر روز باختری را قرار است (۳)

---

(۱) تذکرہ بہار سخن، ص ۱۲۰

(۲) ایضاً

(۳) تذکرہ روز روشن، ص ۱۵۸

۲۶۔حاجبؔ

اودھ کے معروف شعراء میں ''حاجبؔ'' نام کے ایک شاعر کا بھی ذکر آتا ہے لیکن ان کے بارے میں اتفاق سے کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ پورا نام کیا تھا، کس خانوادہ سے ان کا تعلق تھا، کب پیدائش ہوئی اور کہاں کے رہنے والے تھے۔ حاجبؔ کے سلسلہ میں صرف ''ریاض الفصحاء'' میں چند سطریں ملتی ہیں۔(۱) جن کی روشنی میں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوابین اودھ کے زمانے کے ایک فارسی گو شاعر تھے۔ شعر و شاعری کے میدان میں خصوصاً قصائد اور قطعات کے کہنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ میدان شعر و سخن کے مشہور و معروف شہسواروں میں سے تھے اور نواب سعادت علی خاں کے ملازم تھے۔

حاجبؔ کا جو بھی نمونۂ کلام حاصل ہو سکا ہے اس میں ان کا ایک قصیدہ ہے اور ایک قطعہ ہے۔ اپنے کلام میں انہوں نے اپنے آقا نواب سعادت علی خاں کی شان میں قصیدہ خوانی کی ہے اور قطعہ میں بھی نواب موصوف کی تعریف و توصیف میں کلمات کہے ہیں۔

حاجبؔ کے کلام کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و سخن میں طاق تھا اور اس کا کلام بڑے ذوق شوق سے سنا جاتا تھا۔ اس نے نواب موصوف کی مدح میں جو قصیدہ پیش کیا ہے اس سے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

اے خداوندیکہ پیش آب و تاب گوھرت — شب چراغ چرخ می لرزد چو آب اندرز جاج
پایۂ قدرت ازاں زانسوئے گردوں پانہاد — کافرینش را نہد برسر زدست فخر تاج
خواستم خواھم کفت را کان کہ خورشیدم بہ چشم — گفت کاے کج فہم بیرون کن زطبع ایں اعوجاج
باکفش کا نراچہ حاصل زانکہ دربازار فیض — پیش وجہ اوست نقد سکۂ من تار داج
اے کشادہ ھمت برسا کنان دھر در — وے گرفتہ حشمت از خسروان ملک باج

(۱) ریاض الفصحاء: ص ص ۹۹۔۱۰۰

بندہ پرور کامگارا بندہ را فیض حضور — تا میسر شد میسر شد بساط ابتہاج
تا صفا اندوخت چشمش از جمالت بازرفت — روزگار از چہرۂ صبحش غبار شام واج
شکر یزداں کش کشوں نیشاندہ فیضان حضور — درچنیں روز یکہ خورشیدش بہ شب باشد سراج
تا بہ پر باری مثل شد قصۂ ابر مطیر — تابہ بے برگی ممر شد گفتگوے سروکاج
طالع بے حاصل خصم ترا زحمت قریں — شاھد فرخندہ بخت ترا بہجت مزاج

قطعات سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے وزیری کز قیاس عرض نہ طول شمحت — عقل را گم گشتہ از برگشتگی ھوش و حواس
در سطر لاب خیال اختر شناس وھم دید — پایۂ جاہ ترا بیروں زا مکان قیاس
کردہ از قدرت فراز لامکاں قدرت مکاں — چیدہ از دست بروں از حد کن جاھت اساس
شمحت گرگم کند نبود عجب — چرخ اعظم دست و پادر آں میاں زا بنودہ ناس
اشھی کس ساخت بندد توبہ دار جاہ تو — قبہ ترصیع چرخش می سزد کوی خطاس
تا جہاں دل در امید لطف تو پیوست بست — قابل اسرار تقدیری زباں از حرف ناس
آن چنان دوران بدورت کردہ خوبا ایمنی — کرزم اکنوں طبع وحشی آھول وارد ھراس

۲۷۔ لالہ چتّی لال حریفؔ

لالہ چتّی لال، روشن لال کے بیٹے تھے۔ اور تخلص ''حریفؔ'' تھا۔ یہ کایستھ قوم کے تھے ان کے والدین دہلی کے رہنے والے تھے لیکن حریف کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ان کے بارے میں ریاض الفصحاء کے مصنف لکھتے ہیں:

''از عرصۂ شش سالگی بعضی کتب درسی را از فقیر یاد گرفتہ بمقتضائے موزونیٔ طبع شوق نظم فارسی وھندی در سر دارد و مشہور بہ فقیر میکند ھمیشہ غائب وحاضر بر جادۂ راسخ الاعتقادی تا الی الآن ثابت قدمش یافتہ ام عمرش قریب بست وھفت سالہ از دست ۔۔۔ ''(۱)

چاک کردست جنوں جیب وگریبان مرا — سر بام آو ببین حال پریشان مرا
اندریں وادائی پرشور کہ وحشت خیز است — جز مغیلاں کہ کشد گوشۂ دامانِ مرا

جان من از طپش دل خبر نیست ترا — در پر افشانی بسمل خبری نیست ترا
قیس بیچارہ پس قافلہ دم می شمرد — حیف اے صاحب محفل خبری نیست ترا

آمد بہار دیار بہ سویم نظر نہ کرد — اے وائے نالہ در ددل سختش اثر نہ کرد
شد زخمہائے تیغ جفایش نصیب غیر — روح حریف سینۂ خود را سپر نہ کرد (۲)

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ص ۸۵۔۸۶

(۲) ایضاً، ص ۸۶

۲۸۔ جعفر علی حسرتؔ

مرزا جعفر علی نام اور ''حسرتؔ'' تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں کا پیشہ عطاری تھا۔ ان کے والد مرزا ابوالخیر عطار کے نام سے مشہور تھے۔ لکھنؤ میں ان کی عطاری کی دکان تھی۔ حسرتؔ خود بھی کچھ عرصہ تک اس پیشہ سے منسلک رہے جب تک والد زندہ رہے، حسرتؔ اپنی شاعری کی بدولت امراء اور شاہزادوں کی مصاحبت میں مزے سے زندگی کے دن گزارتے رہے۔ اول مرزا احسن علی خاں بہادر کی سرکار سے تعلق رہا پھر صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ کی مصاحبت میں رہے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ ترک ملازمت کر کے دکان پر بیٹھے مگر عطاری کے پیشہ میں ان کا دل نہ لگا۔ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد کسی درویش کی صحبت سے حسرتؔ فیضیاب ہوئے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔

علوم وفنون کے سلسلے میں کسی تذکرہ سے تفصیل تو نہیں ملتی لیکن اس بات کا انداز ہوتا ہے کہ اس وقت کے رواج کے مطابق انہوں نے فارسی کی سبھی درسی کتابیں پڑھی تھیں شعر وسخن سے خداداد تعلق تھا۔ سرب سکھ دیوانہؔ سے مشق سخن کرتے تھے۔

اصناف سخن میں قصیدہ اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے شعر وسخن پر تبصرہ بھی کیا ہے اور انھیں اساتذہ کا درجہ بھی دیا ہے۔ انھیں تذکرہ نویسوں کے بیانات کی روشنی میں تذکرہ ''سفینہ ہندی'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

> ''شاگرداری سرب سکھ دیوانہ تخلص گردید آخر صحبتش بارای مسطور پرارونشد بطور خود اقسام شعر ہندی گفتہ نام برآورد چند از موزنان (موزونان) شاگرد او شدند عروض و قافیہ از جناب ارشاد مآب تحصیل نمودہ گاہی بعد ماہی شعر فارسی ہم می گفت'' (۱)

مختصر یہ کہ حسرتؔ کا شمار اپنے زمانے کے مشہور فارسی اور اردو شعراء میں ہوتا ہے انھوں نے ابتداً اردو اشعار کہنے شروع کیے لیکن بعد میں فارسی اشعار کی طرف راغب ہوئے اور مرزا فاخر مکینؔ سے عروض وقافیہ پر اصلاح حاصل کی۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے صرف دیوانہؔ کی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً مصحفیؔ لکھتے ہیں:

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۶۲

''درقصیدہ و غزل ید طولیٰ دارد وخود مشورہ شعر بہ رائے سرب سکھ دیوانہ کردہ''(۱)

حسرتؔ نے نہ صرف خود شاگردی حاصل کی بلکہ اس میدان میں انہوں نے خود بھی اپنے بہت سے شاگرد بنائے اور استاد کا درجہ حاصل کیا۔ جن میں اہم ترین قلندر بخش جرأتؔ، نواب محبت خاں اور خواجہ حسنؔ ہیں۔ اس سلسلہ میں ''مجموعۂ نغز'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''وی درممالک شرقیہ علم استادی دریں فن برافراشتہ تلامذۂ بسیار بہم رسانیدہ بود قلندر بخش جرأت رشید ترین شاگردان وی است نسبت بہ سرب سنگھ دیوانہ دارد''(۲)

تذکرۂ گلشن ہمیشہ بہار میں ہے:

'' ... درفکر سنجی وموزونی این فن درزمانہ خویش یگانہ گویند پایۂ برتری سخن ومایۂ تعلّی این فن قلندر بخش جرأت رافیض مشورت اوست''(۳)

حسرتؔ کے کلام کے بارے میں مشہور تذکرہ نگار نواب شیفتہ کا کہنا ہے:

''سلامت عبارت اور عمدگی خیال کے لئے مشہور زمانہ تھے''(۴)

حسرتؔ کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی پاکیزگی ان کے پیشرو شعراء کی طرح بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ ان کے فارسی اشعار تعداد میں زیادہ ہیں اور کلام بھی بہت خوب ہے لیکن فارسی دیوان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔(۵)

ان کے کلام میں بیشتر غزلیں اور قصائد شامل ہیں۔ غزل کے ان اشعار میں حسرتؔ کے عشقیہ مضامین کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

برقع ز عارض برفگن ای مہ چرا پنہاں شدی — در پردہ دلہا بردی و غارتگر ایمان شدی
ظالم نمی گفتم ترا برمن مکشی تیغ جفا — چوں کشتہ دیدی بندہ را ترسیدی و گریان شدی
در خدمت پیر مغان خدمت بجا آوردۂ — حسرت گدا بودۂ سر حلقہ رندان شدی

---

(۱) تذکرۂ ہندی: ص ۱۰۹

(۲) مجموعۂ نغز (جلد ۱) ص ص ۲۰۷۔۲۰۸

(۳) گلشن ہمیشہ بہار: ص ۱۱۱

(۴) گلشن بے خار: ص ۴۷

(۵) دیوان جرأت (قلمی) ص ۴۱۳

۲۹۔ خواجہ محمد حسن حسنؔ

خواجہ حسن نام اور تخلص ''حسنؔ'' تھا۔ ان کے والد خواجہ ابراہیم دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہ خواجہ عنایت الدین رحمتہ اللہ علیہ مودودی کے پوتوں میں سے تھے۔ ''سفینہ ہندی'' میں لکھا ہے کہ خواجہ حسنؔ کا سلسلۂ نسب، خواجہ مودود چشتی علیہ الرحمتہ تک پہنچتا ہے۔(۱) خواجہ حسنؔ پہلے بریلی میں رہتے تھے۔ اس کے بعد فیض آباد آنا ہوا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد لکھنؤ آ گئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ مصحفی لکھتے ہیں:

''پیش ازیں در بریلی استقامت داشت و بعد ازاں در فیض آباد و حالا در لکھنؤ۔ نواب وزیر صاحب عالم عزت و حرمش مشورہ شعر در ابتدا بہ میاں جعفر علی حسرت گردد حالا رجوع ایں معنی بہ قلید بخش جرأت دارد'' (۲)

حسنؔ کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ علم تصوف سینہ بسینہ خاندانی طور پر انہیں ورثے میں ملا تھا۔ یہ صفت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہاں تک کہ ''گلشن ہند'' میں انہیں تصوف کا بادشاہ کہا گیا ہے، ساتھ ہی علم موسیقی سے ان کی دلچسپی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس فن میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی، اس بات کا ذکر بیشتر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، مثال کے طور پر مرزا علی لطفؔ لکھتے ہیں:

''... بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں اور فقر و درویشی میں تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں۔ خصوصاً علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل امورات دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں سے ہے ...'' (۳)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۶۳

(۲) تذکرۂ ہندی: ص ۱۰۷

(۳) گلشن ہند: ص ۸۹

ان کے سلسلہ میں ایک اور تذکرہ نگار کا بیان ہے:

''از بادۂ تصوف سرشار و در موسیقی ماہر کار نغمہ خوش آہنگ از قانون سینہ صد رنگ می تراوید و گوش طنبور ترانہ بدست اصوات مختلفہ می مالید شورے در دل داشت بہ لکھنؤ بافتخار و درویش با تمکین بود'' (۱)

لکھنؤ میں حسنؔ کا تعلق ایک ''بخشی'' نامی عورت سے تھا۔ اس بات کا ذکر تقریباً ان تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے جنہوں نے حسنؔ کو اپنے تذکروں میں شامل کیا ہے۔ حسنؔ اور ''بخشی'' کی کہانی جرأتؔ (قلندر بخش) نے ایک مثنوی کی شکل میں نظم بھی کی ہے جو ''کلیات جرأت'' کے متعدد نسخوں میں موجود ہے۔ (۲) جرأت اور حسنؔ کے تعلقات اچھے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے کافی قریب بھی تھے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر حسنؔ کا اصل کمال ان کا فن شاعری ہے اگر چہ یہ ریختہ کے شاعر تھے اور جعفر علی حسرتؔ سے انہیں شرف تلمذ تھا لیکن فارسی میں بھی اکثر اچھے اشعار کہہ جاتے تھے۔ ہندیؔ لکھتے ہیں:

''بسار پسندیدہ اطوار و خوش گفتار است گاہی فکر شعر فارسی ہم می نماید ... (۳)

یہاں ان کے دو شعر نمونے کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں:

واجب تخم آمدہ است و ممکن چو شجر
در واجب و ممکن نبود فرق دگر
عالم ہمہ شاخ ہای آن نخل بود
در عالم ممکنات انسان چو ثمر

---

(۱) گلشن ہمیشہ بہار: ص ص ۱۱۴۔۱۱۵

(۲) گلشن ہند: ص ۵۵

(۳) سفینۂ ہندی ص ۶۳

۳۰۔ میر غلام حسن حسنؔ

میر غلام حسن نام اور تخلص ''حسنؔ'' تھا۔ ان کے والد میر غلام حسین ضاحکؔ دہلی کے رہنے والے تھے ان کے بزرگوں کا اصل وطن ہرات تھا۔ حسنؔ کی پیدائش ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں دہلی میں ہوئی (۱) ابتدائی بارہ سال کا زمانہ یہاں گزار کر انہوں نے مشرق کی طرف رخ کیا۔ فیض آباد آئے اور نواب سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ کے خوان نعمت سے فیضیاب ہوئے ''مجموعۂ نغز'' میں ان کے احوال یوں لکھے ہیں:

''اصلش از ایران ومولدش ھندوستان جنت نشان است در سید واڑہ دہلی کھنہ تولدش واقع شدہ گردش دور دوار ویرا بدیار مشرق انداختہ در فیض آباد ملازم سرکار سردار جنگ خلف رشید نواب سالار جنگ گشتہ شاگرد میر ضیاالدین ضیاء است واز خدمت سر آمد شعرائے فصاحت ... کلام شاعر فصیح زبان عذب البیان است'' (۲)

حسنؔ کا شمار دراصل اردو شعراء میں ہوتا ہے لیکن اس زمانے کے رواج کے مطابق اردو شعراء فارسی میں بھی اشعار کہا کرتے تھے۔ دہلی میں میر حسنؔ اپنے والد میر ضاحکؔ سے، پھر خواجہ میر دردؔ سے اصلاح سخن لیتے رہے اور جب اودھ آئے تو میر ضیاء الدین ضیاؔء کی شاگردی حاصل کی۔ شروع میں فیض آباد میں قیام رہا پھر مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے۔ ''گلشن ہمیشہ بہار'' میں ہے:

''در عنفوان شباب بفیض آباد آوردہ در سرکار نواب آنجا کامیاب ماندہ از تلامذۂ ضیاالدین ضیا است ... کلامش شستہ ورفتہ و بآب وتاب است'' (۳)

باغ معانی میں تھوڑی اور تفصیل ملتی ہے:

''مدتہا شد کہ شاھجہاں آباد آمدہ در فیض آباد کہ بدین گاہ شہرت گرفتہ معہ والد مقیم در شعر ریختہ کہ عبارت از زبان مختلط ہندی وفارسی وروزمرہ ھندوستان زایان ست بسیار ماھر

---

(۱) گلشن بے خار: ص ۷۵

(۲) مجموعۂ نغز (جلد ۱): ص ۲۰۲

(۳) گلشن ہمیشہ بہار: ص ۱۱۲

وخوش گوست۔ شعر فارسی ہم گاہ گاہ میگوید و بمزہ میگوید''(۱)

حسنؔ نے چونکہ بیشتر اردو میں کہا ہے، لہذا ان کا فارسی کلام بہت کم ملتا ہے لیکن جو کچھ موجود ہے، ان کی ممتاز حیثیت تسلیم کرانے کے لئے کافی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر:

ای شمع مپرس سرگذشتم　　خاموش کہ من زسر گذشتم

رباعی کے ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں:

جانا تو امید نگاھی داریم　　امید نگاھی زتو گاھی داریم
ماکشتۂ چشم سرمہ سایم حسن　　نی نالہ ونی فغان نہ آھی داریم

از بسکہ شکستہ تازستم توبہ　　فریاد ھمی کند زدستم توبہ
دی روز بتوبہ ای شکستم ساغر　　امروز بشیشہ آں شکستم توبہ

ان کے کلام سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اندازِ بیان انتہائی سادہ اور فصیح تھا۔ سادے الفاظ میں پُرمعنی باتیں کہہ جاتے تھے۔ گلشن سخن کے مصنف لکھتے ہیں:

''مضامین سخنہایش تازگیھا دارد''(۲)

ان کی غزلیں اور مثنویاں بہت مشہور ہوئیں۔ اس کے علاوہ شعراء کا ایک تذکرہ بنام ''تذکرہ شعرائے اردو'' بھی ہے جو فارسی زبان میں تالیف کیا یہ تذکرہ فیض آباد میں ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء اور ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء کے درمیان ترتیب دیا گیا اس سے فیض آباد کی ادبی نشستوں پر وافر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

حسن کی وفات تقریباً ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء لکھنؤ میں ہوئی (۳) مفتی گنج لکھنؤ میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھلے حصہ میں دفن ہوئے۔ مصحفیؔ نے تاریخ وفات کہی:

چوں حسن آن بلبل خوش داستاں　　روازیں گلزار رنگ وبوبتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفیؔ　　شاعر شیریں زباں تاریخ یافت

۱۲۰۱ھ

---

(۱) باغ معانی: ص ۵۴

(۲) گلشن سخن: ص ۱۱۵

(۳) آب حیات: ص ۲۴۵

۳۱۔ مرزا باقر حقیرؔ

مرزا باقر نام اور ''حقیر'' تخلص تھا۔ یہ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اس وقت اودھ کے حکمراں نواب صفدر جنگ بہادر تھے۔ مرزا باقر نے اودھ جا کر نواب کی سرکار میں ملازمت اختیار کر لی۔ شعر و شاعری سے از حد عشق تھا لہذا شعر کہتے تھے، اور میر شمس الدین عباسی دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ اساتذۂ سخن کے بے شمار دواوین کا مطالعہ کیا اور اپنی شاعری کو جلا بخشی۔ اسی دھن میں زندگی بھر رہے۔ اساتذۂ سخن کے کلام کا مطالعہ کرنا، انہیں جمع کرنا اور شعر کہنا ان کے مشاغل تھے۔ مرزا باقر کے کلام کے نمونے یہ ہیں:

من اسیر دام آن زلف دوتا خواھم شدن　　از پریشانی بصد غم مبتلا خواھم شدن

پریروی کہ دلہا در خم زلفش پریشان شد　　نظر انداخت در آیینہ و برخویش حیران شد(۱)

بلب نا آشنا گردان پریر و ساغر می را　　زحسرت شد دل پرخون کباب آھستہ آھستہ
کشادہ عقدۂ دل جستم از زلفش ندانستم　　کہ خواھد شد ازان در پیچ وتاب آھستہ آھستہ
چہ نیکو ساعتی باشد کہ عرض مدعا گویم　　بآن خورشید سیما بی حجاب آہستہ آہستہ (۲)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۶۱

(۲) باغ معانی: ص ۵۳

۳۲۔ مولوی محمد عوض حکمتؔ

محمد عوض نام اور ''حکمت'' تخلص تھا۔ یہ جونپور کے رہنے والے تھے۔ اکثر بنارس جا کر قیام فرماتے۔ شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ فضل و کمال میں یکتائے زمانہ تھے۔ شاگردوں کا حلقہ بڑا تھا۔ سفینۂ خوشگو میں ہے:

''در فضل و کمال یگانہ وقت بآئین آزادگی بسر می برد اکثر اوقات بہ بنارس تشریف می آرد قضات کرام و طلبہ علم ازو در حساب می باشند بدقائق شعری بسیار می رسد اغلب اوقات بجنون ساختہ می گزراند ... ''(۱)

''حکمت'' پر عین نوجوانی میں جبکہ عمر عزیز ابھی تیس سال کی تھی، جنون کا دورہ پڑا جو تا حیات طاری رہا جسکی وجہ سے ہوش و حواس جاتے رہے تھے، راہ چلتے تو محلے کے بچے آوازہ کستے اور ان پر پتھر پھینکتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ بازار سے گزر رہے تھے، بچوں نے اس بُری طرح سنگریزوں سے وار کیا کہ لہولہان ہو گئے۔ اسی حال میں تھے کہ سر راہ ایک قدیم آشنا سے ملاقات ہو گئی۔ حکمت نے فوراً یہ شعر پڑھا:

سرم از سنگ طفلان لالہ زاراست
جنون گل کرد ایام بہار است (۲)

حکمتؔ کا انتقال ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں ہوا۔ ان کا ایک اور مشہور شعر ہے جس میں جنون اور دیوانگی کا خاصا ذکر ہے۔

سوئی دریا شد خراماں یا بہاموں رفتہ است
طفل اشکم بیخبر از خانہ بیرون رفتہ است (۳)

---

(۱) سفینۂ خوشگو، ص ۳۰۰

(۲) سفینۂ ہندی، ص ۶۳

(۳) ایضاً

۳۳۔ میر حیدر علی حیرانؔ

میر حیدر علی نام اور حیرانؔ تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ پیدائش بھی یہیں ہوئی سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مشرقی ممالک خصوصاً لکھنؤ میں گزارا۔ کچھ عرصہ تک راجہ ٹیکٹ رائے (۱) کی سرکار سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خان کی امارت میں بھی گزارا اس کے بعد نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ایک ممتاز درجہ پر فائز ہوئے مصحفیؔ نے انھیں مرد سپاہی پیشہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مرد سپاھی پیشہ است از چندے در سرکار راجہ ٹکیت رائے در سواران عز و امتیاز دارد و بندہ اورا در لکھنؤ دیدہ ام ۔۔۔ (۲)

شعر و شاعری کا شوق ابتداً سے تھا رای سرب سکھ دیوانہؔ کے شاگرد تھے۔ دیوان اگرچہ ترتیب نہ دے سکے لیکن غزلیات و قصائد کافی ہیں۔ ان کا کلام اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔ میر حسنؔ سے بھی کافی دوستی تھی۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں اپنے مصاحب میں ممتاز درجہ دیا تھا۔ حیران نے کئی ایک مدحیہ قصائد نواب موصوف کی شان میں لکھے۔ نواب کی وفات کے بعد حیران مانکپور (بہار) کی طرف چلے گئے۔ جہاں راجہ دلپت سنگھ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ مگر کمال یہ ہے کہ مرنے سے پہلے بڑی بہادری کے ساتھ راجہ مذکور کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

سنہ وفات میں اختلافات ہیں۔ ''دستور الفصاحت'' (مرتبہ عرشی رامپوری) میں ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء بتایا گیا ہے۔ جبکہ ''گلشن ہند'' میں ہے کہ وہ ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء تک زندہ تھے۔ اور نواب آصف الدولہ کی سرکار سے تنخواہ پاتے تھے۔ (۳)

---

(۱) نواب آصف الدولہ کے دیوان تھے۔

(۲) تذکرۂ ہندی: ص ۷۹

(۳) گلشن ہند: ص ۸۶

حیرانؔ کے اکثر فارسی اشعار بڑے عمدہ ہیں اس سلسلے میں ''گلشن سخن'' کی عبارت ملاحظہ ہو:

''درزمرہ نکتہ سنجان پسندیدہ محسوب است''(۱)

ایک اور تذکرہ کے مطابق:

''اشعاران کے سب کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے استادانہ ہے ۔استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے''(۲)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

نسبتی گل رانباشد بارخ نیکو یی دوست — چوں گلستان جنان خوشتر شمارم کوی دوست
من کجا و محرمان بزم خاص او کجا — می شمارم خویش را کم از سگان کوی دوست
ناتوان و لاغر و زار و نزار و خم شدم — چون مہ نودر خیال گوشہ ابروی دوست
نیست آرام دمی بر در او تا نروم — الاعلاجم چکنم آہ روم یا نروم
چو فردا از زمین با دیدۂ نمناک برخیزم — بشویم خویشتن را از سرشک و پاک برخیزم

رباعی کا نمونہ:

در ھجر تو سخت بیقرارم رحمی — تاب غم تو دگر ندارم رحمی
تا چند جفا و جورو بیداد کنی — رحمی رحمی بحال زارم رحمی(۳)

---

(۱) گلشن سخن، ص ۱۱۰

(۲) گلشن ہند، ص ۸۵

(۳) سفینہ ہندی، ص ۶۴

۳۴۔ منشی خیالی رام خیالؔی

خیالی رام نام اور تخلص خیالؔی تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے سریواستو اکائیستھ تھے۔ ''تذکرۂ بہار سخن'' نے انہیں مرزا حسن قتیلؔ کا شاگرد بتایا ہے۔(۱) خیالی کے بارے میں ہمیں وافر معلومات فراہم نہ ہوسکیں سوائے اس کے کہ یہ واجد علی شاہ کے عہد میں سرکاری ملازم تھے۔ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

فارسی نظم ونثر پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ لیکن طبیعت کا میلان زیادہ تر نثری تصنیفات کی طرف تھا۔ ''نریندر بہادر سریواستو'' ان کی نثری تصنیفات کی تعداد سو کے قریب بتاتے ہیں۔(۲) ان میں اہم ترین آئینہ خیالی، عقد الجواہر، گنجینۂ خیالی، شرح انشائے طاہر اور شرح اعجاز خسروی ہیں۔ انہیں ترکی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔

خیالی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں:

دلم زپر تو نور است آنچنان پُر نور — کہ لوح سینا بود تابناک چون طور
منور است چنان طبع تیرہ ام کہ رسد — شعاع روشنی او ز استعارہ بطور
زکلک خانۂ شعبان وسم بگاہ سواد — بمعجزات عصای کلیمؑ کردہ ظہور
بگوش انجم وگردوں رسد بلاکم وکاست — شکوہ دائرہ ونقطہ اش بچشم شعور
بعکس شمسۂ او شمس آسمان محتاج — چو ماہتاب کہ باید زمہر پر تو نور
صفای ریختہ اش ریختہ بخاک سیاہ — بنای منزلت قصر و قیصر مغفور (۳)

---

(۱) تذکرۂ بہار سخن: ص ۱۵۲

(۲) نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان، ص ۱۲۰

(۳) ایضاً

۳۵۔ مکھن لال رائی

نام مکھن لال اور تخلص ''رائی'' تھا۔ ان کے والد لالہ اجمیری لال اکبر پور کے مضافات میں موہن پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباواجداد یہاں کے پرانے زمینداروں میں سے تھے۔ ان کے دادا رام پرشاد، نول رائے بہادر نائب نواب صفدر جنگ کے یہاں بخشی گری کرتے تھے۔ بعد میں مکھن لال اور ان کے تمام خاندانی افراد لکھنؤ میں آکر مقیم ہوئے۔

مکھن لال رائی نے فارسی علم و ادب کی تعلیم بچپن میں ہی حاصل کرلی تھی۔ بڑے ہوئے تو طبیعت شعروسخن کی جانب مائل ہوئی ''سفینۂ ہندی'' میں ہے:

''اکثر بجودت طبع وجدت رای ابیات رنگین بر صفحہ روزگار مینگارد واز نظر اصلاح مولف می درآرد جوان پسندیدہ اطوار آرمیدہ مزاج عالی طبع شیریں گفتار است'' (۱)

تذکروں میں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملتے ہیں لیکن کلام سے متعلق دیگر تفصیلات نہیں ملتیں۔ انکے اشعار عاشقانہ ہیں۔ الفاظ کا استعمال مناسب انداز سے کیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

باز آمدنت باعث آبادی جان شد — از عیش دل پیر دگر بار جوان شد
تایا ربہ پرسید ز حال دل زارم — ازضعف ہمہ قامت من خم چوکمان شد
تایار زبر تیر صفت راست بدر جست — ہر راز کہ در سینہ نہان بود عیان شد
تا ازبرمن رخت سفر باز بہ بستی — صد پیک سرشکم زبرای تو روان شد
ای ہمنفس از حال دل رای چہ پرسی — درعشق کسی خوب وخوروتاب وتوان شد

رائی کی وفات لکھنؤ میں ہوئی۔

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۹۶

۳۶۔رای کھیم نرائن رنؔد

کھیم نرائن نام اور تخلص ''رنؔد'' تھا۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔(۱) بعد میں لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے۔ ان کے دادا لالہ لچھمی نرائن، نواب صفدر جنگ کے یہاں وکالت کے عہدے پر مامور تھے۔ رنؔد جب بڑے ہوئے تو نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے اور پانچ سو روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ رنؔد کو علم طب میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہی پیشہ اختیار کیا۔

فارسی زبان و ادب سے رنؔد کو خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کے متعلق مؤلف ''تذکرہ ہندی'' لکھتا ہے کہ انہوں نے تقریباً بیس ہزار فارسی ابیات کہیں۔(۲) قصۂ چہار درویش، بروزن خسرو شیریں اور افسانۂ ہیر و رانجھا بروزن نل دمن اور دیگر کئی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ شروع شروع میں اپنا کلام بھگوان داس ہندیؔ کو دکھاتے تھے۔ اشعار کا نمونہ یہ ہے:

یاد باد آنشب کہ در پہلوی ما جا داشتی
دست زیر گردن و صدفتنہ برپا داشتی

گرچہ مثل کہر باز ردم زبی برگی ولی
از چناں منت کش برگ گیاھی نیستم

رنؔد اپنی زندگی کے آخری زمانے میں کلکتہ چلے گئے تھے اور وہیں ہوگلی کے پاس رہنے لگے اور وہیں وفات بھی پائی۔

---

(۱) سخن شعرا: ص ۱۹۲

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۸۸

۳۷۔ میر جعفر روحؔی

میر جعفر نام اور تخلص ''روحؔی'' تھا۔ یہ لکھنؤ کے مضافات میں قصبہ زید پور کے رہنے والے تھے۔ تاریخ تولد اور تاریخ وفات کا تذکروں میں کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی انکی زندگی کے دوسرے پہلو پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

روحؔی فارسی کے اچھے شاعروں میں سے تھے۔ شاعری میں انہیں شرف تلمذ کریم داد خاں رونقؔ سے حاصل تھا۔(۱) ان کے اشعار میں صوفیانہ رنگ ہے مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کشف چشمی تو ولی فتنہ قامت باقیست
نیست آرام بمردن کہ قیامت باقیست
نفس از گرم روی پای بہ منزل دارد
دلا دراں فکر کہ در خانہ اقامت باقیست
ھمدم خضر شوای تشنہ لب ناکامی
کہ نفس آبحیاتست و بکامت باقیست

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۹۵

۳۸۔ روشن لال روشنؔ

نام روشن لال اور تخلص ''روشنؔ'' تھا۔ ان کے والد لالہ اودھی لال کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے دادا سبھا سنگھ مؤلف ''سفینۂ ہندی'' کے چچا تھے۔ راجہ نول رائے کے ساتھ افغانوں سے کی گئی جنگوں میں شریک تھے۔ اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ اس وقت روشنؔ کے والد دو سال کے تھے۔

روشنؔ کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کے تمام خاندانی افراد پہلے لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ پھر درمیانی کچھ سال ڈلمو میں گزارے دہلی بھی جانا ہوا۔ لیکن تمام جگہوں سے گھوم پھر کر یہ لوگ واپس پھر لکھنؤ آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ (۱)

روشنؔ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ مشاعرے کی محفلوں میں شریک ہوتے اور اکثر فارسی کے اچھے اشعار کہتے تھے۔ ان کا فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

گر یار قدم بفرقم آرد — سر پای برآسمان گزارد
از آھن و سنگ گر بود دل — کی تاب گداز عشق دارد
دامن شودش کنار دریا — عاشق اگر آستیں فشارد
عیسیٰ شود از طبیب عاشق — بی یار بدرد جان سپارد
کاغذ زرد و قلم شگافہ — گر روشنؔ درد دل نگارد

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۹۸

۳۹۔ کریم داد خاں رونق

نام کریم داد خاں اور تخلص ''رونق'' تھا۔ ان کے آبا و اجداد افغانستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے باپ حق داد خاں کالنجر کے مضافات میں قصبہ سوندامن کے تھے۔ بعد میں یہ لوگ لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے رونق کی پیدائش لکھنؤ کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہندی لکھتے ہیں:

''والدش حق داد خان ملای مکتب دار خاندان راقم بود چون جدم از قصبہ مسطور ترک وطن کرد وبہ لکھنؤ تشریف آورد واورا معہ عیال واطفال ھمراہ آورد''(۱)

رونق نے دانشور و سخنور حضرات کے درمیان رہ کر اپنی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ علماء کی درسی کتابیں اور شعراء کے دواوین کا بخوبی مطالعہ کیا۔ طبیعتاً خوش خلق اور شیریں زبان تھے۔ ان کے کلام میں تقریباً ایک ہزار فارسی اشعار ہیں۔ ہندی نے رونق کی کئی ایک صفات بیان کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اکثر معلمان شہر و بیرنجات استفادہ از و میگرفتند، در اصطلاح ولغت مہارت کلی داشت جناب ارشاد مآب اورا رونق بزم میفرمودند و در مشاعرہ بطرف دست راست خود مینشانیدند ۰۰۰ ''(۲)

ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

شد بال کشا قمری و خوش گفت سخن را　　از سرو بود مصرع برجستہ چمن را

رباعی کا نمونہ:

خواھم کہ بہ بندخم گیسوی تو باشم　　آزاد زدیں گردم و ہندوی تو باشم
جانرا خبری نیست دل از سینہ ربودی　　قربان سبکدستئ بازوی تو باشم

''رونق'' کچھ عرصہ عظیم آباد بھی جا کر رہے۔ عظیم آباد کے ناظم راجہ رام نراین نے رونق کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔ انکی وفات اسہال کے مرض میں واقع ہوئی۔ تاریخ وفات کہیں نہیں ملتی۔

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۸۷

(۲) ایضاً

۴۰۔ لالہ شتاب رای زآر

نام شتاب رای اور تخلص ''زآر'' تھا۔ انکی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔ ان کے خاندان کے بیشتر بزرگ افراد نوابین اودھ کے دربار سے منسلک رہ چکے تھے۔ خود ان کے چچا لالہ مہتاب رائے۔ نواب آصف الدولہ کے منشی راجہ بشن سنگھ کے دیوان تھے۔ زآر نے ابتدائی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی۔

فن شاعری میں زآر نے نمایاں کمال حاصل کیا اور خود اشعار کہنے لگے شعر و سخن میں سرب سکھ دیوانہ سے اصلاح لیتے تھے۔(۱) ان کے بارے میں دیگر تفصیلات نہیں ملتیں۔ تذکروں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فارسی کے ایک اچھے شاعر تھے۔ اور نواب آصف الدولہ و نواب سعادت علی خاں کے عہد میں دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے یہ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

با مید یکہ روزی چشم بر رویتو اندازم
شوم درویش و بستر برسر کویتو اندازم
من از بیطاقتی آھستہ آیم برسر کویت
کہ خود را رفتہ رفتہ تا بہ پہلو اندازم
ھمہ کس ای مہ بیمہری بینند ماہ نو
بیا تا من نظر برطاق ابر ویتو اندازم
اجازت گر دھی ایں زار بی تقصیر محزوں را
بیارم خوش بپای سرو دلجویتو اندازم

---

(۱) سفینۂ ہندی، ص ۱۰۱

۴۱۔ میر اولاد علی زآیر

نام میر اولاد علی اور تخلص ''زآیر'' تھا۔ ان کا شمار سادات بنی کسمکہ میں ہوتا ہے۔ پیدائش اودھ میں ہوئی۔ علم وادب کی تعلیم شیخ علی حزیں کی صحبت میں رہ کر حاصل کی۔ علم طب میر محمد عسکری جونپوری سے حاصل کیا۔ اور شعر وشاعری میں مرزا فاخر مکین سے اصلاح لی۔ زآیر کا بیشتر وقت دوسرے ممالک کی سیاحت میں گزرا۔ ہندی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''مشہور بکمونہ اند مولدش صوبہ اودہ است اکثر دریں ضلاع گزرانیدہ و بسیر بنگالہ نیز پرداختہ و بزیارت عقبات عالیات عراق مشرف شدہ در وقت معاودت از راہ خشکی با یران رسیدہ بافضلای وشعرای آنجا صحبت داشتہ بہ مشہد امام رضا علیہ السلام مشرف اندوز گشتہ باز بہ ہندوستان مراجعت نمودہ''(۱)

وفات سے کچھ عرصہ پہلے زآیر اپنے عزیزوں کے ہمراہ عراق روانہ ہو گئے تھے۔ صحیح تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔

زآیر کا پیشہ طبابت کا تھا لیکن شعر وشاعری بھی کبھی کبھار کیا کرتے تھے۔ اشعار بہت کم ہیں لیکن جو کچھ کہا ہے وہ زبان وبیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور فصیح ہے۔ ان کے کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

خبر برید خدارا دگر بشیخ حرم
بکعبہ زایر گم کردہ راہ می آید

تنہا ھمیں سپہر مرا بر زمین نزد — چون من بسی بخاک زدا ماچنیں نزد
فرصت کجاست تادم دیگر کہ چون جناب — یک کسی دمی نزد کہ دم واپسیں نزد
ھر چند عقدہ زد فلک دون بکار او — زایر گہی زغصہ گرہ برجبیں نزد

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۹۹

آمده یا از منش شاید گمانی مانده است
پرسد احوال مرا داند که جانی مانده است
کشتی و من زنده گشتم راندی و باز آمدم
هر چه خواهی حاضرم گر امتحانی مانده است
او بعزم خانه و جان نیز در فکر رحیل
صبح نزدیکست وشب رفته است وآنی مانده است

شیوهٔ حسنش که شوری تا بچیں می افگند
گه شکن در زلف وگه چین برجبیں می افگند
بخت وگردوں راعجب زور آزمائیها بماست
آن اگر بردارد اول آخر ایں می افگند
سر بکف دارم اگر شمشیر بر سرمیزند
جان هدف کردم اگر تیر از کمیں می افگند

۴۲۔ شیخ فضل حق ساحرؔ

شیخ فضل حق نام اور تخلص ساحرؔ تھا۔ غلام مینا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد شیخ فضل امام اودھ کے مشہور قصبہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ ساحرؔ کی پیدائش اسی مردم خیز قصبہ میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد نثر نویسی کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جلد ہی میلان طبع فارسی اشعار کی جانب ہوا اور اس طرح ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔

اس راہ میں ساحرؔ نے اس وقت کے مشہور شاعر مصحفیؔ کو اپنا استاد بنایا۔ اپنے کلام پر مصحفیؔ سے اصلاح لیتے تھے اور مشاعروں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوتے تھے۔ بڑی حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ساری خوبیوں کے باوجود ساحرؔ کے حالات زندگی تذکروں میں دستیاب نہیں۔ صرف مصحفیؔ نے جو ساحرؔ کے استاد تھے اپنے تذکرے ''ریاض الفصحاء'' میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس وقت ساحرؔ کی عمر پچیس (۲۵) سال تھی۔ (۱)

ساحرؔ کے شعری سرمایہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے عہد کے معروف شاعر تھے، ممکن ہے صاحب دیوان بھی رہے ہوں، اگرچہ تذکروں سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ساحرؔ کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں وہ معنوی اعتبار سے نہایت فصیح ہیں اشعار سادہ و رواں ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک غزل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زبس شرار غم از استخوان من برخاست — چہ شعلہا کہ پس از مرگ از کفن برخاست
بذوق غربت کوئے تو ہر کہ داشت دلی — غبار غم شد واز کوچۂ وطن برخاست
مگر در آتش گل سوخت بلبل شیدا — کہ بوئے مرغ کباب امشب از چمن برخاست
زبسکہ از تف دل اشک گرم از مژہ ریخت — ہزار شعلہ ز ہر تار پیرھن برخاست
بہ گلشنی کہ جو ساحر رویم نالۂ گرم — شرر ز مغز دل مرغ نغمہ زن برخاست

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۱۴۷

ان کے بیشتر اشعار یاس وامید اور حسرت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں گویا عشق میں انھیں سوائے ناکامی اور نامرادی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے:

نہ دیدم(۱) جنس از الفت بباز ار یکہ من رفتم — نہ چیدم جز گل حسرت بہ گلزار یکہ من رفتم
نمکدانہا نگوں کردم بہ داغ سینۂ بلبل — بایں افغان دلکش در چمن زار یکہ من رفتم

اکثر محبوب کے حسن کی تعریف بڑے دلفریب انداز میں کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو اس عشق میں گرفتار پاتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

آں شمع کہ شب رہ بہ شبستان من انداخت — آں شمع کہ شب رہ بہ شبستان من انداخت
مہری زدہ بودم بہ لب نکتہ سرائے — وصف خط و خال تو مرا در سخن انداخت
آں تیشہ کہ برکوہ جگری زنم امروز — صد شعلۂ غیرت بدل کوھکن انداخت
نازم بخم زلف رسائی تو کہ دل را — از دام رھا کردہ بچاہ ذقن انداخت
فریاد من خستہ زدست دگری نیست — عشق است کہ کارم بتو پیمان شکن انداخت
زندان غم تست کہ یوسف صفتاں را — چوں ساحر غربت زدہ دور از وطن انداخت

چند متفرق اشعار:

کسے از جوھر تیغ گل انداماں خبر دارد — گہ دردستی دل خوں گشتہ در یکدست سر دارد
بہ پیش چشم آں کافر بہ بیدرداں نظر دارد — کہ میگوید فغاں عاشق شیدا اثر دارد

تا کار پائے شوق ز سرمی تواں گرفت — راہ عدم چو شمع سحر می تواں گرفت
سرگشتہ ماند پیک قضا عمرھا و گفت — حاشا سراغ ساحرا گرمی تواں گرفت

اے با درسی آخر تا دامن یار من — دوشت چہ گراں گردد از مشت غبار من
پروانہ صفت گردد گرد تو غبار من — اے گل شبکے باشی گر شمع مزار من
وقتیکہ دریں صحرا ترکانہ بہ صید آئی — ظلم است اگر پوشی چشمی ز شکار من

---

(۱) ندیدم

دل رفته ز کف بیروں جا کرد بسر سودا
تا برسر کوی او افتاد گزار من

زیں رشک چساں آتش در دل نه فتد ساحر
شد بزم کساں روشن از شعله عذار من

مارا به قید جسم و غم جاں گداختند
ایں شمع را به تیر شبستاں گداختند

آتش دلان دشت فراق تو کوه سنگ
سیماب ساں ز گرمئ افغاں گداختند

از غیرت تو اے نئے کلک هندیم
آتش دمان خاک صفاهان گداختند

در عشق برق روی بتے از از ل مرا
سرتا قدم چو ساحر نالاں گداختند

نگه به گوشۂ چشمت بدل چناں افتد
که تیر برهدف از حلقۂ کماں افتد

کشاده ام بدعا دست و دل کشیدم پیش
که گرخدنگ تو افتد بریں نشاں افتد

ما رنجه زبی رحمئ صیاد نه گردیم
از دام اگر سردهد آزاد نه گردیم

شاید لب تشنه زند آب بقائے
آزرده دل از خنجر فولاد نه گردیم

این آن غزل دلکش نوری است که فرمود
آن نیست که از عذر ستم شاد نه گردیم

تا شمع صفت سوخت تمنای تو مارا
چشمی است سراپا به تماشای تومارا

چه ناله در قفس اے مرغ گلستاں زدۂ
که پهلوئے من خونین جگرستاں زدۂ

نه بیم حشر نه اندیشۂ جزای هست
تو جور پیشه نه دانستۂ خدای هست

۴۳۔ لالہ سکھراج سبقتؔ

لالہ سکھراج نام اور ''سبقتؔ'' تخلص تھا۔ خاندانی تعلق استھانہ کایستھ قوم سے تھا۔ ان کا اصل وطن لکھنؤ کے مضافات میں واقع تھا۔ آبا و اجداد وزیر عمدۃ الملک اسد خاں کے دربار سے وابستہ تھے۔ سبقتؔ جب سن شعور کو پہنچے تو حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ صرف ونحو، منطق، بیان ومعانی اور تواریخ نیز دیگر صنائع وبدائع ریاضی وطب کے ساتھ ساتھ علم تصوف کی طرف بھی توجہ کی۔

سید اسد اللہ خاں معروف بہ نواب الاولیاء اور امیر الاولیاء سید حسین علی خاں کی ملازمت میں تمام عمر بسر کی۔ سید حسین علی خاں کے ساتھ دکن کی مہم میں شریک ہوئے اور ''جنگ نامۂ فتح'' کے عنوان سے ایک مثنوی سید حسین علی خاں کے اعزاز میں فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھ کر خان موصوف کی خدمت میں پیش کی۔ سبقتؔ نیاس مثنوی میں تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل جنگ کا حال نظم کیا تھا۔ نواب نے سبقتؔ کو پنج صدی منصب عطا کیا۔ اس مثنوی سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کتابیست رنگیں سواد چمن — کہ دارد زنام خداھر سخن
چہ معنی کہ در نسخہ ام حرف نیست — برنگینئ حرف شنجرف نیست
کجا شاعری معنی اندیشۂ — بتلمیذئ حق خرد پیشہ
خرد پیشہ ام حرف حق می زنم — تقابی ز تحقیق شق می زنم (۱)

سبقتؔ نے عمر کا آخری حصہ ''راجا گردھر بہادر گجراتی'' کے یہاں گزارا۔ لیکن سوئے اتفاق کہ کچھ عرصے بعد راجہ سے کسی معمولی چپقلش کی بنا پر جنگ ہوئی، جس میں سبقتؔ ہلاک ہوگئے۔ ماہ شعبان ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۶ء میں وفات پائی۔

سبقتؔ شعر وشاعری میں مرزا بیدلؔ کے شاگرد تھے، خوشگوؔ نے ان کے شعر وسخن اور ذوق علم کے

---

(۱) سفینۂ خوشگو: ص ۱۶۰

بارے میں یوں لکھا ہے:

''نتائج طبعش، کہ قریب دہ ھزار بیت بود ھمیشہ ھمراہ داشت مع مال واسباب دراں ھرج مرج متفرق شد۔ مگر چند شعر از مشقھای اولش کہ بیاد فقیر ماندہ وسوای آں از و یادگاری نماند صورت ارقام می یابد ...''(۱)

سادہ الفاظ کا استعمال کر کے بامعنی مفہوم ادا کرنا سبقتؔ کی خصوصیت شعری ہے۔ لہذا انھوں نے ہمیشہ سادہ اور پر کیف الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نقش علی مؤلف تذکرہ ''باغ معانی'' سے بھی سبقتؔ کے تعلقات استوار تھے اکثر شعر وسخن کے سلسلہ میں ان سے سلسلۂ کلام رکھتے تھے، خود مؤلف نے اس بات کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے لکھتے ہیں۔

''نوجوانیست تازہ فکر از عروض وقافیہ وغیرہ فنون شعر باخبر طالب علمی ھم دارد با فقیر میرزا بیدل مربوطست وصاحب تلاش وطبعش مایل ترقی اوراست''(۲)

اشعار کے نمونے:

بنامش کہ شیر حق از آگہی است ادب سکتہ معذور اسداللہی است

چو نقش پا بہ سر کوی انتظار کسی نشستہ ام کہ شوم خاک رھگزار کسی

مرا چو رشتۂ رگ جاں بخویش می پیچیدہ خدا نکردہ کہ افتد گرہ بکار کسی

بہ فقر آمادہ گاں ھرگز نسازد ننگ رسوائی بگو با تاج تا پوشد ھماں عیب سر گل را

بسکہ محو سعی بی حال بود اندیشہ ام در دویدن شد برنگ موج قطع ریشہ ام

---

(۱) سفینۂ خوشگو: ص ۱۶۰

(۲) باغ معانی: ص ۱۰۸

۴۴۔ شیخ رضی الدین سرورؔی

نام شیخ رضی الدین معروف بہ غلام مرتضٰی اور تخلص ''سروریؔ'' تھا۔ ان کے بزرگوں کا اصل وطن لاہور کے مضافات میں ''سودھرہ'' ابراہیم آباد تھا لیکن ایک عرصے بعد ان کے خاندان کے بیشتر افراد دہلی میں آکر مقیم ہوگئے۔ سرورؔی نے اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو وضاحت کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب کچھ سرورؔی نے دہلی مس رہ کر حاصل کیا تھا اور اس کے بعد لکھنؤ آئے تھے۔

سرورؔی ایک جہاں دیدہ انسان تھے۔ تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد شعر و سخن کی جانب متوجہ ہوئے۔ مصحفی نے انہیں نظام خاں معجزؔ کا شاگرد بتایا ہے۔(۱) فارسی زبان پر سرورؔی کو نمایاں قدرت حاصل تھی۔ مصحفی لکھتے ہیں:

''در فارسی دانی وسلیقہ نظم آں مہارت تمام دارد''(۲)

افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ سرورؔی کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے جبکہ ان کے کلام کا قابل قدر حصہ دستیاب ہے۔ اور امکان غالب ہے کہ یہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر بھی ہوں گے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور موضوعات عام طور پر مہر و وفا، عشق و محبت اور محبوب کی گونا گوں صفات وغیرہ ہیں۔ اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

بدل توقع بہبود روزگار مدار — بنای کار بجز فضل کرد گار مدار
نہ داد حکمت حق اختیار کار بہ کس — امید مطلق از چرخ بیمدار مدار
لباب عاریتی وا گزار دنگ مکن — برہنہ باش و زکس در زمانہ عار مدار
خموش باش کہ وضع جہانیاں دگر است — بحرف حق سر خود برفراز دار مدار

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۱۳۶

(۲) ایضا

به چرب و نرمئ جاوید مرهم جاں شو
درون خستہ دلاں جہاں فگار مدار

قبائے سبز درید است ہر گلی بچمن
ہوائے خرقہ دریں موسم بہار مدار

دریں بہار سروری بزعم زاھد خشک
بغیر بادہ خوری ہیچ کاروبار مدار

فتاد برسرمن سایہ ھما آخر
نشان تیر تو شد استخوان ماآخر

نبودہ است چنیں فتنۂ قیامت ھم
قد تو برسرم آوردہ صد بلا آخر

نہ دیدہ ایم بدیں رنگ چہرۂ ات ھرگز
بگوبگو کہ نہ دانیم ماجرا آخر

زفکر دھرسروری مباش بادل تنگ
کہ غنچہ واشود از جنبش صبا آخر

اے حسن تو ازحور و ملک خوشتر و بہتر
حرف لب لعلت زنمک خوشتر و بہتر

رخسارۂ تاباں تو گرنور تجلی است
ھست ازمہ وخورشید فلک خوشتر و بہتر

ھرجاکہ بود ذکر معارف زسروری
مطرب بسرا ایں غزلک خوشتر و بہتر

گل گل شگفت باغ چو نیرنگ یار را
دیدم بہار صبح گل جنگ یاررا

در باغ بوسہ برد ھنش میزنم کہ ھست
باغنچہ نسبتی دھن تنگ یاررا

باشد زدرد و داغ محبت سرشت ما
مہر و وفائے عشق خط سر نوشت ما

ھرکس مراد خویش زجائے طلب کند
بہتر بود زکعبۂ زاھد کنشت ما

چوھست راہ بدل الفت نہانی را
چہ سود عرض کنم مطلب زبانی را

ھمیں بہ حسرت دیدار می کشد مارا
کہ رشک صحبت اغیار می کشد مارا

نبود بدست اگرز جهاں ھیچ شے مرا
صد شکر داده اند به کف جام می مرا

اے وای کار من زپیام و خبر گذشت
چشمم زگریه سیر شد آه از اثر گذشت

شب که دل در آرزوی جلوهٔ فریاد داشت
آشیاں گم کرده صید بے چشم برصیاد داشت

نہال قد تو کز بوستان جاں برخاست
قیامتی است که بافتنه هم عناں برخاست

کامی دلی زچرخ اگر می تواں گرفت
آساں مداں بخون جگر می تواں گرفت
هرگز بگوش سنگدلاں جانمی کند
ازنالہ ترجمان اثر می تواں گرفت

آں بلبل مستم که به گلزار محبت
بادام در آویزم و یارانه در افتم

۴۵۔ رای بال گوبند شاؔد

نام بال گوبند اور تخلص شاؔد تھا۔ ان کی پیدائش الہ آباد میں ہوئی۔ تاریخ تولد معلوم نہیں ہوتی۔ شاؔد راجہ پڑچند کے داماد تھے۔ ان کے والد الہ آباد میں منصب دیوانی پر فائز تھے لیکن احمد خان بنگش کے الہ آباد میں ہنگامہ برپا کرنے کے بعد شاؔد کے خاندانی افراد بہت سی پریشانیوں کا شکار ہوکر بنارس میں پناہ گزیں ہوئے۔

شاؔد نے شیخ علی حزیںؔ سے اپنے تعلقات بڑھائے اور موصوف نے بھی ان کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ شاؔد کی فارسی شاعری کو شیخ کی نوازشوں نے مزید ترقی دی۔ اس سلسلہ میں شاؔد کو راجہ پڑچند سے بھی کافی مدد حاصل ہوئی۔

شاؔد نے اپنے شعروسخن پر بھگوان داس ہندیؔ سے اصلاح لی۔ اس سلسلہ میں ہندیؔ لکھتے ہیں:

''گاہی شعری گفت وبنظر راقم می درآورد، راقم ہم در تربیت او قاصر بل نبود ... (۱)

شاؔد کا انداز بیان عمدہ ہے۔ زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے۔ شعروسخن کے نمونے ملاحظہ ہوں:

دگر جانان من میل حنا بستن زخون دارد
سر خونریزی خونیں دلان آنماہ چون دارد
حکایت ہای درد عشق خود را گر بیان سازم
ترا ہمدم یقین باشد کہ ایں مخرون جنون دارد
بہ تنہا پیش بالایت صنوبر منفعل باشد
کہ پیش چشم تو در باغ نرگس سرنگوں دارد

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۱۵

اگر آں جنگ جو از بہر تیر انداختن خیزد
سر عشاق را غلطان چو گو در خاک و خون دارد
بروای باغبان از لالہ و سنبل چہ می لافی
بت من زلف سنبل فام در وی لالہ گون دارد
اگر منظور قتل شاؔد مسکیں دردلش نبود
بہر دم تیغ مژگانرا چنیں برگشتہ چون دارد

ایک اور غزل کے چند اشعار:

در خانۂ من اگر بیابی — بردل در خرمی کشای
بی رویتو حال دل خراب است — ای راحت جانمن کجای
مشتاق لقای خویشتن را — دیدار چرا نمی نمائی
بنھفتہ در ابرروی خودماہ — تو پردہ چرانمی کشائی
گرد درتوجان شاد نا شاد — ناگاہ اگر زدر درائی(۱)

(۱) سفینۂ ہندی، ص ۱۱۶

۴۶۔ دیبی پرشاد شاؔد

دیبی پرشاد نام اور تخلص شاؔد تھا۔ ان کا تعلق اکبرآباد کی کایستھ قوم سے تھا۔ شاؔد کے والد صوبہ اودھ میں وکالت کے پیشہ سے منسلک تھے۔ چنانچہ شاؔد کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں صحیح اطلاعات نہیں ملتیں۔

شاؔد نے فارسی علم وادب کی تعلیم بھگوان داس ہندیؔ سے حاصل کی۔ (۱) اس درمیان ان کی شعر و شاعری کی شروعات ہوئی۔ ابتداً میں ہندیؔ سے اصلاح لیتے تھے لیکن بعد میں ہندیؔ نے انہیں برہان علی خاں رہیؔن کے سپرد کر دیا۔

شاؔد کی وفات اکبرآباد میں واقع ہوئی۔ سنہ وفات تذکروں میں نہیں ملتا۔ فارسی شعروادب سے شاؔد خاص رغبت رکھتے تھے۔ مزاج میں سنجیدگی تھی۔ جو کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ایدر دمیازار مرا اینقدر امشب
بگذار کہ دستی نہم زیر سر امشب
چون تعزیہ داران بسر نعش دل ما
غم مرثیہ خوانست و الم نوحہ گر امشب

ایک اور شعر:

در کنج قفس نالہ و فریاد نکردیم
آزردہ ز خود خاطر صیاد نکردیم
مستان محبت سر پیمانہ ندارند
چشم تو بود ساغر سرشار دل ما

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۱۷

ای بت بتو حال دل شیدانه توان گفت
آری سخن از کعبه بتر سارا نتوان گفت
آن بودی دگر دارد وایں نکہت دیگر
گیسوی ترا عنبر سارا نتوان گفت

میرفت سوی کعبه دل دین پناه ما
آمد بتی مقابل و شد سنگ راه ما
بهر چه عشق اینهمه آتش بلند کرد
گریک شراره سوخته میشد گیا ه ما

گه اسیرم کند و گه کند آزاد مرا
کشت ایں بازی طفلانهٔ صیاد مرا

۴۷۔ میر سید محمد شاعرؔ بلگرامی

نام میر محمد اور تخلص ''شاعرؔ'' تھا۔ شاعرؔ اودھ کے مشہور قصبہ بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء کی ہے۔(۱) شاعرؔ نے عربی، فارسی اور دیگر علوم وفنون کی ابتدائی تعلیم اپنے والد میر عبدالجلیل بلگرامی سے حاصل کی۔ درسی کتابیں میر طفیل محمد بلگرامی سے پڑھیں۔

شاعرؔ اپنے والد میر عبدالجلیل کی زندگی میں ہی شہنشاہ (۲) دہلی کر طرف سے سیوستان (سندھ) کے وقائع نگار کے عہدہ پر فائز ہو گئے تھے۔ انہیں لغت اور تاریخ میں مہارت حاصل تھی۔ ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء میں شاعرؔ نے اپنے بھانجے غلام علی بلگرامی کو سیوستان بلا کر اپنا نائب مقرر کیا اور خود بلگرام آ گئے۔ اور دو سال بلگرام میں قیام کرنے کے بعد دوبارہ سیوستان گئے۔ اس طرح انھوں نے سیوستان اور بلگرام کے درمیان کئی سفر کئے۔ ان کا آخری سفر ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء میں ہوا۔(۳) سال وفات تذکروں میں درج نہیں ہے۔

شاعرؔ فارسی کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ علماء وشعراء کی سوانحات کا گہرائی سے مطالعہ کرتے تھے۔ عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ شاعرؔ کو ہندی کے بھی بے شمار دوہے زبانی یاد تھے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

'' ... مہارت زبان فارسی وعربی و ہندی ازحد افزون است ... سخن
را اکثر موزوں می کند وجواہر آبدار در سلک نظم می کشید''(۴)

خوشگوؔ نے شاعر کے بارے میں لکھا ہے:

---

(۱) سفینۂ خوشگو: ص ۲۹۹

(۲) فرخ سیر: ص ۱۲۰

(۳) بلگرام کے فارسی شعراء: ص ۱۲۰

(۴) سرو آزاد: ص ۲۰۱

''تتبع قدما بسیار نمودہ ازیں جہت بزبان قدیم می سراید'' (۱)

شاعر کی غزلیات سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پر یروی کہ زلف اومرا آشفتہ تر دارد — ھزاران نکتۂ باریک در موی کمر دارد

دلم از خارخار عشق او دارد گلستانہا — نفس از سینہ ام چوں بوی گل آید زبستانہا

ھیچ محبوبی ندارد اینقدر رنگ حنا (حیا) ؟ — بعد سالی می نماید روی خود یکبار گل

فروغ عشق بخش ای ماہ سیما خانۂ مارا — زنور جلوۂ خود رنگ کن کاشانۂ مارا

دل درخم گیسوی نگار است ببیند — دردام محبت چہ شکار است ببیند

نیست در عالم دون غیر ھوس کار دلت — ھست این طول امل رشتۂ زنار دلت

محو گشتم چون حباب و عین دریا یافتم — چشم پوشیدم ازین عالم تماشا یافتم

دران گلشن کہ سرو قامت جانان شود پیدا — بجای طوق قمری دیدۂ حیران شود پیدا

---

(۱) سفینۂ خوشگو: ص ۲۹۹

۴۸۔ پیہم ناتھ شیدا

پیہم ناتھ نام اور تخلص ''شیدا'' تھا۔ ان کے والد بھولا ناتھ مٹو اپنے عہد کے مشہور پنڈت تھے۔ ان کے آبا و اجداد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں کشمیر سے اودھ آ گئے تھے اور یہی نواب مذکور کے یہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ شیدا کی تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں نہیں ملتی، نہ ہی ان کی ذاتی زندگی اور علم وادب سے دلچسپی کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ صرف تذکرہ بہار گلشن کی عبارت سے ان کی ملازمت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یوں لکھا ہے:

''شیدا چکلہ کی عہدہ داری پر حضور تحصیل لکھنؤ میں ملازم تھے۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔ امجد علی شاہ، شاہ اودھ کے زمانے میں انتقال ہوا'' (۱)

نمونۂ کلام میں ان کی دو غزلوں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

الٰہی در فشان از حمد کن مدح دھان ما — پسند خاطر اھل زبان گردان بیان ما
دھان من اگر یارب سخن راند زتو سازد — بہ اسم پاک تو جنبد اگر جنبد زبان ما
بخود درحیرتم آیا کدام و ازکجا ھستم — چہ می پرسی زمن ای جان من نام ونشان ما
بروزحشر باکے نیست شیدا اندرین عالم — زمینم خاک جسمم ،درود آھم آسمان ما

درج ذیل اشعار ''در وصف بنارس'' کے عنوان سے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

جبین سود نیاز آنست سنگ آستان اینجا — خوشا آوردای نادان ترا بخت جوان اینجا
بنارس سرزمیں پاک و افضل معبد عالم — ملائک را تمنا کی شود از مردمان این جا
بہ وصفش دم زدن شیدا چہ خبط است این زمیدانی — بیان گم کرد در توصیف کلک دوزبان اینجا (۲)

---

(۱) تذکرہ بہار گلشن کشمیر: ص ۵۲۸

(۲) ایضاً: ص ۵۲۹

۴۹۔ میر سید عبدالعلی طالع

میر عبدالعلی نام اور تخلص ''طالع'' تھا۔ ان کے آباواجداد اصلاً شیراز کے تھے، وہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ طالع کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ اور یہیں نشو ونما پائی۔

فن شعروسخن میں ان کے استاد ''عمو'' میر سید محمد ثاقب تھے۔ طالع اپنے معاصر شعراء میں مشہور و معروف شاعر تھے۔ ہم عصر شعراء میں شیخ حسین شہرت، میرزا افضل ثابت و شیخ عبدالرضا متین جیسی مقتدر شخصیات تھیں۔

طالع ایک مدت تک نواب سعادت خاں کی رفاقت میں صوبۂ اودھ میں رہے انتقال بھی یہیں ہوا۔ (۱)

خوشگو نے لکھا ہے:

''سبزواریست طبع رسا داشتہ مشق بہ خدمت میر ثاقب می گزرانید کلامش بسنجیدگی آشنا است اما از نامساعدی طالع تخلص داشت'' (۲)

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

طالع برای رفتن از خود بیاداد — خوب آمدہ زمصحف دل استخارہ ام

رباعی کا نمونہ:

درعشق مدار ما بدست دگر است — باغیم و بہار مابدست دگر است
درکار گہ وجود چون کاغذ باد — سررشتہ کارما بدست دگر است

حرف بیجای عزیزاں کی پرداز جامرا — می رباید اند کی ایں خود نمائیہامرا

دست شستم زتن خاکی خویش — این تیمم بو ضو میماند

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۲۸

(۲) سفینۂ خوشگو: ص ۶۵

۵۰۔ مرزا رمضان بیگ طپاںؔ

مرزا رمضان بیگ نام اور تخلص طپاںؔ تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا رجب بیگ تھا جو صوبہ اودھ کے مضافات قصبہ آسیون کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندانی تعلق مغلوں کی چغتائی قوم سے تھا۔ شروع شروع یہ دہلی آ کر آباد ہوئے بعد میں اودھ میں سکونت اختیار کی۔ طپاںؔ کی تاریخ پیدائش کا ذکر نہیں ملتا لیکن انہوں نے تعلیم و تربیت آسیون میں رہ کر حاصل کی تھی۔ ۱۲۲۸ھ / ۱۸۱۳ء میں تلاش معاش کے سلسلہ میں اپنے قصبہ سے نکل کر لکھنؤ کی جانب رخ کیا۔

طپاںؔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے رکھتے تھے۔ طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ لہذا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس میدان میں طپاںؔ نے مصحفیؔ کی شاگردی حاصل کی۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''چون قوت علمی داشت خود را بمقتضای موزونی طبع بہ گفتن شعر فارسی و ھندی و نثر نویسی سلیس و عاشقانہ وغیرہ مصروف ساخت و رجوع برای اصلاح بہ فقیر آوردہ۔۔۔''(۱)

اس طرح طپاںؔ نے فارسی اور اردو زبانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے۔ ان کیا شعار بیشتر عاشقانہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سرے با تیغ ابرو داشت با مژگان دلبرھم — گلویم شب تہ شمشیر بود وزیر خنجر ھم
نہ دانم ایں قدر من در شب ھجراں چہ بیتابم — کہ خواھم بر زمین می تابد و بر روے بسترھم
طپاں صاحب علم گویند و ھم صاحب قلم مارا — فرو آر د بماسر مرد میدان و سخنورھم

ایک دوسری غزل سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رفت از برمن آفت جانی کہ داشتم — دادم زدست سرور دانی کہ داشتم

(۱) ریاض الفصحاء، ص ۱۹۷

دل پارہ پارہ گشت ز تاب جمال دوست
شدندز ماهتاب کتانی که داشتم
بریادشد ز دست فلک آں هم اے طپان
در کویش ازمزار نشانی که داشتم

خواهم گریم گهی به پیشش
آگاه کنم ز حال خویشش
مجروح نگاه می دهد جاں
مرهم نهی چرا بریشش
عقرب که بود ته قبایم
اے کاش خوری تو نیز نیشش

زیں خنده که خواهی کشت امروز یقین دارم
فردا بسر خاکم با چشم تر آئی تو
جان برشدن از دستت معلوم نمی دانم
اے عشق چه خوانندت ظالم چه بلای تو

رشکم ز بدل خوردن پیکان تو آید
برگشتۂ نازی که زمیدان تو آید
آں پنجه کجاکان سرد امان تو آید
کو دست که اوتا به گریبان تو آید
باشد که دلایار بدردت رسداکنوں
غالب که مسیحی پی درمان تو آید

باکه گویم اے طپاں غم دل
ناید از دوست غمگساری ما

چه آتشی که نیفتاد در دل شیریں
ازاں چراغ که برگور کوه کن می سوخت

رباعی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

بے زبانم به سوالی لب خود وانه کنم
جاں به حسرت دهم و عرض تمنا نه کنم
اے طپاں سوے ارم گربرندم بی او
چشم پوشم ز رخ حور تماشا نه کنم

طپاں کی تاریخ وفات کہیں تذکرے میں درج نہیں۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں ان کی عمر پچیس سال بتائی ہے۔

۵۱۔ عارف علی شاہ عارفؔ

عارف علی شاہ نام اور تخلص عارفؔ تھا۔ وطن خراسان تھا۔ ان کے آبا و اجداد شاہ ایران کے عمائدین وامرائے عظام میں سے تھے۔ کم عمری سے ہی عارفؔ کو دنیا کی سیاحت کا شوق تھا۔

شاہ عارفؔ ہندوستان آئے اور چند روز کے لئے حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں سالک علی شاہ نعمت اللہی سے بیعت حاصل کی۔ عرصے تک ریاضت ومجاہدہ میں بسر کی اور آخر میں لکھنؤ میں قدم رکھا۔ لکھنؤ کی تعریف میں آپ کے کلمات ہیں:

ھندوستان ندیدم چون موضعی چوں لکھنؤ　　اگر چہ در طریق سیر تا چنیائن رفتم

زندگی کے آخری حصہ میں قصبہ سندیلہ کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا۔ سرزمین سندیلہ بھی انھیں بے حد پسند تھی۔ فرماتے ہیں:

کوئے عشق است خاک سندیلہ　　اے خوشا خاک پاک سندیلہ

شاہ عارف کبھی کبھی راجہ کنور پرشاد رئیس اعظم، قصبہ سندیلہ کے گھر بھی تشریف لے جاتے تھے اور وہاں شعر وسخن کی محفلیں بھی منعقد ہوتیں۔ کاملین و عارفین موصوف کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے۔

''بہارستان اودھ'' میں آپ کے یہ اشعار ہیں:

عمریست انتظار تو دارم بیابیا　　یارم بیا بیا و نگارم بیابیا

مردم در انتظار بدو پرسش نیامدی　　ازبر فاتحہ بمزارم بیابیا

جانم ز اشتیاق تو برلب رسیدہ است　　اے جان دمی بکنارم بیابیا(۱)

عارفؔ کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتیں۔ کہاں اور کب وفات ہوئی، اس کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔ آپ کے اشعار تذکروں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔

---

(۱) بہارستان اودھ: ص ۱۳۱

۵۲۔ شیخ محمد عاشق، عاشقؔ

محمد عاشق نام اور تخلص بھی عاشقؔ تھا۔ آباواجداد بیرون ہند سے تشریف لائے تھے۔ لیکن کہاں کے تھے یہ پتہ نہیں چلتا۔ ان لوگوں نے پہلے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ عاشق کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد شیخ محمد حیات کے ساتھ دہلی سے اودھ آگئے اور نواب صفدر جنگ بہادر کی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔

عاشقؔ نے ابتدائی تعلیم وتربیت اودھ میں رہ کر حاصل کی۔ بڑے ہوکر نواب کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ شعروشاعری سے خاص لگاؤ تھا لہذا کلام کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا شمار اپنے عہد کے معروف ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ صاحب ''سفینۂ ہندی'' کے مطابق:

''طبعش بہ محبت وولای خاندان ثبوت وولایت علیھم السلام والحسینۃ کمال مشغوفست طاقت لسان وفصاحت بیان چنان دارد کہ ھنگام خواندان شعر معنی پنہان صورت پیدا می کند'' (۱)

موصوف کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ای پیش حسن رویتو شرمندہ صد حور وپری
داری جمال یوسفی از دلبران دل می بری
صبحی بیاد رگلستان ازگل دل بلبل ستان
وزدست ساقی مل ستان شومست ناز ودلبری
جنس شکیب وصبر وتاب نگذاشتی درشیخ وشاب
شد خانۂ دلہا خراب بگزار این غارتگری

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۴۴

۵۳۔ منشی رائے طوطارام عاصیؔ

رائے طوطارام نام، اور تخلص ''عاصیؔ'' تھا۔ ان کا خاندانی تعلق دہلی کے شاہی میر منشیوں سے تھا۔ لیکن یہ بلگرام میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ تاریخ پیدائش کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ شاعری میں یہ منشی مینڈو لال زارؔ کے شاگرد تھے اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔(۱) ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں انتقال ہوا۔ اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

همین نه گشت و بجمد توام زبان گویا — بسان نی به تنم شد هراستخوان گویا
یقین که عاصی دیوانه هم بدولت عشق — شود بحمد تو باخوشتریں بیان گویا

نازم بدلی که شد طلبگار خدا — دین و دنیاباخت درکار خدا
زاهد جوید بحشر ومن امروزم — در روی صنم ناظر دیدار خدا

ازجذبهٔ عشق بود مجبور خدا — میخواست از خودی نور خدا
شد حسن تو جلوه گر بعالم گردید — برصفت خود شاکرو مشکور خدا (۲)

افسوس کہ عاصیؔ کے بارے میں ہمیں باوثوق ذرائع سے مزید معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

---

(۱) دیوان عاصی (نسخہ خطی) رضا لائبریری رام پور

(۲) ایضاً

۵۴۔شاہ عالم خاں عالم

شاہ عالم خاں نام اور تخلص عالم تھا۔ یہ مشہور شاعر اور نواب محبت خاں، محبت کے بیٹے تھے۔ ''محبت'' بریلی کے رہنے والے تھے اور اپنے والد نواب حافظ الملک کی شہادت ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے اور اخیر عمر تک یہیں رہے۔ قیاس ہے کہ عالم کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی ہوگی۔

عالم کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ شروع سے ہی ان کی طبیعت شعر و سخن کی جانب مائل تھی۔ گویا یہ دولت انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ عالم نے استادی کا شرف بھی اپنے والد کو ہی بخشا۔ کلام کہتے اور اپنے والد بزرگوار ''محبت'' سے اصلاح لیتے۔ کم عمری میں ہی ان کے کلام نے شہرت پائی اور اس عہد کے تذکروں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کا ذکر نہیں ملتا۔ مصحفی نے تذکرہ ''ریاض الفصحاء'' لکھتے وقت ان کی عمر انیس (۱۹) سال بتائی تھی۔(۱) کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

غزل کا نمونہ:

نیست خود کلامی کہ کام خود بہ تیغ کین دھد — آتش مارا بآب تیغ کین تسکیں دھمد
جان بنا کامی سپرد تا بود خود کام من — از لب جان پرورش کام من مسکین دھد
گر دھم جاں از غم جانان خود عیبم مکن — جان شیریں کوھکن از حسرت شیریں دھد
عالما آسودہ از دنیا ومافیہا شدیم — طالب دیدار او کے دل بآن و این دھد

رباعی کا ایک نمونہ:

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۲۴۱

نہاد لالہ عذاری بہ سینہ داغ مرا
زلالہ زار جہاں زین بود فراغ مرا
نہ سوخت تا شب غم خانہ ام ز آتش آہ
ز شمع روی تو روشن نہ شد چراغ مرا

ایک دوسری غزل کے چند اشعار:

نہ شویم از و نفسی جدا برھش اگر سرما رود
سرما وخاک درش کسی زخفای او بہ کجارود
کشم آہ اگر من ناتواں نہ من بقدر جفای تو
نہ بود عجب کہ بیک نفس دو جہاں بباد فنا رود
نہ رود بآن سر کو، کسے کہ بود عنان دلش بہ کف
برضای خود مبری گمان کہ کسی بکوی بلا رود
بجفای کوی تو کی روم کہ دم از وفائے تو میزنم
بمراد دل نہ رسد کسی کہ زکوی تو بجفا رود

رباعی کا دوسرا نمونہ:

در خواب دیدہ ام رخ آں آفتاب را — دانستہ ام عبادت سہ روزہ خواب را
گفتم ز جان غلام تو ام گفت عالما — مابہ نگریم بندۂ حاضر جواب را

۵۵۔ شیخ محمد فاخرؔ

شیخ محمد یحییٰ نام اور تخلص ''فاخرؔ'' تھا۔ شیخ خوب اللہ الہ آبادی کے بیٹے تھے۔ ایک مدت تک والد کی جگہ سجادہ نشین رہے (۱) اور ارشاد و ہدایات کا درس دیتے رہے۔

عربی و فارسی زبان پر کامل مہارت حاصل تھی۔ ان زبانوں میں ان کے عمدہ اور فصیح اشعار یادگار ہیں۔ کلام میں تصوف کی چاشنی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اشعار کے نمونے یہ ہیں:

من ھماں محوسیہ کاری خویشم شب و روز
تیغ ھر چند گذشتہ است زسر چوں قلم

بود توجہ ماجانب امام زماں
بہر طرف کہ نہم رو چو دانۂ تسبیح

ھنوزا زغم شاہ شہید خوں گرید
دل است دانۂ تسبیح کربلای ما

رباعی کا نمونہ ملاحظہ ہو:

جان برلب من زکسرت مشتاقی است
ذکرم ھمہ یاعلی است تا جان باقیست
امروز اگر جام من از بادہ تہی است
غم نیست کہ روز حشر حیدر ساقیست (۲)

۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں حرمین شریف کے طواف کو گئے۔ تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۵۷

(۲) سفینۂ خوشگو: ص ۲۹۵

۵۶۔ شیخ فیض محمد فایضؔ

نام فیض محمد اور تخلص ''فایضؔ'' تھا۔ یہ خاص لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ تاریخ تولد اور تاریخ وفات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ فایضؔ نواب امیر الدولہ کے یہاں منشی گری کے عہدے پر فائز تھے۔

شعر و شاعری خوب کرتے تھے۔ شروع میں اصلاح سخن مرزا فاخر مکینؔ سے حاصل کرتے تھے۔

''سفینۂ ہندی'' میں ہے:

''خط نستعلیق و شکستہ خوب و درست می نوشت عزیز خوش اعتقاد و نیکو نہاد بود بار اقم ربط دوستی داشت شعر خوب میگفت و اصلاح سخن از جناب ارشاد مآب میگرفت'' (۱)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

کس نیست بعشق تو دل افگار تر از من — وز سا حری چشم تو بیمار تر از من
ھستند سبی در خم زلف تو گرفتار — لیکن نتوان یافت گرفتار تر از من (۲)
محنت زدہ خستہ دلی زار نزاری — بر خاک رھت نیست کسی خوار تر از من
معشوق کہ دیدست جفا کار براز تو — عاشق کہ شنید ست وفا دار تر از من
برروی نکو گر نظر پاک گنا ھست — فایض نتواں یافت گنہگار تر از من (۳)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۵۵

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً: ص ۱۵۵

۵۷۔ مرزا محمد حسن قتیلؔ

نام مرزا محمد حسن (۱) اور تخلص ''قتیلؔ'' تھا پہلے ہندو کھتری تھے اور ان کا نام ''دیوالی سنگھ'' (۲) تھا۔ اپنے والد درگا ہی مل کے ساتھ دہلی میں رہتے تھے۔ مسلمانوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے مذہب اسلام کا اثر قبول کیا۔ اور ملت محمدی کی جانب متوجہ ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں فیض آباد آئے اور مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کے ہاتھوں مذہب اسلام قبول کیا۔ (۳)

قتیلؔ کی طبیعت ابتداً سے موزوں تھی۔ شہید اصفہانی کی شاگردی میں رہے، اس مناسبت سے اپنا تخلص بھی قتیلؔ رکھا اور سخنوری میں حدِ کمال حاصل کیا۔ انھیں ترکی اور فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ زندگی میں عرب اور عجم کے ساتھ ساتھ ترکستانی علاقوں کی بھی خوب سیاحت کی تھی۔

امراء و وزراء انکی لیاقت اور صلاحیت کو بے حد سراہتے اور انہیں توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قتیل اس عہد کے مسلم الثبوت استاد تسلیم کئے گئے ہیں۔ ہندی کے الفاظ میں:

> ''علوم فارسی وعربی تحصیل نمودہ، زبان بگفتن شعر کشود، ودر آن دستگاھی وسیع دارد واشعار رنگین بر صفحۂ روزگاری نگارد ۔۔۔ اعزۂ این دیار عزت وتوقیرش می نمایند ۔۔۔ ''(۴)

قتیلؔ کو عروض وقوافی اور ریاضیات میں کامل دستگاہ تھی، شعر درست اور شستہ کہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں بادشاہ غازی کے زمانے میں ہوا۔ لکھنؤ میں انہوں نے اپنی عمر کے چھتیس (۳۶) سال بسر کئے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

برسا خاکم چو شب آں شمع بزم آرا گذشت
شعلۂ جست از دلم عالم بالا گذشت

---

(۱) بہارستان اودھ: ص ۶۱

(۲) حقیقی جائزے: ص ۱۷

(۳) ایضاً

(۴) سفینۂ ہندی: ۱۷۲

من رسم ورہ زھد نہ دانم چہ تواں کرد　　ترک رخ نیکونہ تو انم چہ تواں کرد

ھمہ صحرا پر از شور و فغانست　　ھما نامحملی در کارواں است

جز مرگ کی سودم دھد امشب مداوای دگر　　ایں شب مداں ای ھمنشینش مانند شبہای دگر

جز اینکہ در کنی خود رنگی از حناداری　　نوشتۂ بنما گر بخون ما داری
چگونہ پای بروی زمین نہی ز غرور　　دل بلا کش عاشق بزیر پاداری

رباعی کا ایک نمونہ یہ ہے:

از یار علاج دل شیدا شدنی نیست　　جلا دستم پیشہ مسیحا شدنی نیست
تاچند فتیلا چو خرین نالۂ وزاری　　آہ ایں شب ھجر است کہ فرداشدنی نیست(۱)

دررہ عشق دلم شد ھدف تیر کسی　　زخم من بہ شدنی نیست زتدبیر کسی
چکنم من بچساں کشتہ بگردم کہ خدا　　خون من کردہ حلال دم شمشیر کسی

قتیل کے دیوان(۲) کا قلمی نسخہ (۱۲۳۸ھ) نہایت کرم خوردہ حالت میں ملتا ہے جسکا آغاز درج ذیل بیت سے ہوتا ہے۔

بدہ ای اجل امانم کہ بہ خانہ آرم اورا
دل پارہ پارہ خود سررہ گزارم اورا

---

(۱) بہارستان اودھ:۶۱

(۲) دیوان قتیل لاھوری: B۴۰۲/۳ کتابخانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

۵۸۔ کشن چند قریبؔ

نام کشن چند اور تخلص ''قریبؔ'' تھا ان کے والد انوپ چند رای دیا کشن کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا خاندانی تعلق دہلی کی کایستھ قوم سے تھا۔ قریبؔ کی پیدائش دہلی کی ہے۔ لیکن تاریخ تولد یا تاریخ وفات کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔ محمد شاہ کا عہد جب شروع ہوا تو قریبؔ کے خاندان نے لکھنؤ کی جانب رخ کیا اور پھر مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔

قریبؔ نے لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں ملازمت کر لی۔ شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے۔ فارسی اشعار اکثر کہہ لیتے تھے۔ شعر و سخن میں فاخرؔ مکینؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ہندیؔ لکھتے ہیں:

''با راقم کمال اتحاد دارد و در شعر سخن اصلاح از جناب ارشاد مآب گرفتہ طبع رسا و فہم ذکا درست دارد'' (۱)

کلام کا نمونہ یہ ہے:

سر از تنم جدا شد و جاں زو جدا نہ شد — بیگانہ شد دل از من و او آشنا نہ شد

قریب از دست بیدادش توان جست — زمینی گرو رای آسمان است

دل تنگ چون دہان نگارم دریں جہاں — آشفتہ ہمچو طرۂ یارم دریں جہاں
روی خزان ندیدہ گلستان من قریب — از داغ سینہ تازہ بہارم دریں جہاں (۲)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۶۸

(۲) ایضاً

۵۹۔ میر نثار علی قرینؔ

میر نثار علی نام اور تخلص ''قرینؔ'' تھا۔ ان کا تعلق صوبہ اودھ سے تھا۔ پیدائش اور وفات سے متعلق صحیح تاریخیں تذکروں میں نہیں ملتیں، یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کا عہد نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ قرینؔ نواب موصوف کے دربار میں ملازم تھے انہیں فن طباعت میں دستگاہ حاصل تھی۔ شعر و شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے۔ فاخرمکینؔ کی قربت حاصل تھی۔

لکھنؤ میں فاخر مکینؔ سے تحصیل علم کیا اور شعر و سخن میں انھیں کی شاگردی اختیار کی۔

''سفینۂ ہندی'' میں ہے:

''دیوانی متضمن اقسام شعر گفتہ درسخن معانی تازہ می جویندو اشعار پاکیزہ و شستہ میگویند''(۱)

نمونہ کلام یہ ہے:

فزود درتب ھجر تو درد سرمارا　　فغاں کہ نالہ بود دشمن دگر مار

برو در کارتصویرت بسر گرز ندگانی را　　بجز خجلت کشی صورت نخواھد بست مانی را

چوں باد تا گذشت سوار سمند من　　در آتش است نعل دل مستند من

صبر از دل برد میسوزد دل دیوانہ را　　بعد غارت میزند غارتگر آتش خانہ را

ایک غزل کا مطلع:

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۶۳

شب کہ بی ابروی آں ماھم ملالی رو نمود
ھر کجاناخن زدم شکل ھلالی رو نمود

اسی کا مقطع ہے:

کاست آخر ھچو بہ راز گردش گردوں قرین
شد و بال او کسی را گرکمالی رونمود

دیگر غزلوں سے چند اشعار:

دوش دل بگرفت زلف آں نگار ازمن دریغ
مہرۂ بودست بامن برومار ازمن دریغ
خاک گشتم گرچہ درراھش ولی ھردم قرین
می نشیند بردل پاکش غبار ازمن دریغ

مطلع: دل زجورت شکایتی دارد
گلۂ بی نہایتی دارد

مقطع: تا بکی جور برقرین غمیں
زانکہ ھر چیز غایتی دارد

مطلع: مسیح آید اگر از چرخ در مانم نمیداند
علاج من کسی جز یار میدانم نمیداند

مقطع: زخواں سالار دوران چون قرین یابم دم آبی
کہ نام شور باھر گز لب نانم نمیداند (۱)

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۶۷

۶۰۔ حکیم حیات اللہ قلاشؔ

حیات اللہ نام اور تخلص ''قلاشؔ'' تھا۔ اودھ کے مردم خیز قصبہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شیخ پیر بخش مسرور طبابت کے فن میں ماہر تھے۔ خاندانی پیشہ تجارت کا تھا۔ قلاشؔ کے تولد و وفات کی صحیح تاریخ تذکروں میں موجود نہیں۔ ''ریاض الفصحاء'' کے بیان کے مطابق انھوں نے چالیس برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔(۱)

شاعری میں قلاشؔ، شاہ ملولؔ کے شاگرد تھے اور فارسی میں اچھے اشعار کہتے تھے۔ ان کے کلام کے نمونے مصحفیؔ نے اپنے تذکرہ میں بھی شامل کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

شانہ ساں دل موبمو در کاکلش تسخیر شد — آہ یک دیوانہ پابند دو صد زنجیر شد
دیدہ بودم دوش چشم سرمہ آلودش بخواب — تا بہ فردائے قیامت خاموشی تعبیر شد
ذبح کردو داد صد دشنام گفتم مرحبا — برمن مذبوح قابل بس ھمین تکبیر شد
دل گرفت و رفت ناید باز از راہ وفا — حیرتی دارم کہ یار از من چرا دلگیر شد

مانی چشم مگر صورت کش تصویر اوست
خامۂ مورد کفش از موئے مژگاں یافتم
دیوانہ وش ز شوق نہ ھر سو شتافتم
گم کردہ راہ مست دراں کوشتافتم
پر گوھر است از صدف چشم دامنم
ناحق بجستن در و لولو شتافتم

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۲۶۹

جای سخنی نیست بجای سخن من　　مہمان بہ پذیراست سرای سخن من
مشاطۂ اندیشہ ز رنگینئ مضمون　　صد گونہ حنا بست بپای سخن من

در دل غم جانان وغم جاں چہ کنم حیف
باشند بیک خانہ دو مہماں چہ کنم حیف

دل ز زلف و کامل او کلم حاصل میکند
درمیانِ صد بلا دیوانہ منزل میکند

اے وای بلبلی کہ بہ گلشن رسید ومرد　　در فصل نو بہار رخ گل بدید ومرد
صد حیف زیرو یکہ بہ باغ نشاطِ وصل　　خار غم فراق بپایش خلید مرد
قلاش بود بسملِ تیغ جفای دوست　　در خاک وخون در دِدل امشب طپید ومرد

اینک بجنوں راز دلم فاش بر آمد
درکاسۂ من بود ھمیں آش برآمد

۶۱۔ سید مدد علی مائلؔ

سید مدد علی نام اور ''مائلؔ'' تخلص تھا۔ سادات علوی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ صوبۂ اودھ کے شہر ''امیٹھی'' کے رہنے والے تھے۔ تاریخ پیدائش و تاریخ وفات کا تذکروں میں ذکر نہیں ملتا۔

شعر و شاعری میں شاہ ملول الہامؔ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کے اشعار اچھے ہیں۔ نمونے کے چند اشعار ''ریاض الفصحاء'' میں ملتے ہیں (۱) ملاحظہ ہوں:

شدہ مرغ خوش الحان خامش از آہ و فغانِ ما
لبِ گل غنچہ گردد بشنود گر داستان ما

خوشا عشقی کہ از ھستی رھائی می دھد مارا
بمنزل گاہِ قرب حق رسائی می دھد مارا

برتبۂ برسانید عشق شان مرا
ملک بدیدہ کشد خاک آستانِ مرا

غمزۂ چشم بتاں آفتِ جانست مرا
دل ازیں دشنۂ خوں ریز طپانست مرا

بہ شوق روئے تو گل چاک زد گریبان را
چو دید رنگ تو رنگی نماند بستان را

سوز د ز آتشِ غم ھجر تو داغ ما
روغن ز خون دیدہ بود در چراغ ما

ھمائے وحد تیم بخت ... آشیاں را
بریز دور ھوائے ما پرپرواز عنقارا

ز شمع روئے تو آتش بہ محفل افتادہ است
بہر طرف پرِ پروانۂ دل افتادہ است

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۲۸۹

گردوں خراب گردش چشم سیاه کیست　　برهم زنِ زمانهٔ عاشق نگاه کیست

مرا بسیر و تماشای باغ کاری نیست　　که بهتر از دل پر داغ لاله زاری نیست

لعلِ نوشینِ تو دیدم بمن از یادم رفت　　بوی زلفِ تو شنیدم ختن از یادم رفت

اجل فریاد کش بهر مبارکباد می آید　　چو بهر کشتنم خنجر به کف جلاد می آید

بتانکه ازنگهی سنگ آبِ می سازند　　فغاں که خانهٔ مردم خراب می سازند

در تنم تالب جان بخش تو جان پیدا کرد　　مرده از سایهٔ من روح و رواں پیدا کرد

دارم زاشکِ لختِ دل زیں چشم طوفان در بغل　　در عدن در آستیں لعل بدخشاں د ربغل

زخود غافل به بزم آں پری رخسار من بودم　　بکار خویشتن دیوانهٔ هشیار من بودم

در آغوشم شب آمد باده پیما کج کلاه من　　زمستی در هوار قصد برنگ گل کلاه من

برقع از روی جهاں تاب اگر بازکنی
ماه و خورشید زعالم نظر اندازکنی

۶۲۔ شیخ دوندی مایلؔ

شیخ دوندی نام اور تخلص ''مایلؔ'' تھا۔ اودھ کے مضافات میں قصبہ دھوندی پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ووفات کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا یہی وجہ ہے کہ انکی صحیح عمر کا تعین ناممکن ہے۔

شیخ مایلؔ ایک صوفی طبع شاعر تھے۔ ابتدائی دور میں دنیاداری کا رنگ غالب تھا لیکن بعد میں انوار الٰہی میں کچھ اس طرح غرق ہوئے کہ خود اپنا وجود بھی انہیں یاد نہ رہا۔ چنانچہ مجذوبانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

مایلؔ کے کلام پر صوفیانہ رنگ غالب تھا۔ ابتداً میں اپنا کلام فاخر مکینؔ کو دکھاتے تھے۔ اور ''الہامؔ'' تخلص کرتے تھے۔ بعد میں مایلؔ تخلص کیا۔ ان کے بہت سے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ کے نوآموز شعراء اردو اور فارسی میں ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا اسے کاغذ پر لکھ لیا کرتے تھے۔ ''سفینۂ ہندی'' میں ان کا ایک واقعہ درج ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حالت جذب میں اپنا قدیم وجدید سارا کلام درہم برہم کر دیا تھا۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ طبعاً ان پر بیخودی کی کیفیت طاری تھی، اور دنیاوی امور سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ہندیؔ لکھتے ہیں:

''اکثر برای ملاقات راقم تشریف می آورد، فقیری از خود گذشتہ و وارستہ مزاج، بادنیا کم پیوستہ بود'' (۱)

نمونۂ کلام یہ ہے:

شد عشق رھنمون من حیرت دلیل را
در خلوتی کہ رہ نبود جبرئیل را

تہی از خود لبالب گشتن از جانان کمالست ایں
بجوش عشق مجنون زد ''انا لیلیٰ'' چہ حالست ایں

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۲۱۲

رخ من دیدہ می خندد و می گوید سخن قاصد
نمیدانم پیام قتل یا حرف وصالست ایں
ز دردم دیدہ نالاں با رقیب از ناز می گوید
ملول بی سرو پائی عزیب خستہ حالست ایں

کلام سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف کا رنگ پورے طور پر غالب ہے۔

۶۳۔نواب محبت خاں محبتؔ

محبت خاں نام اور تخلص محبتؔ تھا۔ یہ نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے بیٹے تھے۔نواب حافظ الملک روھیلکھنڈ کے رہنے والے تھے۔محبتؔ کی پیدائش وہیں بریلی میں ہوئی۔سال تولد کا ذکر نہیں ملتا۔زندگی کا ابتدائی دور بریلی ہی میں گزرا۔تحصیل علوم کے بعد شاعری کی دنیا میں قدم رکھا۔پہلے اردو شاعری کی جانب متوجہ ہوئے اور میر جعفر علی حسرتؔ سے اصلاح لی، پھر خیالات میں کچھ تبدیلیاں آئیں اور فارسی اشعار کہنے شروع کیے۔فارسی شعروسخن میں فاخر مکینؔ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔(۱)

نواب حافظ الملک ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں شہید ہوگئے۔ان کی شہادت کے بعد محبت نے بریلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ جاکر مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔نواب آصف الدولہ محبتؔ کے ساتھ نہایت ہی تعظیم سے پیش آتے تھے۔انہوں نے محبتؔ کے نام وظیفہ جاری کروادیا۔یہ وظیفہ خاصا معقول تھا۔محبتؔ اخیر عمر تک یہیں ہنسی خوشی رہے۔انتقال ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا۔(۲)

اپنے والد کی طرح محبت بھی بہت سی صفات کے مالک تھے۔ان کی تعریف اکثر تذکروں میں موجود ہے۔ہندیؔ لکھتے ہیں:

''بسیار خلیق پسندیدہ مزاج، عالی منش، شیریں گفتار اند ... '' (۳)

مصحفیؔ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جوانی ست بزیور فضل وکمال وحلم وحیا آراستہ درعلم وآداب طریق سلوک وتہذیب اخلاق بہ اعالی وادنی ظاہر وباطنش بہ یکتائی پیراستہ ... ''(۴)

---

(۱) گلشن ہند: ص ۸۹

(۲) سخن شعرا: ص ۴۱۶

(۳) سفینۂ ہندی: ص ۱۹۱

(۴) تذکرۂ ہندی: ص ۲۵۴

محبتؔ کو شعر و سخن سے اس درجہ لگاؤ تھا کہ اکثر اپنے گھر پر شعر و شاعری کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ خود بھی اچھے اشعار کہتے اور ہمیشہ تازہ مضامین کی تلاش میں رہتے۔ ان کا کلام خوش بیانی کے ساتھ ساتھ لطائف معنی سے بھی پُر ہے۔

اردو کے مقابلہ میں محبتؔ کا فارسی کلام نسبتاً کم ہے، مزید برآں جو کچھ ہے وہ بھی مکمل طور پر دستیاب نہیں۔ ''سفینۂ ہندی'' میں ان کے درج ذیل اشعار ملتے ہیں:

دست شوقم گر چنیں سوی گریبان می رود
چاک ہر دم از گریبان تا بدامان می رود
پیچ و تابم از جنون گر نیست خاک من چرا
گرد بازی می شود سوی بیابان می رود

عاشق زارم مرا از درد پیدا کردہ اند
ایں گواہم بس کہ رنگ زرد پیدا کردہ اند

۶۴۔ ستیلداس مختار

ستیلداس نام اور تخلص ''مختار'' تھا۔ ان کا خاندانی تعلق دہلی کی کایستھ قوم سے تھا، پیدائش دہلی میں ہوئی۔ تاریخ تولد کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ مختار کے چچا جگھ رائے ان دنوں لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ چنانچہ مختار کی اچھی تعلیم و تربیت کے لئے انہوں نے ان کو لکھنؤ بلالیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مختار کی طبیعت شعر و شاعری کی جانب مائل ہوئی۔ اس سلسلہ میں مختار نے فاخر مکین کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں ''تابع'' تخلص اختیار کیا، بعد میں مختار کہلانے لگے۔

انکا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں ہوا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

دل خون شد و تا کی دھد دلدار آزار این چنین
یارب چہ سازم چوں کنم دل آنچنان یار این چنین
چشمِ سیاھش پرفسوں دل میں طپد در خاک و خون
صیاد بیرحم آنچنان صیدِ دل افگار این چنین
گفتم دل از کف بردۂ خندید و گفتا بارھا
گفتم کس را کشتہ گفتا کہ بسیار این چنین (۱)
تا دریں دیر بت و برھمنی پیدا شد
رونق کار بتان از چومنی پیدا شد

رباعی:

یا شاہِ نجف بخاک پای حسنین — باشد دل و جان مافدای حسنین
از جور فلک سخن بجان آمدہ ایم — مارا بنو از برای حسنین

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۹۴

۶۵۔لالہ رام بخش مطیع

رام بخش نام اور تخلص ''مطیع'' تھا۔ مطیع قوم کے کایستھ تھے۔ان کے جد بزرگوار قنوج میں قانون گو کی حیثیت سے مشہور تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔اور میر قدرت علی خاں رسالہ دار کے یہاں دیوانی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ان کے بعد مطیع کے والد بنسی گوپال نے یہ عہدۂ دیوانی سنبھالا۔ مطیع کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی لیکن تاریخ پیدائش کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

مطیع نے اپنے والد کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔اس درمیان انھوں نے قدماء کے دواوین کا بہ کثرت مطالعہ کیا۔اور شعر و شاعری کی جانب ان کی طبیعت راغب ہوئی۔بھگوان داس ہندی کے بیان کے مطابق:

''از بدایت سن در سایۂ عاطفت پدر والا گہر پرورش یافتہ ،بسیر دواوین قدما مشغول شدہ بجودت طبع وجدت رای اشعار رنگین بصفحۂ روزمی نگاشت''(۱)

شروع میں روزی تخلص اختیار کیا اور ایک قطعہ فاخر مکین کی نذر کیا اور یہ درخواست کی:

ای کہ از آفتاب عالمتاب — رای والای تست روشن تر
گر بہ بخش تخلص زکرم — نام ور میشوم من احقر

فاخر مکین نے جواباً مندرجہ ذیل رباعی بھیجی:

آورد دلت صدق و صفا را چو شفیع — من بعد گذشتیم ز طعن و تشنیع
اکنوں با طاعت ز نیاز آمدۂ — زیبد بتوگر(۲) خطاب بخشیم مطیع

اس بار رام بخش نے مطیع تخلص اختیار کر لیا۔لیکن آخری عمر میں مطیع کی خواہش تھی کہ وہ حیدری تخلص اختیار کر لیں لیکن اس سے پہلے ہی انہیں استسقاء کی بیماری نے آگھیرا جوان کی موت کا سبب بن گئی۔

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۲۰۶

(۲) ''گر'' مرتب اضافہ کردہ است در ''سفینۂ ہندی''، ص ۲۰۷

ان کے چچا بزرگوار نے لفظ ''لالہ رام بخش'' سے تاریخ وفات نکالی۔

۱۲۰۹

مطیع نے فارسی کے عمدہ اور اچھے اشعار کہے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل می پرستد آں بت عالیجناب را
کافر ہمیشہ سجدہ کند آفتاب را

شوخی ر بود دل کہ نشانش پدید نیست
کونین ازو پر است کہ مکانش پدید نیست

از بسکہ گریہ شام وسحر کار عاشق است:
نیساں مخجل ز چشمِ گہر بار عاشق است

سنگیں دلی وہیچ ندارد وفا دلت
یارب شود بسنگ دلی آشنا دلت

زاں آتشی کہ عاشق بہ اضطراب سوخت
برخاست شعلہ کہ بچرخ آفتاب سوخت

دلم بدست بت آفتِ دل افتادہ است
فغاں کہ زیستنم سخت مشکل افتادہ است

درد تو خود دوای دل وجان عالمیست
فکر دوا بدرد تو نقصان عالمیست

زلف مشکین و رخ یار تماشا دارد
صبح نزد یک شب تار تماشا دارد

خصم جانی ترا شناختہ ام
ای فلانی ترا شناختہ ام

نہ برم بداگر بدم گوئی
بد زبانی ترا شناختہ ام

نیست ممکن کہ بود گلبدنی بہتر ازین
گلا نیامد بمنظر در چمنی بہتر ازیں

ھر کہ مارا و ترا دید بہم گفت کہ نیست
صنمی خوشتر ازاں برھمنی بہتر ازیں

۶۶۔ کاظم بیگ خاں ممکن

نام کاظم بیگ خاں اور تخلص ''ممکن'' تھا۔ تاریخ پیدائش کہیں تذکروں میں نہیں ملتی۔ ممکن دہلی کے رہنے والے تھے ابتداً میں امیر خاں کے یہاں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے اس کے بعد نواب انتظام الدولہ پسر وزیر الممالک قمر الدین خاں بہادر کے یہاں ملازم ہوئے۔ دہلی کی خرابی کے بعد ممکن دل برداشتہ ہو گئے۔ اور لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں جا کر راجہ بنی بہادر کے یہاں داروغگی کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ راجہ بنی بہادر، نواب شجاع الدولہ بہادر کی طرف سے صوبجات کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔

ممکن فرصت کے اوقات میں شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے اور اپنے کلام پر مرزا فاخر مکین سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے فارسی اشعار کے نمونے ''سفینۂ ہندی'' میں ملتے ہیں۔ (۱)

شب کہ باعکس مہ رویش بمی ساغر زدم — گویا با مہر انور خیمہ بر خاور زدم
بہر دفع چشم بد از روی خویش چوں شنید — ایں دل بیتاب را از سینہ بر مجمر زدم
بسکہ رگہایم نمایاں گشت در پیری ز پوست — کاغذِ بوسیدہ را گوی کہ برسطر زدم
چوں بساط عیش بر چیدند و ساقی رو نہفت — پشت بر دیوار کردم تکیہ بر بستر زدم
از دم گرمی (۲) نظیری سوختم ممکن کہ گفت — آتشی آور دم و در عرصۂ محشر زدم

در حریم وصل ما گنجایش اغیار نیست — در ہزار آئینہ عکس جز جمالِ یار نیست
دادہ در مستی عنانِ دل بدست دیگراں — ممکنِ مادر حقیقت فاعل مختار نیست

عاشقان خوانند تا در طاق ابرویش نماز
صبحدم از خواب جستم بانگ بر منبرم زدم

---

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۹۵

(۲) گرمِ

۶۷۔ کنور درگا پرشاد مہرؔ

نام کنور درگا پرشاد اور تخلص ''مہرؔ'' تھا۔ ان کے والد راجہ دھنپت رائے کا شمار سندیلہ کے بڑے رئیسوں میں ہوا کرتا تھا۔ مہرؔ کی پیدائش اودھ کے اس مردم خیز قصبہ سندیلہ میں ہوئی۔ افسوس کہ مہرؔ کی تاریخ پیدائش اور تعلیم و تربیت سے متعلق تفصیلات کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

فارسی زبان و ادب میں مہرؔ کا نثری کارنامہ ان کی اہم تاریخی کتاب ''بوستان اودھ'' (۱) ہے۔ اس کتاب کی فنی خوبیوں سے مہرؔ کی بحیثیت نثر نگار زیادہ شہرت ہوئی۔ لہٰذا ان کی شاعرانہ صلاحتیں پردۂ خفا میں رہیں، اگرچہ شعر و سخن سے انہیں شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ شاعری کے اس فن میں ان کی استادی کا شرف کسے حاصل تھا یہ بات بھی نہیں تذکروں میں ملتی۔

مہرؔ نے جہاں اپنی کتاب ''بوستان اودھ'' میں اودھ کی تاریخ بیان کی ہے وہیں انہوں نے چند شعراء کے مختصر احوال اور فارسی و اردو کلام کے نمونے بھی جا بجا پیش کئے ہیں اور اخیر میں خود اپنے کلام کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب واحد ذریعہ ہے، جو مہرؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کی ضامن ثابت ہوتی ہے۔ مہرؔ کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

فصل بہار آمد و او در کنار نیست — درد اکہ خاطرم بشکیب و قرار نیست
زاہد مرا بہ تیغ ملامت مکن فگار — ایں خاطر جنوں زدہ در اختیار نیست
بر بستر فراق طپد مہرؔ صبح شام — حاشا کہ بی تو خاطر او را قرار نیست

دائم برخت خوبی رخسار نماند — این جنس گر ان ارزش بازار نماند

---

(۱) ''بوستان اودھ'' ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۲ء میں مطبع دبدبۂ احمدی سے چھپی۔ بعد میں عبداللہ عاشق نے ''بہارستان اودھ'' کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا اور نظامی پریس لکھنؤ نے چھاپا۔

بنشین به گلستان و بزن بادهٔ گلگوں
کیں عهد گل وموسم گلزار نماند

نگار اے تو مارا خوش نه هرگز بوستان آمد
نه چشم خواب را بر باید نه جانم را توان آید
امید از بخت میدارم که گرد مهربان یارم
در آید از درم جانان امید کامران آید
هزاران عهد بربستی بساعت باز بشکستی
کنوں چشم وفا اے مهربان از تو چسان آید
اگر از زلف مشک آگیں گره در باغ بکشائی
معطر بوستان گرد دهوا عنبر فشاں آید

شباب رفت و بدل عشق دلبران باقی
گذشت عهد گل وشوق گلستان باقی
خزاں چه کرد به گلشن بیا تماشا کن
که نیست از گل و بلبل یکی نشاں باقی
نه گل بشاخ بماند و نه عندلیب به باغ
بماند شکوهٔ صیاد و باغبان باقی
هزار کاخ بسیلاب رفت و صد دفتر
مگر بماند سخن از سخن وران باقی
هزار درد کشیدی تو مهر در ره عشق
هنوز هست ترا مهر مه رخان باقی

عیش وطرب وگردش جام است امروز
بزم بے باده اگر هست حرام است امروز
ناتوانی بطرب کوش و بده داد نشاط
مهربان یا رومئی کهنه بخام است امروز
نخل سرسبز وهوا خورم وگل خنده زنان
در چمن جلوه بکن لطف تمام است امروز

دیدهٔ مشتاق است بهر دید ودیدار ترا
گوش میخواهد شنیدن نغز گفتار ترا
حسن روی گلرخان در رنگ و بوی بوستان
میدهد یادی بهر کس صنعت کار ترا
بیغم است از جور گردوں هرا سیر دام عشق
فکر آزادی نباشد یک گرفتار ترا
مهر سر تا پا غریق بحر عصیان بوده است
تکیه بر لطف تو باشد این گنه گار ترا

هزار شکر که آن ماه مهربان گردید
فلک بکام و معین گردش جهان گردید

چناں بدوش من افتاد بارِ کوهِ فراق
که تیر قامت من صورت کمان گردید

دائم برخت خوبی رخسار نماند
این جنس گران ارزش بازار نماند

بنشین به گلستان وبزن بادهٔ گلگوں
کیں عهد گل وموسم گلزار نماند

چشم می گون قد موزوں رخ زیباداری
چشم بدور عجب حسن دلا را داری

نقد دل بر دی وهم و قرار از دلِ ما
هاں کنوں ازمن بیدل چه تمنا داری

۶۸۔ شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام اور ناسخ تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد کا اصل وطن لاہور تھا۔ ان کے خاندانی حالات کا کچھ علم نہیں تذکروں میں مختلف بیانات ملتے ہیں ''آب حیات'' سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ یہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ (۱)

بچپن کا ابتدائی حصہ فیض آباد میں گزارا۔ کسرت کا شوق تھا خوب ورزش کرتے تھے۔ فیض آباد کے ایک امیر ''نواب محمد تقی'' نے انہیں اپنے یہاں ملازمت دی اور لکھنؤ لے آئے۔ مولوی وارث علی سے فارسی زبان کا درس لیا۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ نواب محمد تقی کی ملازمت میں اس شوق کو اور ہوا ملی کیونکہ نواب خود شاعر تھے۔ اکثر اپنے گھر پر شعر و شاعری کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اس وقت جرأت، مصحفی اور انشاء کے کلام کی دھوم تھی۔

اس کے بعد لکھنؤ کے ایک اور امیر مرزا حاجی کی صحبت ناسخ کے حصہ میں آئی اور یہ زمانہ ناسخ کے لئے بہت اہم اور مفید ثابت ہوا۔ مرزا کی سرکار میں مرزا قتیل قاضی محمد صادق خان اختر جیسی اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ یہیں آکر ناسخ کا کلام بھی پروان چڑھا، طبیعت میں جوش پیدا ہوا۔ کلام نے رنگ پکڑا اور انھوں نے نہ صرف اشعار کہنے شروع کئے بلکہ ان کے اشعار نے دور دور تک شہرت پائی۔ اس طرح بہت کم وقت میں عزت و شہرت سے ہمکنار ہوئے۔ ''بہارستان اودھ'' میں ہے۔

> ''سر دفتر شعرائے عظام لکھنؤ مانا گیا ہے۔ فصاحت اور معنی آفرینی میں یکتائے روزگار تھے۔ فکر رسا اور بلاغت کلام میں مرزا صائب اور ملا ظہوری سے گوے سبقت لے گئے تھے اکثر امراء و عمائد لکھنؤ نے ان کے سامنے زانو تلمذ تہ کیا تھا اور انکی شاگردی کا حلقہ گوش جان میں ڈالا تھا معتمد الدولہ وزیر اعظم بھی شیخ امام بخش ناسخ کا شاگرد تھا۔'' (۲)

---

(۱) بہارستان اودھ: ص ۳۲۹

(۲) ایضاً: ص ۶۹

ساری عمر لکھنؤ میں رہ کر گزار دی۔ درمیان میں الہ آباد کے کئی سفر کئے اس کے علاوہ بنارس، کانپور اور عظیم آباد کی بھی سیر کی۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ عمر کا صحیح اندازہ تذکروں سے نہیں ہوتا کیونکہ تاریخ پیدائش تذکروں میں نہیں ملتی۔ بعض کا بیان ہے کہ چونسٹھ (۶۴) پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر پائی لیکن صحیح بیان کہیں نہیں دیا ہے۔

ناسخ بنیادی طور پر اردو کے شاعر تھے۔ فارسی شاعری کرتے تھے لیکن ان کا فارسی سرمایہ بہت کم ہے۔ انھوں نے مرزا قتیل سے فیض صحبت تو اٹھایا مگر خاص طور پر قتیل کا شاگرد ہونے کی وضاحت کسی تذکرے سے نہیں ہوتی۔ ان کے فارسی کلام میں غزلیں نہیں ہیں بلکہ جو کچھ ہے وہ مدحیہ اور تاریخی قطعات ہیں۔ ناسخ کی مطبوعہ کلیات (۱) میں ان قطعات کے اشعار کی مجموعی تعداد پونے چھ سو (۵۷۵) کے قریب ہے۔ تذکرہ ''صبح گلشن'' میں ان کے فارسی کلام کے متعلق یہ عبارت ہے:

'' ... بشعر فارسی کمتر توجہ می نمود در علوم ادبیہ دستگاہ کامل داشت ...'' (۲)

نمونۂ کلام:

طرز اندیشہ آفریدۂ اوست　　درتن لفظ جان دمیدۂ اوست
پشت معنی قوی ز پہلویش　　خامہ را فربہی ز بازویش

ان کی تاریخ گوئی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

نواب سعادت علی خاں کی تاریخ جلوس:

خرد سال جلوسِ مسندش گفت
بجاہ وحشمت و اقبال باشد (۱۲۱۲ھ)

باشاہ غازی الدین حیدر کے تخت سلطنت پر جلوس کی تاریخ:

بحمد اللہ کہ با اقبال ودولت　　بہ تخت زر جلوس شاہ گردید

(۱) کلیات ناسخ (مخطوطات: ۱۔ لکھنؤ یونیورسٹی، ۲۔ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، ۳۔ رضا لائبریری لا امپور، ۴۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

(۲) صبح گلشن: ص ۴۹۲

زمین و آسمان یک بزم عیش است　　زماهی خرمی تاماه گردید
مبارک باد اے آفاق عالم　　طلوع آفتاب جاہ گردید
ندا آمد بگوشم زود یارب　　کہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید
پے سال ھمایوں جلوسش　　بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید (۱۲۴۳ھ)(۱)

بادشاہ غازی الدین حیدر کا انتقال ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں ہوا۔ ناسخ نے تاریخ وفات کہی۔(۲)

از وفات جناب شاہ زمن　　گوھمہ عالمی ھلاک شدہ
دھر گردید بہر ما دوزخ　　سینہ ھا آہ درد ناک شدہ
رفت دامان صبراز دستم　　جیب صبر و شکیب چاک شدہ
گفت تاریخ مصرعۂ استاد　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

---

(۱) دیوان ناسخ: ص ۲۱۲

(۲) دیوان ناسخ: ص ۱۹۹

۶۹۔ سید غلام نبیؔ بلگرامی

غلام نبی نام اور تخلص نبیؔ تھا۔ یہ میر عبدالجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے۔ غلام نبیؔ کی پیدائش ۱۱۱۱ھ (۱) میں اودھ کے مردم خیز قصبہ بلگرام میں ہوئی ان کے والد سید محمد باقر بن سید عبدالحمید کا خاندانی تعلق سید محمد اکبر بلگرامی کے خاندان سے تھا۔

غلام نبیؔ بلگرامی نے علم وادب کی تعلیم میں طفیل محمد سے حاصل کی۔ علم موسیقی میں اچھی مہارت پیدا کی۔ ساتھ ہی تیراندازی میں بھی کمال حاصل کیا۔ شعروشاعری سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ ریختہ گوئی بھی کی ہے اور فارسی اشعار بھی کہے ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت، عربی اور دیگر علوم وفنون میں بھی یہ کسی سے کم نہ تھے۔ میر غلام علی آزادؔ بلگرامی لکھتے ہیں:

''مشارٌ الیہ در صفای ذکا وعلو فطرت انواع قابلیت یکتای زمان بود ودر فنون عربی و فارسی وھندی ممتاز اقران، تحصیل علمی تمام در خدمت استاذ المحققین میر طفیل محمد بلگرامی طلب ثراہ نمود'' (۲)

غلام نبیؔ بلگرامی اودھ کے نواب وزیر صفدر جنگ کے رفیقوں میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ۱۱۶۳ھ میں نواب کی افغانوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ تو غلام نبیؔ بھی شریک تھے، اور اسی معرکہ کے دوران انکی (۲۲ شوال ۱۱۶۳ھ) وفات ہوئی۔ آزادؔ بلگرامی نے تاریخ وفات کہی:

وحید زمان سید خوش سخن — بہ فردوس می زد جام نبی
قلم گریہ سر کردہ تاریخ او — رقم کرد ''ھی ھی غلام نبی'' (۳)

۱۱۶۳ھ

غلام نبی، مردان علی مبتلاؔ کے خاص دوستوں میں تھے۔ (۱) ان کے بہت سے شاگرد ہوئے۔ مرزا

(۱) سفینۂ ہندی: ص ۱۴۸
(۲) سروِ آزاد: ص ۳۱۲
(۳) گلشن سخن: ص ۲۴۳

مظہر جانِ جاناں ان کے مشہور شاگردوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ہندی میں غلام نبی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ غلام نبی کے دیوان کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

همیشه دردل خود یاد زلف اودارم — مسنو نگرم که چنین مار در سبو دارم

ازخرام اودری برخویشتن وا می کنم — عالم بالا درین عالم تماشامی کنم

آخر ازتیر گی بخت نگین کام گرفت — که زلعل لب اوبوسه به پیغام گرفت

بسکه شه آغوش پستی منزلِ آرام من — چون نگین در موم هم بالانگرددنام من

همرهِ خود این رقیب بدرگ آوردی چرا — من نه آن صیدم که بگریزم سگ آوردی چرا

خط ز زلف تو رخ بزور گرفت — جای مار این هجوم مور گرفت

تا نمک ریخت بر جراحتِ من — لب شیرین یار شور گرفت

در چمن چون گل نباشد آشنای عندلیب — کز ته دل زربرآرد از برای عندلیب

درچمن گل برکف خودزعفران آورده است — تا بدل با خنده سازد گریهای عندلیب

دوزخ عشاق باشد بی رخ جاناں بهشت — باغ بی گل می شود ماتم سرای عندلیب

داد ازدست نگاه تو که هنگام وصال — چون تغافل دهداز دست حیا ساز کند

رباعی کانمونہ:

آنها که براه بی هر اسی شده اند — در خلق علم بحق شناسی شده اند

در یاب که این خدا فروشانِ جهان — درترک لباس خوش لباسی شده اند (۱)

نبی کا انداز بیان اگرچہ سادہ لیکن شوخی وظرافت سے پُر ہے۔

---

(۱) سروِ آزاد: ص ۳۱۴

۷۰۔ شیخ بہادر علی وامقؔ

بہادر علی نام اور تخلص وامقؔ تھا۔ ان کا خاندانی تعلق سادات ترمذی سے تھا۔ ان کے بزرگ ترمذ کے رہنے والے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے اکبر آباد کے مضافات ''شاہ آباد'' میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وامقؔ کی پیدائش شاہ آباد کے قصبہ چرامئو میں ہوئی۔ یہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دیگر علوم کی تحصیل کے لئے لکھنؤ آئے۔

لکھنؤ آ کر وامقؔ کو شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ انھوں نے میر ساجد علی کی وساطت سے مصحفیؔ تک رسائی حاصل کی اور فارسی و اردو میں اشعار کہنا شروع کئے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

''بہ سبب موزونی طبع چیزی موزوں می کرد بذریعہ میر ساجد علی صاحب برائے مشورۂ سخن پیش فقیر رسیدہ چوں فکر ھندی و فارسی ھر دو می کرد آخر آخر بعد گفتن ریختۂ چند از نظم ھندی در گذشتہ بہ فارسی گوئی کمر ھمت محکم بربست'' (۱)

ان کی صحیح عمر کا اندازہ تذکروں سے نہیں ہوتا۔ اس لئے تاریخ پیدائش اور وفات کا سنہ کہیں نہیں ملتا۔ البتہ مصحفیؔ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے ان کا شمار عہد نوابین کے شعراء میں ہوتا ہے۔ کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

رباعی کا نمونہ:

مکن آزردہ دل ظالم چو من آزردہ جانی را
زند یک نالۂ آزردہ دل برھم جہانی را
چناں برخورد پیکانش کہ آتش داد پولادش
نشان تیر بارش کردہ جودم استخوانی را

محبت پیشگاں را صبر ھم یک گونہ می باید
چرا رسوائے عالم میکنی اے چشم تر مارا

---

(۱) ریاض الفصحاء: ص ۳۷۵

رباعی کانمونہ:

اے تشنۂ رہ چاہ ذقن گیر خدارا — ازچشمۂ حیواں مطلب آب بقارا
ھر عاشق دل خستہ کہ پابوس تو خواھد — از خون جگر وام کند رنگ حنارا

متفرق اشعار کے چند نمونے:

وارد دل مارا خم زلف تو مشوش
تا نالہ فراموش کند راہ لب ما

آہ من ترجمۂ حال پریشانی ھست
نالہ ام مصرعۂ برجستۂ دیوانی ھست

زمن نیاز واز دھر زماں جفای ھست
میا نہ من داد طرفہ ماجرای ھست

ھیچم زبیابان محبت خبری نیست
مستانہ رھے می روم و راہ بری نیست

رباعی کانمونہ:

دریغ کس نہ رسد گردم وصیت من — مرا کہ برلب خاموش داستانی ھست
ز لکھنؤ چہ سفر می کنی مرو واثق — دریں دیار زمینی و آسمانی ھست

۱۷۔ نول رائے وفاؔ

نول رائے نام اور وفاؔ تخلص تھا۔ ان کا تعلق کایستھ قوم سے تھا۔ والد اور جد بزرگوار اٹاوہ کے موروثی قانون گو تھے۔ نول رائے کا ابتدائی زمانہ راجہ رتن چند کے پاس گزرا جو ذات کے بنئے تھے اور سید عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کے یہاں دیوان کے عہدے پر مقرر تھے۔ اپنی ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی بدولت نول رائے کو بھی راجہ بننے کا موقع حاصل ہوا۔ دراصل احمد شاہ کے عہد حکومت (۱۱۶۱ھ۔ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۴۸ء۔۱۷۵۴ء) میں نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کو اودھ اور الہ آباد کی صوبہ داری ملی۔ نول رائے جو کہ نواب برہان الملک سعادت خاں کے زمانے میں ان کے منشی تھے اور ان کے بعد نواب صفدر جنگ کے نائب مقرر ہو گئے تھے، مذکورہ بالا دونوں صوبوں میں نواب کے ہمراہ تھے اور ایک زبردست مدبر، منتظم اور سیاست داں کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں صوبۂ الہ آباد اور اودھ کے قرب وجوار میں پٹھانوں کا بڑا زور تھا۔ اس وقت ان کی دو زبردست ریاستیں روہیلکھنڈ اور فرخ آباد میں تھیں اور ان پٹھانوں کا اقتدار نواب صفدر جنگ کے لئے خدشہ کا باعث بن گیا۔ چنانچہ ان دونوں ریاستوں کے رہنماؤں کو آپس میں لڑوا کر نواب موصوف نے نول رائے کے ساتھ اس علاقہ پر قبضہ کر لیا، بعد میں پٹھانوں نے اکٹھا ہو کر حملہ کیا۔ نول رائے اس وقت قنوج میں تھے۔ تاریخ وفات ۱۰ رمضان ۱۱۶۳ھ (۱۳ اگست ۱۷۵۰ء) ہے۔

تاریخ وفات:

رواں کردخوں یلاں جو بجو ادا کرد حق نمک موبمو
زیزداں رسیدند حوروملک بیا رو برو "اے نول سرخرو" (۱)

کسی تذکرہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ راجا نول رائے وفاؔ کب پیدا ہوئے تھے اور فن شاعری میں کس سے شاگردی حاصل کی، کیوں کہ یہ ایک اچھے منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ تذکروں سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ فارسی

(۱) مفتاح التواریخ: ص ۳۳۰

اور اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

وفاؔ ہر قسم کے موضوعات کو نظم کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ عاشقانہ جذبات کی عکاسی اور سوز و گداز کا اظہار ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تذکرہ نگاروں کی رائے ہے کہ:

''موضوعات تصوف اور پند و نصائح کو بھی انھوں نے لطیف طریقے سے ادا کیا ہے کہیں کہیں تشبیہ و استعارہ کی لطافت اور تخیل کی نزاکت بھی خوب ملتی ہے۔ زبان کی سادگی و سلاست کے ساتھ بندش کی چستی اور کلام کی روانی پائی جاتی ہے'' (۱)

قیام الدین قائمؔ اپنے تذکرے میں وفاؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

مقبول خاطر ارباب صفا لالہ نول رائے المتخلص بہ وفاؔ جوانیست نوخاستہ بہ جمیع صفات آراستہ و پیراستہ، جدت ذہن و جودت فہم اصابت رائے و لطافت مزاج بہ مرتبۂ اتم دارد'' (۲)

سید حیدر بخش حیدریؔ کا بیان ہے کہ:

''وفا مخزن نکات کی ترتیب کے زمانے میں زندہ تھا اور قائم کا شاگرد تھا'' (۳)

اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وفاؔ نے قیام الدین قائمؔ سے شاگردی حاصل کی تھی۔

اس بیان کی تصدیق کسی حد تک میر حسن بھی اپنے تذکرے میں کرتے ہیں:

''جوانی است نوخاستہ بزیور علم و عمل پیراستہ ہوش و گوش فہم و ذکا، صاحب حلم و حیا لطافت مزاج از گل زیادہ مانند بلبل دل از دست دادہ، برادر خوردش راجا گلاب رائے دیوان و ... لیکن این عزیز مصروف اکتساب و غریق مطالعہ کتب۔ طلب ہر کمال دامنگیر حال طبع دردمند داشت عاشق مزاج بود اکثر فارسی و ریختہ مینماید۔ (۴)

تمام بیانات سے ان کو فارسی کا مستند شاعر تسلیم یا جاتا ہے لیکن افسوس کہ معاصر تذکروں میں ان کا نمونۂ کلام نہیں ملتا۔ جسکی بنا پر ان کے کلام کا جائزہ غیر مکمل سا معلوم ہوتا ہے۔ دیوان کہاں ہے کس حالت میں ہے، ہے بھی کی نہیں اس سب باتوں سے متعلق تذکرے خاموش ہیں۔

---

(۱) اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ: ص ۱۰۶

(۲) تذکرہ مخزن نکات: ص ۷۲

(۳) گلشن ہند: ص ۹۶

(۴) تذکرہ شعرائے اردو: ص ۲۰۷

۷۲۔ مرزا ابوعلی ہاتفؔ

نام مرزا ابوعلی اور تخلص ''ہاتفؔ'' تھا۔ یہ اصفہان کے مرزا اسمٰعیل ایماؔ کے نواسے تھے۔ ہاتفؔ اپنے والد کے ساتھ کم عمری میں ہی ہندوستان آئے۔ بعض تذکروں میں انکی عمر دو سال لکھی ہے۔ کئی ایک تذکروں کے مطابق انکی ولادت ہندوستان میں ہی درج ہے۔

بہر کیف ہندوستان میں انھوں نے دہلی میں قیام کیا۔ یہاں ایک عرصہ تک نواب صفدر جنگ کے ساتھ ان کا قیام رہا۔ پھر نواب موصوف کی صوبہ اودھ کی جانب واپسی پر ہاتفؔ نواب کی رفاقت میں رہے۔ نواب کی وفات بھی ہاتفؔ کے زمانہ میں ہی واقع ہوئی۔ اس کے بعد مہاراجہ ٹکیٹ رای بہادر کے توسط سے نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے ہاتفؔ منسلک ہو گئے تھے۔

ہاتفؔ نوجوانی سے ہی شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ مشق سخن میر شمس الدین فقیرؔ سے کی۔ ''ہاتفؔ'' تخلص ان ہی کا عنایت کردہ ہے مؤلف تذکرہ ''نشتر عشق'' کے الفاظ میں:

''نسبت تلمذ خود بہ میر شمس الدین فقیر رسانیدہ بود'' (۱)

ہندیؔ لکھتے ہیں:

''بعد رسیدن بسن تمیز شوق شعر وشاعری پیدا کردہ مشق سخن در خدمت میر شمس الدین، فقیر عباسی، دھلوی نمودہ ھاتف تخلص بخشیدہ آن مرحوم است'' (۲)

''عقد ثریا'' میں ان کے اساتذۂ سخن کے سلسلہ میں میر افضل ثابتؔ کا نام ملتا ہے، عبارت ہے:

''چوں طبعش موزوں افتادہ بودہ ھر چہ میگفت بخدمت استاد فاضل الشعراء میں افضل ثابت برای اصلاح می برد آخرھا از صحبت میر شمس الدین فقیر مستفید شدہ'' (۳)

---

(۱) تذکرۂ نشتر عشق: ص ۱۷۷۹

(۲) سفینۂ ہندی: ص ۲۴۰

(۳) عقد ثریا: ص ۶۲

نواب آصف الدولہ کی ملازمت کے زمانے میں ۱۲۰۲ھ /۱۷۸۵ء میں ہاتف کا انتقال ہوا۔ تذکرہ ''نشترِ عشق'' میں ہے:

''تا سنہ یکھزار ودوصد ودو کہ در آن ایام ہفتاد مرحلہ از عمر خود طی کردہ بود باوجود سن پیری وتنگدستی بکمال شگفتگی وکشادہ پیشانی زندگانی می نمود ... ''(۱)

ان کا فارسی کلام نہایت عمدہ اور لطیف ہے۔ کلام میں نہایت شستہ الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونۂ کلام نقل کیے جاتے ہیں:

دیر آمد و زود از بزم آن جہاں رفت — افسوس چنیں آمد وصد حیف چنان رفت

این میکشدم اینکہ پس از دیر چو برخورد — روی سخنش با من ودل باد گری داشت
می ماند چہ سان صبر وسکون تاب وتوانم — این قافلہ رھزن چو تو بیداد گری داشت

دلم خراب زغم دیدہ اشک جیحون است — بہ بین مرا کہ چہ حال درون وبیروان است

رباعی کے چند نمونے:

نسیم نکہتِ آن کاکل از کجا آورد — کہ عشق بر سرمن باز صد بلا آورد
ز خوابِ ناز سحرگاہ دیدہ یار گشود — فلک ز آئینۂ مہر رونما آورد

درداکہ ز دھر ربا تمیزاں رفتند — زیں بزم چو شمع اشک ریزاں رفتند
ما یوسف دل را بلکہ خواھم فروخت — اکنون کہ ازین مصر عزیزاں رفتند
ھاتف کہ تو جسم ناتوانی داری — چون شمع بلب رسیدہ جانی داری
ازداغ غم یارچہ آمد بسرت — تقریر بکن توھم زبانی داری

---

(۱) تذکرۂ نشتر عشق (جلد پنجم) ص ۱۷۷۸

اشعار کے چند نمونے:

روز محشر شد و آنشوخ بدادم نرسید — آه افتاد مرا کار به دیوان دگر

شب بیاد آن گل رخسار اشکی ریختم — میدمد بوی گلاب ازجیب و دامانم هنوز

نماند پیش تو مارا زبان گویائی — چو برگ گل همه گوشیم تا چه فرمائی
چگونه عشق تو پوشم که همچو گل پیداست — زجا کهای دلم کوچه های رسوائی
چگونه سر بسلامت کسی تواند برد — چنین که آن مژه دارد سر صف آرائی
چگویمت که چهارفت در غم تو مرا — زدل قرا روز تن جان ز دیده بینائی

منابع و مآخذ

کتابیات

رسائل

مائیکرو فلم

۱۔ آب کوثر	محمد اکرام	تاج پرنٹرز (طبع ہفتم) ۶۹۔ نجف گڑھ روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۵	۱۹۹۱ء
۲۔ آب حیات	محمد حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۲ (طبع ہفتم)	۱۹۸۶ء
۳۔ آپ (شعرائے قصبات اودھ)	عرفان عباس	مطبوعہ الواعظ صفدر پریس لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۴۔ آپ تھے (ایضاً)	ایضاً	مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۵۔ آپ ہیں (ایضاً)	ایضاً	ایضاً	۱۹۸۸ء
۶۔ آثار مشرق	ابراہیم عمادی	مطبوعہ لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۷۔ احسن التواریخ	منشی رام سہائے تمنا مرتب: ڈاکٹر ذکی کاکوروی	مطبوعہ ندائے حق پریس، لکھنؤ (نیا ایڈیشن) نمبر ۷۵ حضرت گنج لکھنؤ	۱۹۸۸ء
۸۔ احوال و آثار سراج الدین علی آرزو	ڈاکٹر ریحانہ خاتون	مطبوعہ انڈو پرشین سوسائٹی دہلی	۱۹۸۷ء
۹۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	مطبوعہ انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۴۲ء
۱۰۔ ادبی مقالے	کاظم علی خاں	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۱۱۔ آرائش محفل	میر شیر علی افسوس	مطبوعہ ہمدرد برقی پریس انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۶۳ء

۱۲۔اردو انسائیکلو پیڈیا		مطبوعہ فیروز سنز کراچی (طبع دوم)	۱۹۶۸ء
۱۳۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب، لاہور	۱۹۶۶ء
۱۴۔اردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ	گپت سہائے سریواستو	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	۱۹۶۹ء
۱۵۔اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں	سید عبدالحیؒ ترجمہ: ڈاکٹر ابوالعرفان ندوی	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۱۶۔اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقاء	مطبوعہ منہاج الدین اصلاحی شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۷۳ء
۱۷۔انشاء عہد اور فن	اسلم پرویز	مطبوعہ، مکتبہ شاہراہ دہلی	۱۹۶۱ء
۱۸۔انشاء اللہ خاں انشاء	عابد پیشاوری	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۱۹۔انیس الاحبا	موہن لال انیس	(قلمی نسخہ) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	۱۷۸۳ء
۲۰۔انیس العاشقین	رتن سنگھ زخمی	(قلمی نسخہ) لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری	۱۸۲۹ء
۲۱۔اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۱ء
۲۲۔آئین اکبری	ابوالفضل (اردو ترجمہ) فدا علی	مطبوعہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۱۹۳۹ء

۲۳۔آئینہ اودھ	شاہ سید محمد ابوالحسن ابوالحسن	مطبوعہ مطبع نظامی، کانپور	۱۸۸۷ء
۲۴۔بارہ بنکی	چوہدری سید محمد علی زیدی	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۲۵۔باغ معانی (تذکرہ شعرائے فارسی)	نقش علی، تصحیح وترتیب: عابد رضا بیدار	مطبوعہ لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی (طبع دوم)	۱۹۹۲ء
۲۶۔بانی درس نظامی:	محمد رضا فرنگی محلی	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۲۷۔بلگرام کے فارسی شعراء	امان اللہ انصاری	مطبوعہ بہار لیتھو پریس سبزی باغ، پٹنہ	۱۹۹۲ء
۲۸۔بہار بے خزاں	احمد حسین سحر (تصحیح: ڈاکٹر نعیم احمد	مطبوعہ مطبع کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۸ء ۱۹۶۸ء
۲۹۔بہارستان اودھ (اردو ترجمہ: بوستان اودھ)	مترجم: عاشق عبداللہ)	دہلی فیض پریس	
۳۰۔بوستان اودھ	راجہ درگا پرشاد مہر	مطبوعہ مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ لکھنؤ	۱۸۹۲ء
۳۱۔تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری	مطبوعہ راجہ رام کمار پریس لکھنؤ	۱۹۵۲ء
۳۲۔تاجدار اودھ	امجد علی خاں	مطبوعہ صفدر الواعظ پریس لکھنؤ کلچرل ایسوسیشن، ۵۶ کچا احاطہ امین آباد، لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۳۳۔تاریخ (رسالۂ ہندوستانی الہ آباد ۱۹۳۱۔۱۹۴۸ء)		مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۳ء

۳۴۔تاریخ اودھ (جلد اول تا پنجم)	نجم الغنی خاں	مطبوعہ منشی نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۹ء
۳۵۔تاریخ اودھ (دو جلد) ۱۔سوانحات سلاطین اودھ ۲۔قیصر التواریخ	کمال الدین حیدر زائر	مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۹۶ء
۳۶۔تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ	امجد علی خاں	مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۳۷۔تاریخ خطۂ پاک بلگرام	قاضی شریف الحسن بلگرامی	ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ	۱۹۵۸ء
۳۸۔تاریخ شعرائے اردو	دتاسی (گارساں) ترجمہ: ایف۔فیلن اور کریم الدین	مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی	۱۹۴۸ء
۳۹۔تاریخ فرح سیر و اوائل محمد شاہ	شیو داس لکھنوی مرتبہ: سید حسن عسکری	مطبوعہ لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ	۱۹۷۴ء
۴۰۔تاریخ فرح بخش (اردو ترجمہ)	محمد فیض بخش کاکوروی مترجم: سید حامد حسین	مطبوعہ ادارۂ تحقیقات لاہور	۱۹۷۵ء
۴۱۔تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ)	محمد قاسم فرشتہ مترجم: عبدالحئ خواجہ	علمی پرنٹنگ پریس لاہور (طبع دوم) ادبی مارکٹ چوک انارکلی، لاہو	۱۹۷۴ء
۴۲۔تاریخ فیروز شاہی	ضیاء الدین برنی	مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ	۱۸۶۲ء
۴۳۔تاریخ لکھنؤ	سید آغا مہدی	مطبوعہ جمعیت خدام عزا کراچی کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمٹیڈ، ایف۔۱۷۱/۱۴۲ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸	۱۹۷۶ء

۴۴۔تاریخ لکھنؤ	محمد باقر شمس لکھنوی	مطبوعہ عکس لطیف دارالتصنیف، کراچی	
۴۵۔تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ ابن احمد بن عبداللہ سرہندی	مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ	۱۹۷۶ء
۴۶۔تاریخ ممتاز (واجد علی شاہ کے خطوط کا مجموعہ)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد باقر	اردو مرکز لاہور	۱۹۶۴ء
۴۷۔تحقیقی جائزے (جلد اول)	ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری	مطبوعہ: سرفراز قومی پریس، لکھنؤ مکتبہ ادبستان۔۱۳۱ نرسنگ گڑھ، سری نگر، کشمیر	۱۹۶۸ء
۴۸۔تحقیقی نوادر	ایضاً	مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ	۱۹۷۴ء
۴۹۔تحفۃ العالم	عبداللطیف شوستری	مطبوعہ سرکار عالی حیدر آباد، دکن	۱۲۹۷ء
۵۰۔تذکرہ الشعراء (تذکرہ ہندی)	غلام ہمدانی مصحفی (مرتبہ: مولوی عبدالحق)	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۳۳ء
۵۱۔تذکرۃ الشعراء	محمد عبدالغنی خاں فرخ آبادی	مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ	۱۹۱۶ء
۵۲۔تذکرۃ الشعراء	ابن امین اللہ طوفان مرتبہ: قاضی عبدالودود	مطبوعہ آزاد پریس، پٹنہ	۱۹۵۴ء
۵۳۔تذکرہ انتخاب یادگار	امیر مینائی	مطبوعہ	۱۸۷۳ء
۵۴۔تذکرہ آفتاب عالمتاب	محمد صادق اختر		
۵۵۔تذکرہ بہار سخن	برق سیتاپوری	مطبوعہ لیبل لیتھو پریس سیتاپور، پٹنہ	۱۹۲۲ء
۵۶۔تذکرہ بہار سخن	شیام سندر داس	مطبوعہ	

۵۷۔تذکرہ بہار گلشن	برج کشور کول	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۲ء
۵۸۔تذکرہ بے بہا	محمد حسین نوگانوں	مطبوعہ جید برقی پریس بلیماران، دہلی	
۵۹۔تذکرہ خلاصۃ الافکار	مرزا ابوطالب اصفہانی	(قلمی نسخہ) کتابخانہ تہران	۱۸۲۵ء
۶۰۔تذکرہ روز روشن	مظفر حسین گوپاموی	مطبوعہ مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۷ھ
۶۱۔تذکرہ ریاض العارفین	آفتاب رائے لکھنوی (تصحیح ومقدمہ) سید حسام الدین راشدی	مطبوعہ انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان	۱۹۷۶ء
۶۲۔تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن (مرتبہ) محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	مطبوعہ انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۴۰ء
۶۳۔تذکرہ شورش (رموز الشعراء)	غلام حسین شورش مرتبہ: ڈاکٹر محمود الٰہی	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	
۶۴۔تذکرہ صبح گلشن	سید محمد صدیق حسن خاں	مطبوعہ مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۸۷۸ء
۶۵۔تذکرۂ عشقی	وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی مرتبہ: کلیم احمد	مطبوعہ	۱۹۶۳ء
۶۶۔تذکرہ علمائے فرنگی محل	محمد عنایت اللہ انصاری	مطبوعہ اشاعت العلوم برقی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۰ء
۶۷۔تذکرہ علمائے ہند	رحمان علی	مطبوعہ منشی نولکشور، لکھنؤ (طبع دوم)	۱۹۱۵ء
۶۸۔تذکرہ گل عجائب	اسد اللہ خاں تمنا اورنگ آبادی	مطبوعہ اتر پردیش، اردو اکاردمی، لکھنؤ	۱۹۸۵ء

۶۹۔تذکرہ نادر	کلب حسین خاں نادر (مرتبہ) مسعود حسن رضوی		
۷۰۔تذکرہ نشتر عشق (جلد ۵)	حسین قلی خاں عظیم آباد	تاجکستان	
۷۱۔تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک	سید علی رضا نقوی	مطبوعہ موسسہ مطبوعاتی علمی تہران	۱۹۶۴ء
۷۲۔تذکروں کا تذکرہ	مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن	مطبوعہ سود لیتھو پریس و اعلیٰ پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۶ء
۷۳۔تفضیح الغافلین	مرزا ابوطالب اصفہانی لکھنوی ترتیب و تصحیح : عابد رضا بیدار	مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۵ء
۷۴۔تقویم ہجری و عیسوی	(مرتبہ) ابوالنصر محمد خالدی	مطبوبہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۳۹ء
۷۵۔تکملۃ الشعراء	قدرت اللہ شوق رامپوری	(قلمی نسخہ) رامپور رضا لائبریری رامپور	۱۲۱۸ھ
۷۶۔تین تذکرے	(مرتبہ) نثار احمد فاروقی	مطبوعہ مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶	۱۹۶۸ء ۱۹۶۸ء
۷۷۔چمنستان شعراء	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد	۱۹۲۸ء
۷۸۔حزن اختر	واجد علی شاہ (مرتبہ) امجد علی خاں	مطبوعہ واجد علی شاہ اکادمی	۱۹۸۱ء

۷۹۔ چہار گلزار شجاعی	منشی ہرچرن داس	(قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی لائبریری	۱۷۸۷ء
۸۰۔ حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی بریلوی	مطبوعہ نظامی پریس بدایوں	۱۹۳۳ء
۸۱۔ حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۷۰ء
۸۲۔ خزانۂ عامرہ	غلام علی آزاد بلگرامی	مطبوعہ نولکشور پریس، کانپور	۱۸۷۱ء
۸۳۔ خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام	مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی	۱۹۳۶ء
۸۴۔ خوش معرکۂ زیبا	سعادت یار خاں ناصر	مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور	۱۸۴۶ء
۸۵۔ دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں انشاء (اردو ترجمہ) پنڈت کیفی دہلوی	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، (طبع دوم)	۱۹۱۶ء
۸۶۔ دستور الفصاحت	احمد علی یکتا لکھنوی (مرتبہ) امتیاز علی خاں عرشی	مطبوعہ سلسلۂ مطبوعات ریاست رامپور	۱۹۴۳ء
۸۷۔ دلی کا دبستان شاعری	نور الحسن ہاشمی	مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۸۸۔ دو ادبی اسکول	علی جواد زیدی	مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۸۹۔ دیوان اسیر		مطبوعہ دار العلوم ندوہ، لکھنؤ	۱۸۵۳ء
۹۰۔ دیوان انس (منشی لال چند)		مطبوعہ در کلا کوٹھی علوی بخش خاں	
۹۱۔ دیوان جرأت	(مرتبہ) حسین بلگرامی	آگرہ	۱۸۴۷ء
۹۲۔ دیوان جواہر		(قلمی نسخہ) رامپور رضا لائبریری، رامپور	

۹۳۔ دیوان شکری		(قلمی نسخہ) ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ	
۹۴۔ دیوان عاصی		(قلمی) رام پور رضا لائبریری رامپور	۱۸۴۴ء
۹۵۔ دیوان فیض	کرتا کرشن	مطبوعہ بیت السلطنت محلّہ رام نگر، لکھنؤ	۱۲۶۱ء
۹۶۔ دیوان ناسخ	(غیر مطبوعہ) کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد		۱۲۳۴ء
۹۷۔ دیوان ہدا	ہدایت اللہ خاں ہدا		
۹۸۔ رود کوثر	محمد اکرام	مطبوعہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کمبائن پرنٹرز، کلب روڈ، لاہور (طبع ہشتم)	۱۹۸۲ء
۹۹۔ ریاض الفصحاء	غلام ہمدانی مصحفی	مطبوعہ جامع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۴ء
۱۰۰۔ زبدۃ الکوائف	راجہ۔ جے گوپال ثاقب	(قلمی نسخہ) ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ	
۱۰۱۔ سخن شعراء	عبدالغفور نساخ	مطبوعہ نولکشور لکھنؤ	۱۸۷۴ء
۱۰۲۔ سخنوران قصبہ کڑا (تذکرہ شعرائے الہ آباد)	محمد واصل عثمانی	مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۱۰۳۔ سخنوران کاکوروی	حکیم نثار احمد علوی	مطبوعہ شوکت علی پرنٹرز، کراچی	۱۹۷۸ء
۱۰۴۔ سراپا سخن (تذکرہ الشعراء)	محسن علی محسن	مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۸۹۰ء

۱۰۵۔سرور آزاد	غلام علی آزاد بلگرامی (مرتبہ) عماد الملک سید حسن بلگرامی	مطبوعہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، دکن	۱۹۱۳ء
۱۰۶۔سفینۂ خوشگو (جلد ۳)	بندرابن داس خوشگو (مرتبہ) عطاء الرحمٰن کاکوی	مطبوعہ عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ	۱۹۵۹ء
۱۰۷۔سفینۂ ہندی (فارسی)	بھگوان داس ہندی (مرتبہ) عطاء الرحمٰن کاکوی	مطبوعہ عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ	۱۹۵۹ء
۱۰۸۔سلطان التواریخ	رتن سنگھ زخمی	(قلمی نسخہ) ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی	۱۲۵۸ھ
۱۰۹۔سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات	صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۱۱۰۔سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	خلیق احمد نظامی	مطبوعہ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی	
۱۱۱۔سن ستاون	پنڈت سندر لال	مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۱۱۲۔سیر المتاخرین	مولوی غلام حسین طباطبائی	مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۸۹۴ء
۱۱۳۔سید مقتضی بلگرامی زبیدی حیات اور کارنامے	رخسانہ نکہت لاری، ام ہانی	مطبوعہ، اے ون آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	۱۹۹۰ء
۱۱۴۔شاہان اودھ کے	(مترجم و مرتب)	مطبوعہ انجمن پریس	۱۹۷۳ء

کتب خانے (سپرنگر)	محمد اکرام چغتائی	نشتر روڈ، کراچی	
۱۱۵۔ شاہیہ نیشاپوریہ معروف بہ تاریخ اودھ	قاسم علی (ترجمہ وترتیب شاہ عبدالسلام)	مطبوعہ لبرٹی آرٹ پریس، دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	۱۹۹۰ء
۱۱۶۔ شباب لکھنؤ	(مترجم) محمد احمد علی	مطبوعہ ناظر پریس، لکھنؤ	۱۹۱۲ء
۱۱۷۔ شعرالہند	مولانا عبدالسلام ندوی	مطبوعہ مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۹۶۹ء
۱۱۸۔ شعرائے اردو کے تذکرے	حنیف نقوی	مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۱۱۹۔ شعرالعجم	شبلی نعمانی	مطبوعہ مطبع معارف، اعظم گڑھ (طبع پنجم)	۱۹۶۲ء
۱۲۰۔ شمع انجمن	سید صدیق حسن خاں	مطبوعہ مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۳
۱۲۱۔ طالب علی خاں عیشی حیات اور کارنامے	شمیمہ رضوی	مطبوعہ پرکاش کیندر سیتاپور روڈ، لکھنؤ	۱۹۹۲ء
۱۲۲۔ طبقات الشعراء	قدرت اللہ شوق (مرتبہ نثار احمد فاروقی)	مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۸ء
۱۲۳۔ طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	مطبوعہ مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۸ء
۱۲۴۔ عبرت نامہ	محمد قاسم عبرت لاہوری (تصحیح وترتیب ظہورالدین احمد)	مطبوعہ ادارۂ تحقیقات لاہور	۱۹۷۷ء
۱۲۵۔ عربی ادب میں اودھ کا حصہ	مسعود انور علوی کاکوروی	مطبوعہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ	۱۹۹۰ء

۱۲۶۔عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی (مرتبہ: عبدالحق)	مطبوعہ جامع برقی پریس، دہلی	۱۹۸۴ء
۱۲۷۔عمادالسعادت	غلام علی خاں رائے بریلوی	مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۸۶۴ء
۱۲۸۔عہد اسلامی کا ہندوستان	ریاست علی ندوی	مطبوعہ ادارۃ المصنفین، پٹنہ	۱۹۵۰ء
۱۲۹۔عہد بنگش	مفتی ولی اللہ فرخ آبادی	مطبوعہ اکیڈمی ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی	۱۹۶۴ء
۱۳۰۔غزل اور متغزلین	ابواللیث صدیقی	مطبوعہ سودلیتھو پریس، دہلی	۱۹۶۸ء
۱۳۱۔فسانۂ عبرت	رجب علی بیگ سرور (مرتبہ: ذکی کاکوروی)	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۱۳۲۔فسانۂ عجائب	مرزا رجب بیگ سرور	مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۹۱۲ء
۱۳۳۔فیض آباد کی جھلکیاں	آر کے سہنا۔محمد حسن	مطبوعہ ادارۂ تصنیف ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی	۱۷۷۵ء
۱۳۴۔قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۱ء
۱۳۵۔کلام نصیرالدین حیدر بادشاہ	مرتبہ شاہ عبدالسلام	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۳ء
۱۳۶۔کلیات انشاء		مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۸۹۴ء
۱۳۷۔کلیات سودا		مطبع نامی نول کشور، کانپور	۱۹۳۲ء
۱۳۸۔کلیات شہزادہ سلیمان شکوہ	مرتبہ شاہ عبدالسلام	دانش محل لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۱۳۹۔کلیات عیشی	(قلمی نسخہ)	رامپور رضا لائبریری، رامپور	۱۸۲۹ء
۱۴۰۔کلیات فارسی شاہ تراب علی قلندر			

۱۴۱۔ گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر لکھنوی	مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ	
۱۴۲۔ گلستان بے خزاں	قطب الدین باطن	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۱۴۳۔ گلستان سخن	مرزا قادر بخش صابر	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۱۴۴۔ گل رعنا (تذکرہ شعرائے اردو)	سید عبدالحئ	مطبوعہ مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۳۴۳ھ
۱۴۵۔ گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۳۴ء
۱۴۶۔ گلشن سخن (تذکرہ شعرائے اردو)	مبتلا لکھنوی (مرتبہ: مسعود حسن رضوی)	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۱۴۷۔ گلشن ہمیشہ بہار (مرتبہ : اسلم فرخی کراچی)	نصر اللہ خاں خویشگی	مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۶۷ء
۱۴۸۔ گلشن ہند	مرزا علی لطف	مطبوعہ دارالاشاعت، نولکشور، لکھنؤ	۱۹۰۶ء
۱۴۹۔ گلشن ہند (مرتبہ : مختار الدین احمد)	سید حیدر بخش حیدری	مطبوعہ کوہ نور پریس، دہلی	۱۹۶۷ء
۱۵۰۔ لچھمی نرائن شفیق اور اورنگ آبادی حیات اور کارنامے	ساجد زید پوری	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۹۰ء
۱۵۱۔ لطائف السعادت (مرتبہ) آمنہ خاتون	انشاء اللہ خاں انشاء	مطبوعہ کوثر پریس بنگلور	۱۹۵۵ء
۱۵۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی	مطبوعہ اردو پبلشرز، لکھنؤ، نظامی پریس	۱۹۷۳ء
۱۵۳۔ لکھنؤ کا دسترخوان	مرزا جعفر حسین	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۰ء

۱۵۴۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج	مسعود حسین رضوی	مطبوعہ تنظیم پریس، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
۱۵۵۔ لکھنؤ کے امی شعراء	حیدر حسین رضا لکھنوی	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۹ء
۱۵۶۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث	سید صفدر حسین	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۸ء
۱۵۷۔ لکھنؤ کی لسانی خدمات	حامد اللہ ندوی	نطبوعہ اجمل پریس، بمبئی	۱۹۷۵ء
۱۵۸۔ لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر	سید عبدالباری	مطبوعہ نشاط آفسٹ پریس، ٹانڈہ، فیض آباد	۱۹۸۷ء
۱۵۹۔ لکھنویات ادیب	مسعود حسن رضوی ادیب	مطبوعہ اردو اکادمی، لاہور	۱۹۸۸ء
۱۶۰۔ لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر قلندر بخش جرأت	ڈاکٹر جمیل جالبی	مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۱۶۱۔ ماثر الکرام	غلام علی آزاد بلگرامی	مطبوعہ مفید عام پریس، آگرہ	۱۹۱۰ء
۱۶۲۔ مجمع النفائس (ملخص و قلمی نسخہ)	سراج الدین علی خاں آرزو (تصحیح و ترتیب) عابد رضا بیدار	مطبوعہ کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ	۱۲۰۰ھ ۱۱۷۹ھ
۱۶۳۔ مجموعہ سخن	غلام حسین قدر بلگرامی	مطبوعہ	۱۸۷۱ء
۱۶۴۔ مجموعہ نغز	میر قدرت اللہ قاسم (مرتبہ: محمود شیرانی)	مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۳۳ء
۱۶۵۔ مخزن نکات	قیام الدین قائم مرتبہ مولوی عبدالحیٔ	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن	۱۹۲۹ء
۱۶۶۔ مرقع اودھ	احد علی ابر کاکوروی (مرتبہ: ذکی کاکوروی)	مطبوعہ (نیو ایڈیشن) لکھنؤ	۱۹۸۷ء
۱۶۷۔ مرقع خسروی	محمد عظمت علی نامی کاکوروی	مطبوعہ نظامی پریس، مرکز ادب اردو، ۱۳۷۔ شاہ گنج لکھنؤ	۱۹۸۶ء

۱۶۸۔ مرقع دہلی	درگاہ قلی خاں (مرتب و مترجم) خلیق انجم	مطبوعہ آفسیٹ پریٹرز، دہلی	۱۹۹۳ء
۱۶۹۔ مسرت افزا	ابوالحسن امیر الدین احمد (مرتبہ : قاضی عبدالودود	مطبوعہ	۱۹۵۴ء
۱۷۰۔ مسلمانوں کا عروج وزوال	سعید احمد	ندوۃ المصنفین جامع مسجد، اردو بازار، دہلی (طبع سوم)	۱۹۶۳ء
۱۷۱۔ مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدردانی	محمد شفیع علوی کاکوروی	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۸۶ء
۱۷۲۔ مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی شاعری	انیس ادیب	مطبوعہ سرفراز آفسیٹ پریس، مئوناتھ بھنجن، نکھار پبلیکیشنز مئوناتھ بھنجن، یوپی ۲۷۵۱۰۱	۱۹۹۳ء
۱۷۳۔ مصحفی (ہندوستانی ادب کے معمار)	نورالحسن نقوی	مطبوعہ ول آفسیٹ پنچشیل گارڈن شاہدرہ، دہلی	۱۹۸۹ء
۱۷۴۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات	صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبوعہ مطبع معارف دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء
۱۷۵۔ مفتاح التواریخ	طامس ولیم بیل	مطبوعہ مطلع الاخبار، آگرہ	۱۸۴۹ء
۱۷۶۔ منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی	مطبوعہ کالج پریس، کلکتہ	۱۸۶۸ء
۱۷۷۔ موج کوثر	محمد اکرام	مطبوعہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور (طبع یازدہم)	۱۹۸۲ء
۱۷۸۔ میر اور میریات	صفدر حسین آہ	مطبوعہ علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ، بمبئی	۱۹۷۱ء

۱۷۹۔ نامۂ مظفری (تاریخ شاہ آباد)	مظفر حسین خاں سلیمانی	مطبوعہ اودھ	۱۹۱۵ء
۱۸۰۔ نتائج الافکار	قدرت اللہ خاں گویاموی	مطبوعہ مدراس	۱۸۴۳ء
۱۸۱۔ نذر مقبول	مرتب خیر بہوروی	مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۱۸۲۔ نزھۃ الخواطر (عربی)	شریف عبدالحیٔ بن فخر الدین حسینی	مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد، دکن	۱۹۵۹ء
۱۸۳۔ نسخہ ہای خطی، فارسی کتاب خانہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ		مطبوعہ	۱۹۸۶ء
۱۸۴۔ نکات الشعراء	میر تقی میر (مرتب) محمود الٰہی	مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۱۸۵۔ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان	نریندر بہادر سریواستو	مطبوعہ ناظم پریس، رامپور	۱۹۷۹ء
۱۸۶۔ نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خاں آرزو (تصحیح و ترتیب : سید عبداللہ)	مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۱۹۵۱ء
۱۸۷۔ واجد علی شاہ	محمد تقی احمد (طبع دوم)	مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
۱۸۸۔ واجد علی شاہ (سلطان عالم)	مسعود حسن رضوی ادیب	مطبوعہ آل انڈیا میرا کادمی، لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۱۸۹۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد	رئیس احمد جعفری	مطبوعہ کتاب منزل، لاہور	۱۹۵۷ء
۱۹۰۔ وزیر نامہ	امیر علی خاں امیر	مطبوعہ مطبع نظامی، کانپور	۱۲۹۳ھ
۱۹۱۔ ہفت تماشا	مرزا محمد حسن قتیل	مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۵ء
۱۹۲۔ ہماری تہذیبی میراث	سفارش حسین رضوی	مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۰ء

۱۹۳۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت	مناظر احسن گیلانی	مطبوعہ ندوۃ المصنفین (طبع دوم)	۱۹۶۶ء
۱۹۴۔ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس	اے بی ایم حبیب اللہ (مترجم: مسعود الحق)	مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۱۹۵۔ ہندوستان اٹھارہویں صدی میں ایک سفرنامہ (۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۴ء)	ولیم ہوجز (مترجم: ڈاکٹر محمد عمر)	مطبوعہ ادارہ ادبیات، دہلی	۱۹۷۸ء
۱۹۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبوعہ دارالمصنفین معارف پریس اعظم گڑھ	۱۹۶۳ء
۱۹۷۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلکی	صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبوعہ دارالمصنفین معارف پریس اعظم گڑھ (طبع دوم)	۱۹۹۰ء
۱۹۸۔ یادگار شعراء	سپرنگر (مترجم) طفیل احمد	مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد	۱۹۴۳ء

رسائل

۱۹۹۔ دانش (فارسی)		فصلنامہ ایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران اسلام آباد، ژانویہ مارس	۱۹۹۵ء
۲۰۰۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ		مارچ، اپریل	۱۹۹۳ء
۲۰۱۔ ماہنامہ نیا دور (اودھ نمبر) لکھنؤ		فروری مارچ	۱۹۹۴ء

10. THE FIRST TOW NAWABS OF AWADH:ASHIRBADI LAL SRIVASTAVA.
FIRST EDITION-1933
2ND Edition -1954
DHARAM CHAND BHARGAVA,
AT HTE AMRIT ELECTRIC PRESS
BELANGANJ BHERON AGRA.

11. THE MUTINIES IN OUDH : M . R. GUBBINS
JANKI PRAKASHAN,PATNA,1858
FIRST REPRINT-1978

12. THE RAJ ,THE INDIAN MUTINY AND THE KINGDOM OFOUDH, 1801-1859:JOHN PEMBLE
THE HARVESTER PRESS, UNIVERSITY OF LEICESTER-1977.

1- AWADH IN REVOLT_1857-1858:RUDRANGSHU MUKHERJEE
OXFORD UNIVERSITY PRESS-1984

2- BRITISH RELATIONS WITH OUDH 1801-1856 : D P SINHA,
K P BAGCHI & COMPANY - CALCUTTA 700012,
DELHI-110019-1983

3- BRITISH AGGRESSION IN AVADH : EDITED WITH AN INTRODUCTION BY SAFI AHMAD WITH A FOREWORD BY PROF.MOHAMMAD HABIB.
MEENAKSHI PRAKATION MEERUT- 1969.

4- ENCYCLOPIEDIA BRITANNICA Vol:1&7

5- ENCYCLOPIEDIA AMERICANA Vol:17

6- GAZETTEER OF OUDH,VOL:1,2,3

7- HISTORY OF ASAFUD DAULAH:BEIGNG A TRANSLATION OF "TAFZIHUL GHAFIL EEN COMPILED BY ABUTALIB,
TRANSLATED FROM ORIGINAL PERSIAN BY,W.HOEY.
PUSTAK KENDRA HAZRAT GANJ LUCKNOW 1974.

8- JOURNEY THROUGH THE KINGDOM OF OUDH : SIR WILLIAM HENRY SLEEMAN IN 1849-1850 VOL: 1
HELICON PUBLICATION LUCKNOW.1858 2ND EDITION -1989

9. SLEEMAN IN OUDH : P . D . REEVES
A JOURNEY THROUGH THE KINGDOM OF OUDH IN 1849-1850
CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS IN ASSOCIATION WITH BLACKIE 1971(INDIA).

فہرست مائیکرو فلم

نمبر شمار	نام نسخہ	شمارۂ مائیکرو فلم	کتابخانہ	ادارۂ فلم
۱۔	برہان اودہ	۵۴/۳	مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ	مرکز میکرو فیلم نور خانۂ فرہنگ
۲۔	برہان اودہ	۷۷/۱	,,	ج۔ا۔ایران
۳۔	تاریخ فرح بخش	۶۸/۱	,,	نئی دہلی
۴۔	تاریخ فرخ آباد	۳۲۹/۳	,,	,,
۵۔	تذکرہ ریاض الشعراء	۴۰۸/۳	,,	,,
۶۔	تذکرہ ید بیضا (جزء اول)	۷۳/۳	,,	,,
۷۔	چہار گلشن	۳۵۱/۲	,,	,,
۸۔	دریای لطافت	۵۸۲/۱	,,	,,
۹۔	دیوان آزاد	۱۷۸/۳	,,	,,
۱۰۔	دیوان سخنور	۳۵۶/۵	,,	,,
۱۱۔	شرح گل کشتی	۳۶۰/۱۰	,,	,,
۱۲۔	تاریخ فرح بخش	۴۴/۱	,,	,,
۱۳۔	گل رعنا	۸۴/۲	,,	,,
۱۴۔	مجموعہ خطوط نواب وزیر اودہ	۸۲/۷	,,	,,
۱۵۔	مکتوبات واجد علی شاہ بہ گورنر جنرل	۳۳/۱	مرکز میکرو فیلم نور	,,

AWADH KE FARSIGO SHOĀRA

BY
DR. ZOHRA FAROOQUI

D-178, ABUL FAZL ENCLAVE, JAMIA NAGAR,
NEW DELHI-110025, PH.: 26926724

AWADH KE FARSIGO SHOĀRA

BY

DR. ZOHRA FAROOQUI

D-178, ABUL FAZL ENCLAVE, JAMIA NAGAR,
NEW DELHI-110025, PH.: 26926724